Title - MURAATUL SHORA (Part-2).

Creator - Maulvi Mohd. Yahya Tanha.

Publisher - Hafiz Mohd. Aalim (Lahore).

Date - 1945

Pages - 396.

Subjects - Tazkira Shora - Urdu; Urdu Shayari - Tanqeed-o-Tareekh.

مرآۃ الشعراء

جلد دوم

(جس میں امیر ملتانی سے لیکر تنہاؔ تک جملہ شعراء کے حالاتِ زندگی، کلام پر تنقید اور انتخاب کلام درج ہے)

از

مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہاؔ

(بی اے، ایل ایل بی) وکیل

(مصنف سیر المصنفین و مؤلف تاریخ امریکہ [illegible] تاریخ مغربی یورپ خیالات ارونگ وغیرہ)
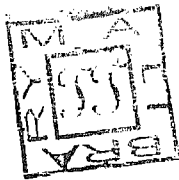
ملنے کا پتہ

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

تعداد ایک ہزار — قیمت ۶ روپے

(تعلیمی پریس لاہور پاکستان میں باہتمام ملک نور الٰہی چھپی)

فہرست مطالب

کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آمدید اور طوع کر کے دکھائیں اس شعر کو سن کر بے انتہا محفوظ ہوئے اور اپنے صحابہ سے فرمایا۔ کہ کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں شوقِ ملاقات پیدا نہیں کیا لیکن اس نگارندہ شعر کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔

بقولِ اقبال اس کی وجہ ظاہر ہے عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے دوسرے لفظوں میں صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے۔ اُس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

لہذا وہ شاعری جو ہمیں فنائیت کی تعلیم دے یا سکون کو سراہے یا واقعہ نگاری اور حقیقت نگاری پر اس قدر زور دے کہ اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دے اور نتیجہ خیز نہ ہو یا تسخیرِ فطرت کے بجائے صرف فطرت پرستی سکھائے اور افادیت کو نظر انداز کر دے یا عالمِ اسباب و علل کو محض دھوکا، سراب اور افسانہ سمجھے۔ اور ذوقِ عمل و حرکت سے محروم کر دے یا زندگی کی صرف نقل کو جائز قرار دے اور سوز و یقین اس میں داخل نہ ہونے دے یا صرف جمالیات کی قدر کرے جس میں جلال نہ ہو۔ یا نزاکت پرشیدا ہو اور سادگی، گرمی، تازگی اور سخت جانی پر ناک بھوں چڑھائے ہمارے لئے بیکار ہے۔ البتہ وہ شاعری قابلِ قدر ہے۔ جو زندگی، مستی اور خود فراموشی کی بجائے جلال و جراَت پیدا کرے اور اس میں وہ قوت ہو جو ہمیں قوی تر بنا دے۔

صنفِ تغزل میں خوبیاں کم اور برائیاں بہت زیادہ ہیں۔ اس کے متعلق جلد اول میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے یہاں اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اس کی بدولت حشرات الارض کی طرح شعرا پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ہمارے بہت سے نوجوانوں کی زندگی صرف اس کے اثر سے پابوس کن ہو جاتی ہے۔ لہذا یہ صنف اصلاحی شکل میں بھی قابلِ ترک ہے، ورنہ یہ سخت جان پھر ہم کو تنزل کی راہ پر لے آئے گی۔

جنسی شاعری جو جنسی بھوک پر مبنی ہے اور تخیل میں تلذذ یا لذتیت محسوس کرتی ہے فحاشی کا مخرج ہے خود اس شاعری کے قدردان بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہتے ہیں۔ اس کا رواج ۱۹۳۶ء سے ہوا جبکہ ان شعرا نے یورپ کی کورانہ تقلید شروع کر دی یا ان شیدان شعرا کے اعصاب پر عورت سوار ہے اور انہوں نے ریختی گو شعرا کو فحش گوئی کے لیے دلیلِ راہ بنا لیا ہے لیکن وہ لوگ غزل اور ہزل میں فرق کرتے تھے اور ریختہ اور ریختی کے امتیاز کو بھی مدِ نظر رکھتے تھے۔ وہ ہرگز اپنے متین اور سنجیدہ کلام میں ریختی شامل نہیں کرتے تھے صرف اپنی رندی اور بوالہوسی کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ عام طور پر اس قسم کی شاعری کا مطالعہ نہیں کیا جاتا تھا۔ اور اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ آجکل بعض ادب و رسائل جنسی شاعری کی تشہیر کرتے رہتے ہیں اور اس کو سراہتے رہتے ہیں۔ یہی حال ہماری موجودہ افسانہ نویسی کا ہے جو بالفاظِ دیگر کوک شاستری کی تعلیم دیتی ہے ہماری اس قسم کی افسانہ نویسی اور جنسی شاعری ہمارے ادبیات اور ملک و ملت کو سخت

نقصان پہنچا رہی ہیں اور ترقی پسندی کے بجائے تنزل پذیری اختیار کر رہی ہیں جب تک اخلاقیات کی خلاف ورزی کو ایک ناقابلِ معافی گناہ نہ سمجھا جائیگا۔ یہ یورپ کی بیجا تقلید کا سودا سر سے نہ جائیگا۔ یورپ جو اپنے زمانۂ عروج میں معلّمِ ایشیا تھا۔ اپنے دورِ انحطاط میں ہرگز کسی قوم کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اُس کا تنزل نامعلوم سہی لیکن دور رس نگاہیں محسوس کر رہی ہیں کہ وہ زوال پذیر ہو گیا ہے۔ اِس لئے ہمارے جنسی شعرا اپنی جدید شاعری کو اور افسانہ نویس اپنی کوک شاستری کو زمانہ کے حالات اور واقعات پر نظر ڈال کر خیرباد کہہ دیں تو بہتر ہے اور اپنی خداداد قابلیت سے قوم کو جرأت اور جلال و قوت کی تعلیم دیں تو نہایت خوب ہو اور ہمیشہ یہ حدیث شریف الحیاء من الایمان (حیا ایمان کی ایک شاخ ہے) اپنے پیشِ نظر رکھیں۔

رسالہ اُردو کراچی کے تبصرہ نگار نے بعض اپنی فرو گزاشتوں کو ہمارے سر تھوپ دیا ہے مثلاً صفحہ ۱۳۸ اُردو اکتوبر ۱۹۴۹ء پر تحریر فرمایا ہے کہ اثر کے تذکرے میں اُن کی مثنوی کا ذکر تک نہیں کیا" حالانکہ صفحہ ۲۲۲ مرآۃ الشعراء جلد اوّل کی تیسری سطر میں بالکل واضح طور پر لکھا ہے "اپنی مثنوی خواب و خیال میں فرماتے ہیں" اور اِس کے بعد مثنوی مذکور کے چند اشعار درج کئے گئے ہیں۔

متروکات کے متعلق خاص توجہ کی وجہ یہ ہے کہ بعض موجودہ شعرا اپنی مقامی بولی کے الفاظ داخلِ زبان کر رہے ہیں جن کو اُردو بولنے والے نہیں سمجھتے۔ نیز یہ طریقہ خود اچھا نہیں ہے۔ ورنہ ٹکسالی اور ٹکسال باہر اُردو کا امتیاز جاتا رہے گا۔ اور اِس طرح ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ جو چاہے لکھے۔ غلط اور صحیح کی پہچان جاتی رہیگی اور کوئی معیار ہی باقی نہ رہے گا۔ ہر شاعر کے اُن متروکہ الفاظ کو جو اُنہوں نے واقعی استعمال کئے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ ظاہر کیا گیا۔ تاکہ ہر دور کے متروک الفاظ کی فہرست سے ہر شاعر کی نسبت یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ سب الفاظ ہر ایک شاعر نے اپنے اشعار میں باندھے ہیں۔ اِن متروک الفاظ پر اِس وجہ سے بھی زور دیا گیا ہے۔ کہ ہمارے شعرا نے خواہ مخواہ اِن الفاظ کو ترک نہیں کیا۔ بلکہ ہر لفظ کے ترک کرنے کی وجہ ہے کبھی وہ لفظ ثقیل ہوتا ہے، کبھی صوتی لحاظ سے خراب ہوتا ہے، کبھی پہلوئے ذم رکھتا ہے، کبھی روانی اور شستگی میں فرق انداز ہوتا ہے۔ اور عام طور پر اُن کے متروک الفاظ کو خود اُن کے زمانہ میں اور اُنکے بعد متروک قرار دیا گیا ہے۔ یہ لوگ بجائے خود مستند تھے اور اِن کی تراش خراش کو سب نے بطیبِ خاطر قبول کیا ہے۔ علاوہ ازیں ہر زندہ زبان میں متروکات ہوتے ہیں۔ اِن کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ نیز غزل کی زبان زیادہ لوچدار اور شستہ و رفتہ ہوتی ہے۔ اور اس میں ہر قسم کے الفاظ جا و بیجا استعمال کرنا مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ متروک الفاظ کی فہرست زیادہ تر غزل گو شعرا کے متعلق ہے۔

ولی کے سن وفات کے بارہ میں تبصرہ نگار نے جو قطعۂ تاریخ درج کیا ہے۔ اُس سے وہ سنہ ۱۱۱۹ھ اور ہم سنہ ۱۱۵۵ھ برآمد کرتے ہیں۔ قطعہ یہ ہے :۔

مطلعِ دیوانِ عشق، مسندِ اربابِ دل　　　والیِ ملکِ سخن، صاحبِ عرفاں ولی

سالِ وفاتش خرد از سرِ الہام گفت　　　بادشہِ دلی ساقیِ کوثر علی

از سرِ الہام سے وہ صرف الف مراد لیتے ہیں۔ اور ہم الہا جس کے عدد (۳۷) ہوتے ہیں۔ اور چوتھے مصرع کے عدد (۱۱۱۸) لے کر جمع کرتے ہیں تو ۱۱۵۵ھ ہوتے ہیں۔ اور یہی سن وفات مولوی عبدالجبار خاں مؤلف تذکرۂ شعرائے دکن نے لکھا ہے۔ اور دیگر تذکرہ نویسوں نے اس کی تقلید کی ہے۔ لہٰذا جس قطعۂ تاریخ پر استدلال کیا جاتا ہے۔ وہ قابل [illegible] ہو گیا ہے۔ تاریخ گو شعراء نے اپنی اپنی تاریخیں عجیب عجیب حساب سے لکھی ہیں اور خاص خاص سنین کے اعداد کسی نہ کسی طرح پورے کئے ہیں۔ حقیقتاً حروف کے اعداد سے تاریخ نکالنی آسان کام بھی نہیں ہے اس لئے ان کو یہ اجازت ہے کہ جس طرح چاہیں تاریخ برآمد کریں۔ تاریخ گوئی میں تخرجہ اور تعمیہ بھی جائز ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم سرِ الہام سے صرف الف مراد لیں۔ اور الف لیں۔ جو صحیح تاریخِ وفات ظاہر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں صرف الف مراد ہونا تو سر کے بجائے [illegible] استعمال کرنا بعض تاریخوں میں دیکھا گیا ہے۔

تبصرہ نگار نے لکھا ہے۔ کہ یہ قطعہ مفتی محمد احسن کا لکھا ہوا ہے اور وہ محمد شاہ کے عہد میں احمد آباد کے [illegible] بھی دلیل اس امر کی ہے کہ ولی کا انتقال محمد شاہ کے عہد میں ہوا ہے اور خود عالمگیر کی وفات ۱۱۱۸ھ یا [illegible] اس کے بعد اس کا بیٹا معظم بہادر شاہ تخت نشین ہوا جس نے پانچ برس تک حکومت کی۔ اور پھر جہاندار شاہ فرخ سیر، رفیع الدرجات وغیرہ بادشاہ ہوئے اگر ولی ۱۱۱۹ھ میں فوت ہوتا تو ولی اور اورنگ زیب کا سن وفات ایک ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ محمد شاہ کے زمانہ کا مفتی اتنی مدت کے بعد کیا تاریخ وفات لکھتا۔ ولی کے برادر نسبتی شیخ فرید صدیقی نے "حسن اعین مد راحتی" سے جو تاریخ [illegible] ہے اور اس سے ۱۱۱۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔ وہ عالمگیر کی تاریخ وفات معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ کہنے کے لئے تو ولی کو بھی کہہ دیا جاتا ہے لیکن عالمگیر کے لئے بدرجہ زیادہ موزوں ہے۔ بہر حال تاریخ کے الفاظ ایسے [illegible] ہونے سے یہ کہنا مشکل ہے کہ کس کی تاریخ وفات ہے چونکہ مسلمہ امر یہی عالمگیر کا سن وفات ہے۔ لہٰذا قیاس یہی چاہتا ہے۔ کہ شیخ فرید صدیقی نے عالمگیر کی رحلت پر تاریخ وفات نکالی ہے۔

رسالہ اردو کے تبصرہ نگار نے حاتم کے شعر پر جس سے ہم نے ۱۱۴۲ھ تک ولی کا زندہ رہنا یقینی طور پر ثابت کیا ہے۔ یہ الفاظ تحریر کئے ہیں:۔ "حاتم کے شعر سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے۔ وہ قطعی ثبوت اس بات کا نہیں کہ ولی اس وقت زندہ تھے۔ یہ شاعرانہ انداز بیان ہے۔ وہ ولی کو زندہ فرض کر لیتے ہیں اور اس سے معذرت خواہ ہیں شاعر عالم خیال میں بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ جو کسی حقیقت یا واقعہ پر مبنی نہیں ہوتیں

معلوم ہونا چاہئے۔ کہ شاعر واقعات کے بیان میں خصوصاً وہ واقعات جو اُس کی ذات سے متعلق ہیں کبھی فرضی باتیں نہیں لکھتا۔ عالمِ خیال کی باتیں اور ہوتی ہیں۔ اور سب ان کو پہچان لیتے ہیں۔ ذیل میں حضرتِ داغ کے چند مقطعے درج کئے جاتے ہیں۔ اور دریافت کیا جاتا ہے۔ کہ کیا یہ فرضی ہیں؟

ہر چند رام پور میں گھبرا رہا ہے داغ کس طرح جائے کلب علی خاں کو چھوڑ کر

کیا کوئی شخص اس سے انکار کر سکتا ہے کہ جس وقت یہ غزل لکھی گئی۔ اس وقت نواب کلب علیخاں ضرور زندہ تھے اور مرزا داغ نے دہلی میں بیٹھ کر یہ فرضی مقطع نہیں لکھا ہے

اے داغ ہے دکن سے بہت دُور لکھنؤ ملتے امیر احمد و سید جلال سے

کیا کوئی شخص اس سے انکار کر سکتا ہے۔ کہ جس وقت یہ مقطع لکھا گیا۔ تو حضرتِ داغ ضرور حیدرآباد دکن میں موجود تھے فرضی طور پر شاعر نے نہیں لکھا ہے۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

کیا اِس مقطع سے ظاہر نہیں ہوتا کہ جب یہ غزل لکھی گئی تو داغ عظیم آباد میں تھے اور کلکتہ جانے کے لئے برسات کے منتظر تھے۔ کیا یہ سب عالمِ خیال کی باتیں ہیں اور حقیقت سے دُور ہیں؟

لہذا حاتم کا ۱۱۲۲ھ میں یہ فرمانا کہ۔

اے ولی مجھ سے اب آزردہ نہ ہونا کہ مجھے یہ غزل کہنے کو نواب نے فرمائی ہے

اِس امر پر دلالت کرتا ہے کہ نواب کی فرمائش پر حاتم نے غزل لکھی ہے اور ولی اُس وقت تک ضرور زندہ تھے۔ اور اسی وجہ سے اُنکی غزل پر غزل لکھنے کی معذرت اُن سے کی گئی ہے۔ ورنہ ولی کی وفات کے بعد تو معذرت خود بے معنی ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں ولی کی پیدائش مسلمہ طور پر ۱۰۷۹ھ میں ہوئی، اگر اُس کی وفات ۱۱۱۹ھ میں واقع ہوتی تو وہ اس حساب سے اڑتالیس چالیس برس کی عمر میں فوت ہو[illegible] جوانی کی موت ایسی نہ تھی۔ کہ تذکرہ نویس اس کا ذکر نہ کرتے۔ عرفی کی وفات قریب قر[illegible] ابوالفضل جیسے مخالف نے بھی اِس کا افسوس کیا۔ اور لکھا۔ "ہنوز غنچہ اُمید[illegible] ناشگفتہ پژمرد" [illegible] سبھی سب تذکرہ نگار اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ اگر ولی [illegible] مرگ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تذکرہ نگار [illegible]س امر کو افسوس اور وضاحت کے ساتھ بیان نہ کر[illegible] اِس بات سے کہ کسی تذکرہ نویس نے ولی کو جواں مرگ نہیں لکھا ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ عمرِ طبعی کو پہنچا۔ اور ہرگز اس کی وفات ۱۱۱۹ھ میں نہیں ہوئی۔ جیسا کہ رسالہ اُردو کے تبصرہ نگار کا خیال ہے۔ بلکہ قرینِ قیاس اور صحیح یہی ہے کہ ولی کی وفات ۱۱۵۵ھ میں واقع ہوئی

ہر روایت کو درایت سے جانچنا ضروری ہے۔ اور کسی قلمی نسخہ میں تاریخِ وفات دیکھ کر اور ایک ہی طریقے سے تاریخ برآمد کر کے غلط نتیجہ نکالنا تحقیق کے سراسر خلاف ہے

جلد دوم کی اشاعت سے مرآۃ الشعراء مکمل ہو گئی ہے۔ کیونکہ چھٹے اور ساتویں دور کے شعراء کا ذکر اس میں آگیا ہے۔ آٹھواں دور بیشک ۱۹۴۱ء سے شروع ہو گیا ہے۔ لیکن فی الحال ہمارا ارادہ اس کے لکھنے کا نہیں ہے۔ کیونکہ سیر المصنفین جلد سوم کو مکمل کرنا ہے۔ جو تقاضائے وقت بھی ہے اور خود ہمارے دور سے متعلق ہے

محمد یحییٰ تنہا

۳۔ راج گڑھ روڈ
لاہور، پاکستان مورخہ
۳۰ مارچ ۱۹۵۰ء

ایک نظم سودا نے یا محققین کی رائے میں قائم نے "جاڑے" پر لکھی ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے ؎

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

یہ لوگ تیسرے دور کے بزرگ ہیں۔ ولی کو انتقال کئے ہوئے پچاس ساٹھ برس گزرے ہوں گے کہ اِن صاحبان نے مبالغہ کو اپنا رہبر بنا لیا۔ سردی کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو، ہر شخص جانتا ہے۔ کہ اس سردی کا اثر خورشید پر نہیں ہو سکتا۔ اگر خورشید ٹھنڈا ہو جائے تو نظامِ عالم درہم و برہم ہو جائے۔ شاید دلدادگانِ شعر کہیں کہ شاعر ہیئت داں نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اِن امور کا خیال کرے، بیشک شاعر ہیئت داں نہیں ہوتا لیکن انسان تو ہوتا ہے۔ کیا کوئی معمولی سے معمولی شخص بھی اس کو باور کر سکتا ہے کہ اس سال اتنی سردی پڑی۔ کہ آفتاب بھی ٹھنڈا ہو گیا ہ۔ دیکھئے اشاعری اس کو کہتے ہیں۔ شیخ سعدی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

کس خوبی کے ساتھ شاعر نے دمشق کے قحط کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ روٹی اس قدر نایاب تھی کہ عاشق جس کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی وہ بھی بھوک سے بیتاب ہو کر عشق کو بھول گیا۔ اللہ اکبر کیسا شدید قحط تھا۔ کوئی شخص اس کو مبالغہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اور کھانے کی چیزوں کی بیحد کمی کو اس سے بہتر طریقہ پر ظاہر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

میر حسن فراق کی حالت اِس طرح بیان کرتے ہیں :-

خفا زندگانی سے ہونے لگی	بہانے سے جا جا کے سونے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب	لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا	نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
کہا گر کسی نے کہ بیوی چلو	تو اُٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیسا حال ہے	تو کہنا بھی ہے جو احوال ہے
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے	کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلانا تو پینا اُسے	بغوض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

نسیم لکھنوی فراق کی حالت کو یوں ادا کرتے ہیں :-

کرتی تھی جو بھوک پیاس پس ہیں　　آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ　　کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
یک چند جو گزری بے خور و خواب　　زائل ہوئی اُس کی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ　　پینیات میں مثال رہ گئی وہ

ان دونوں شاعروں کے بیان میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے - ایک صحیح اور سچا نقشہ کھینچ دیتا ہے - اور دوسرا لطیفہ بیان کرتا ہے - فراق میں جو کیفیت کسی پہ گزرتی ہے - اُس کو میر حسن نے سادگی کے ساتھ فطرتِ انسانی پر نظر کرتے ہوئے بیان کیا ہے - اور نسیم نے صرف صناعی کا مظاہرہ کیا ہے - پہلا بیان نیچرل ہے - اور دوسرا اَن نیچرل - بعض لوگ صناعی کو اصلیت پر ترجیح دیتے ہیں - اور یہ نہیں سمجھتے - کہ آورد کو آمد پر کسی طرح تفوق حاصل نہیں ہے - اسی طرح نیچرل کلام پر اَن نیچرل کلام کو کبھی فوقیت حاصل نہیں ہو سکتی - نسیم کے اشعار لفظاً و معنیً دونوں لحاظ سے اَن نیچرل ہیں -

مولانا حالی نے "شعر کی طرف خطاب" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں عمدہ شعر کی تعریف بیان کی ہے - غالباً وضاحت کے ساتھ شعر کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی - ہم چند اشعار یہاں درج کرتے ہیں :-

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں　　پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام　　ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں　　تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
تو نے کیا ہے بحرِ حقیقت کو موج خیز　　دھوکے کا غرق کر کے رہے گا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری　　قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو
اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز　　جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو
اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا　　اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے تجھ کو گر نئی دنیا تو لے نکل　　بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

اسی سلسلہ میں حالی کی ایک نظم موسوم بہ "خود ستائی" نقل کی جاتی ہے - اس نظم میں صنعت کو قطعی دخل نہیں دیا گیا - صفائی، روانی اور سادگی اس کے جوہر ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ راستگوئی

اس کی خوبی ہے - اور اسی وجہ سے یہ نظم ولگدانہ ہے۔

اے دل فسردہ کون ہے جو خود ستا نہیں
پر خود ستائیوں کے ہیں عنواں جدا جدا

جو زیورِ خرد سے معرّا ہیں سادہ لوح
کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا

جو ان سے تیز ہوش ہیں سو سو طرح سے وہ
پردوں میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا

کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج
کمبل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دے دیا

کہتا ہے دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل
سائل کی ڈب ہیں، میں نے دیا مال جب دکھا

پردوں میں ایک کے چھپاتا ہے، بخل یہ
اور بن کے بیوقوف جتاتا ہے وہ سخا

کچھ، اس لئے کہ ہم بھی انہیں میں سے ہوں شمار
اہلِ وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا

کچھ، اس لئے کہ اپنا ہو انصاف آشکار
کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا

کہتا ہے ایک، لاکھ نہ مانے بُرا کوئی
ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا

کہتا ہے ایک، گُر ہے تو شاید کا اور ہی
پر چاہتے آدمی کو ہیں کہہ کہہ کے ہم برا

دھوکا ہنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہ
اور منہ سے قدر کہہ کے دکھاتا ہے وہ صفا

چپ چاپ سُن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں
یعنی کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا

کہتا ہے اس پہ کوئی کہ سب حُسنِ ظن ہے یہ
اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا

قائل ہے وہ انہیں پہ ہوئے وصف جو بیاں
اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا

کہتا ہے زید، عمرو ہے شدّت سے سادہ لوح
گنتا ہے سب کو نیک وہ، اچھا ہو یا برا

کہتا ہے عمرو، زید بھی کتنا ہے عیب بیں
بد ہو کہ نیک اُس کی زباں سے نہیں بچا

یہ اُس کا اور وہ اِس کا بیاں کر کے کوئی عیب
ہر اک ہے اپنی اپنی بڑائی نکالتا

غنیمت اُمید ہے کہ نہ ہوتی جہان میں
ہوتا اگر یہ خاک کا پتلا نہ خود ستا

حالی جو پردے کھول رہے ہیں جہان کے
شاید کہ اس سے آپ کا ہوگا یہ مدعا

یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب
اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا

القصہ جس کو دیکھئے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہے بے چارہ مبتلا

بہرحال جس شاعری کی کلی ہم دورِ اول کے آغاز سے دیکھ رہے ہیں - اور جس کے متعلق ہم نے شرح و بسط کے ساتھ "اردو شاعری" میں بحث کی ہے۔ وہ حالی کے قدوم میمنت لزوم سے آج پوری ہوتی ہے

یہ شاعر اپنی سخن گوئی سے مدتِ دراز کے بھٹکے ہوئے مسافروں کو صحیح رستہ کی طرف کھینچتا ہے۔ اور گم کردہ راہ لوگوں کو اپنی نئی شاہراہ کی طرف بلاتا ہے۔ بعض اصحاب اس کی پیروی کو فخر سمجھتے ہیں۔ اور بعض حضرات اُس کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی جنگ بے سود ثابت ہوتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ سب لوگ اُسی کی طرف ڈھل آتے ہیں۔ کیونکہ نشانِ منزل صاف نظر آتا ہے۔ اور زمانہ بھی بآوازِ بلند کہہ رہا ہے۔ کہ میرِ کارواں درحقیقت حالی ہے، اُسی کے نقشِ قدم پر چلو۔ سچ یہ ہے۔ کہ حالی کی شاعری نے نیچرل شاعری کی بنا ڈالی۔ اور اُسی زمانہ سے یہ انگریزی لفظ ہماری زبان میں داخل ہوا۔

خود حالی کے زمانہ میں اکبر نے بھی اپنے خیالات کو ظرافت کے پیرایہ میں اُسی طریقے سے ادا کرنا شروع کر دیا۔ اکبر نے پہلے سرسید کی تحریک کے خلاف لکھا یا یہ کہ انگریزی تعلیم کے بُرے نتائج کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا۔ شبلی نے بھی حالی کی پیروی شروع کر دی۔ مگر رنگینی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اسمٰعیل میرٹھی حالی کے بالکل ہمنوا رہے۔ بیان میرٹھی حالی کے خلاف رہے۔ اُن کی نظموں میں عیوب نکالے۔ اور ان کی نظموں کے جواب میں خود نظمیں لکھیں۔ تاہم اصل مقصد ہاتھ سے نہ گیا یعنی یہ بھی اُسی پگ ڈنڈی پر پڑ لئے جس پر حالی قدم مارتے چلے جا رہے تھے۔ اقبال، سرور اور چکبست وغیرہم نے بھی وہی راستہ اختیار کیا۔ لیکن سادگی کو چھوڑ کر اقبال نے غالب کے طرزِ بیان کو پسند کیا۔ اور سرور و چکبست وغیرہم کو رنگینی اور خیال آرائی زیادہ مرغوب ہوئی۔ اب آزادیِ ملک کو پیشِ نظر رکھ کر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ اور ہمارے شعرا کے سامنے ایک میدان کی بجائے ہزاروں میدان آ گئے۔ اُن کی سیر و سیاحت کے لئے ہزاروں باغات، ہزاروں وادیاں اور ہزاروں پہاڑ اور دریا اس رستے میں مل گئے۔ لطف یہ ہے۔ کہ غزل کا میدان بھی وسیع ہو گیا۔ اور زندگی کے مسائل غزلوں میں بھی اپنی جھلک دکھانے لگے۔

لیکن ہم جدید شاعری کے شائقین کی خدمت میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ وہ اپنی بلند پروازی کی تگ و دو میں نیچرل شاعری کا فرق ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھیں اور رنگین بیانی کے ساتھ اصل مطلب سے اتنے دُور نہ ہو جائیں۔ کہ پھر انہیں صحیح رستہ پر پہنچنا دشوار ہو جائے یا وہ سبزہ زاروں کی بھول بھلیاں میں پڑ کر راہ گم نہ کر بیٹھیں۔ اعتدال اور میانہ روی کی سخت ضرورت ہے۔ افراط و تفریط اس راہ میں چھلاوے کا کام دیگی۔ یہ کٹھن منزل ہے۔ اس میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔ آزادی کی منزل آسان نہیں ہوتی نیا راستہ ہمیشہ پُرخطر ہوتا ہے۔ یہ اب آپ صاحبان کا کام ہے۔ کہ رستہ کو بھی جھاڑ جھنکار سے صاف کرتے جائیں اور قدم بھی اِدھر اُدھر نہ ڈگمگائیں۔ ضرور نیا سامان سڑک کی تیاری میں صرف کیا جائے لیکن ناہموار کنکر اور پتھر کو علیحدہ کر دیا جائے یعنی عجیب و غریب یا نامانوس اور غیر فصیح الفاظ نہ آنے پائیں۔ اور

اسلوب بیان ایسا دشوار اور پیچیدہ نہ ہو۔ کہ لوگ مشکل سے سمجھ سکیں۔ جدّت کی خوبی یہی ہے۔ کہ ہر طرح دلفریب ہو۔ یہ نہ ہونا چاہئے۔ کہ بات تو نئی ہو لیکن بھونڈی۔ بقولِ اکبر ع

عیش ہے نظمِ بلیغ فطرت جو رُخ نہیں حسنِ مدعا کا

فی الحال کہن باغ را وقتِ نوکردن است   تواں را حسابِ درو کردن است

امیر

۱ امیر احمد نام اور امیر تخلص ہے۔ مولوی کرم محمد مغفور کے خلف اکبر ہیں۔
آپ شاہ نصیر الدین حیدر بادشاہِ اودھ کے عہد میں ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ روز دوشنبہ بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ نسبی سلسلہ بہت ہی قریب حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب نور اللہ مرقدہ سے ملتا ہے جن کا مزارِ مقدس لکھنؤ میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب امیر کے نام کے ساتھ مینائی لکھا اور بولا جاتا ہے۔

صاحب زہد و تقویٰ، صوفی مشرب، خدا پرست، درویش صفت اور منکسر المزاج تھے۔ فہم سلیم اور ذہانتِ فطری کی امداد سے عربی و فارسی میں کامل دستگاہ پہنچائی تھی۔ طب، جفر، نجوم وغیرہ میں بھی اچھی معلومات تھیں۔ اور شاعری میں تو آپ مسلم الثبوت استاد تسلیم کئے گئے ہیں۔ اس فن میں آپ منشی مظفر علی خاں اسیر سے تلمذ رکھتے تھے۔ ۱۲۷۵ھ میں آپ کی خوش بیانی کی شہرت نے نواب یوسف علی خاں والئے رامپور کے دربار میں پہنچا دیا۔ وہاں ریاست کی طرف سے عدالت دیوانی کے ایک رکن ہو گئے۔ ۱۲۸۱ھ میں نواب کلب علی خاں کا عہدِ حکومت آیا۔ اور حضرت امیر کو نواب کی استادی کا فخر حاصل ہوا۔
اُس وقت رامپور میں مرزا داغ، اسیر، جلال، منیر، بحر، تسلی، قلق، عروج، جلال، شاغل، تسلیم، رسا وغیرہ کا جمگھٹا تھا۔ اور کبھی کبھی حضرت غالب بھی دہلی سے تشریف لے آتے اور اس یادگار بزم کو اپنی صدارت سے اعزاز بخشتے تھے۔

آپ کی تصانیف اکثر شائع ہو گئیں لیکن بعض مسودے رہ گئے۔ ایک اردو دیوان موسوم بہ غیرتِ بہارستان جو اُس زمانہ میں مکمل و مرتب ہو گیا تھا۔ ایام غدر کی نذر ہوا۔ دوسرا دیوان موسوم بہ مرآۃ الغیب ہوا جو اصل پہلا دیوان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ دیوان اور مولود شریف کے ساتھ چھپا۔ ۱۳۰۰ھ میں دوسرا شائع کردہ دیوان موسوم بہ صنم خانۂ عشق چھپا۔ ۱۲۹۰ھ میں تذکرۂ شعرائے رامپور جو موسوم بہ انتخابِ یادگار ہے۔ نواب کلب علی خاں کی فرمائش سے لکھا گیا تھا چھپ چکا ہے۔ امیر اللغات نا تمام رہی۔ صرف دو جلدیں جن میں الف ممدودہ اور مقصورہ کے الفاظ ہیں شائع ہوئی تھیں کہ آپ کا پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا۔ ۱۹ جمادی الآخر

دکھانا چاہیئے کچھ بانکپن سودائے مژگاں کا
بہت اب نوک کی لیتا ہے ہر کانٹا بیاباں کا

صفائے دل کا رہے کچھ نشان مرگ کے بعد
ہمارے روضے میں ہو فرشِ سنگِ مرمر کا

نہیں بچنے کا ترے تیرِ مژہ سے دلِ زار
بال باندھا ہے یہ اے ترک نشانہ تیرا

کیا جانئے کہ چھوڑا پھولوں نے کیا شگوفہ
بلبل پکارتی ہے صیاد کو چمن میں

کرتے ہیں فاقے فرقتِ زلفِ سیاہ میں
یہ کال کا ہمارے لئے کال ہو گئی

لکھنؤ کا رنگِ قدیم یعنی کنگھی، چوٹی وغیرہ آپ کے یہاں اکثر اشعار میں آشکار ہے لیکن مثال کے لئے صرف دو تین شعر لکھے جاتے ہیں :-

کنگھی چوٹی سے کسی دم انہیں فرصت ہی نہیں
کیا خبر ہے کہ ہوا حال پریشاں کس کا

غیر نے اس گل کے بالوں میں کبھی کنگھی جو کی
مثلِ سنبل تار تار اپنا گریبان ہو گیا

بن گئی اُن کی بناوٹ سے ہماری جان پر
پائینچوں میں گوکھرو ٹانکا تو پیکاں ہو گیا

آپ نے ایک مشہور طرح میں جو غزل کہا ہے جس میں ۳۰ اشعار ہیں اور لطف یہ ہے کہ از سرتاپا تمام اشعار بے لطف ہیں معلوم نہیں یہ حضرات قافیہ پیمائی کے سوا بھی شاعری کا کوئی اور مقصد سمجھتے تھے یا نہیں مثلاً گلستاں کا قافیہ گیارہ مرتبہ باندھا ہے۔ اور سب جگہ بیکار خیالات کا انبار ہے۔ کوئی خاص بات پیدا نہیں کی۔ نہیں معلوم اس تکرار بے جا سے کیا حاصل ہے ؟-

انا الحق بولتی ہیں قمریاں حق سرو کیسا
جسے کہتے ہیں دار اک سرو ہے اپنے گلستاں کا

دلِ پُر داغ میں یہ حسرتوں کا خون ہوتا ہے
لہو بن کر ٹپک جاتا ہے رنگ اپنے گلستاں کا

بہارِ تازۂ دل دیکھ اگر شوقِ تماشا ہے
بہشت اک پھول مرجھایا ہوا ہے اس گلستاں کا

بہارِ کہکشان و انجم و افلاک کیسا دیکھوں
نہ بیل اچھی نہ بوٹا خوشنما ہے اس گلستاں کا

ہمارا بھی قفس لے ساتھ جاتا ہے جو گلشن کو
اکیلا سیر کرنا لطف کیا دے گا گلستاں کا

اسیرِ عشق ہوکر زمزمہ سنج طائرِ جاں کا
چہکتا ہے قفس میں جا کے بلبل اس گلستاں کا

خیالِ خط میں اے گل جا نکلتا ہوں جو گلشن میں
لگاتا ہے ہزاروں برچھیاں سبزہ گلستاں کا

نہ پوچھو حال دل کا میری آہِ بے اثر دیکھو
درختِ بے ثمر ہے یہ اُسی اُجڑے گلستاں کا

نظر آتا ہے دل میں رنگ کیا کیا حسنِ خوباں کا
تماشا دیکھتا ہوں ایک غنچہ میں گلستاں کا

صدا یہ قلقلِ مینا سے شبخانہ میں آتی ہے
کہ بختِ سبز اک طوطی ہے مستوں کے گلستاں کا

امیر ایسا شگفتہ ہے ہجومِ داغ سے پہلو
کہ ہر ناسورِ دل رخنہ ہے دیوارِ گلستاں کا

حضرت امیر نے حسبِ ذیل زمین میں پنج غزلہ کہا ہے جس میں ۶۷ اشعار ہیں۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ ایک شعر بھی کام کا نہیں۔ برخلاف اس کے حالی نے صرف دس شعر کی غزل کہی ہے۔ لیکن تمام اشعار مرغوبِ طبع ہیں۔ ہم ان غزلوں کے صرف تین قافیے جو دونوں کے یہاں مشترک ہیں۔ ذیل میں درج کرتے ہیں ناظرین خود اندازہ کر سکیں گے۔ کہ امیر اور حالی میں کون بہتر غزل گو ہے؟"

امیر — آتے ہیں جیسے ہو شوق تجلی کی دید کا   ہے کوہِ طور ڈھیر تمہارے شہید کا
مجھ کو محب سمجھ کے حسین شہید کا   کرتا ہے تنگ قافیہ تک بھی یزید کا
صحرا کو کشتۂ الفت کہاں نہیں   ہر لالہ ہے چراغ مزارِ شہید کا

شہید اور یزید کا قافیہ اور بھی کئی جگہ بندھا ہے لیکن ہم کو صرف یہی اشعار بہتر معلوم ہوئے اس لئے ان کو بطور نمونہ پیش کیا گیا۔

حالی — پردہ ہو لاکھ کیسۂ شمر و یزید کا   چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا
امیر — کھولیں گے لات مار کے ہم بتکدے کا در   پاپوش اپنی کام کرے گی کلید کا
〃 — مژدہ ہو میکشو کہ ہوا پانشید کا   محتاج قفلِ میکدہ تھا اس کلید کا
〃 — لوٹے گی لذتِ لبِ شیریں مری زباں   قفلِ دہن پہ اس کے ہے دانت اس کلید کا
حالی — قفلِ درِ مراد سب اک بار کھل گئے   چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا
امیر — دوزخ میں ڈالے جائیں گے جس دم بت پرست   ناقوس غل مچائے گا ہل من مزید کا
〃 — تخفیفِ دردِ دل کا کروں گا جو میں سوال   نکلے گا جملہ جفر میں ہل من مزید کا
حالی — دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر   لاتقنطوا جواب ہے ہل من مزید کا

ان اشعار کے موازنے سے صاف ظاہر ہے۔ کہ امیر کا خیال بھی شہید کے قافیے سے امام حسین تک پہنچتا ہے لیکن وہ کوئی عمدہ مضمون نہیں پیدا کرتے۔ کلید کے قافیے میں بھی قفل تک پہنچنا تو آسان تھا لیکن زبردستی پاپوش سے اسے توڑنا پڑا۔ اسی طرح ہل من مزید کا قافیہ بت پرستوں کو دوزخ میں ڈالنے سے اپنا کام پورا کر چکا۔ برعکس اس کے حالی ہر قافیے سے ایک اچھا مضمون پیدا کرتے ہیں۔ اور انداز بیان ہے کہ قدم چومتا ہے۔ اور دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔

ایک اور غزل لیجئے۔ جس میں دو قافیے گھر اور تہ دونوں شاعروں کے یہاں مشترک ہیں۔

امیر — رات دن کعبۂ دل میں ہے بتوں کا مجمع   کیا سے کیا ہو گئی اللہ کے گھر کی صورت
〃 — قبر بھی وادیٔ غربت میں بنے گی اک دن   اور کوئی نظر آتی نہیں گھر کی صورت

امیرؔ — قبر میں چین سے یاروں کی گزرتی ہے امیرؔ / پاؤں پھیلائے ہوئے سوتے ہیں گھر کی صورت

حالیؔ — اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت / نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

〃 — اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں / دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

امیرؔ — خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے / تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

حالیؔ — کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل / کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

ناظرین کو اِن دونوں غزلوں کے چند قافیوں سے خود اندازہ ہو گیا ہوگا کہ حالی کا درجہ بلحاظ تغزل امیر سے بہت بلند اور ارفع ہے۔

بعض جگہ جناب امیر نے دیگر شعراء کے مضامین کو اپنی طرز پر باندھا ہے لیکن وہ کوئی خوبی نہ پیدا کر سکے مثلاً

امیرؔ — شیخ کعبے سے گیا اُس تک برہمن دیر سے / ایک تھی دونوں کی منزل پھیر تھا کچھ راہ کا

دردؔ — شیخ کعبے ہو کے پہنچا ہم کنشتِ دل میں ہو / دردؔ منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا

امیرؔ — تھا مسلماں جب تلک مشتاق کافر تھا وہ بت / یہ ہوا کافر تو وہ ضد سے مسلماں ہو گیا

ذوقؔ — ایسی ضد کا کیا ٹھکانا مذہب اپنا چھوڑ کر / میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

امیرؔ — اے انقلابِ دہر مٹاتا ہے کیوں مجھے / نقشے ہزاروں مٹ گئے ہیں تب بنا ہوں میں

غالبؔ — یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے / لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

امیرؔ — سراپا رند ہوں لیکن وہ رندِ پاک طینت ہوں / کیا زاہد نے میرے آبِ خجلت سے وضو برسوں

دردؔ — تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو / دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

امیرؔ — میں اُلفت کے وہ حسن کے جوش میں / نہ میں ہوش میں ہوں نہ وہ ہوش میں

فانیؔ — اُن کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا / اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

اس آخری شعر میں امیر کے نقشِ اول کو فانی کے نقشِ ثانی نے بہت چمکا دیا۔

حسب ذیل زمین میں حضرت امیر نے حسب عادت چو غزلہ کہا ہے جس میں ۷۵ اشعار ہیں۔ اور ہم کو صرف ایک شعر کسی قدر بہتر معلوم ہوا۔

لے چلی ہے تو سنبھالے ہوئے لے چل سوئے یار / بے خودی راہ میں کرنا نہ کہیں گم مجھ کو

اس موقع پر داغ کا صرف ایک شعر یاد آ گیا۔ جو امیر کے ۷۵ اشعار سے کہیں بہتر ہے۔

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو / اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

اگرچہ ہمارا خیال ہے۔ کہ امیر ایک زباندان اور سخن سنج تھے۔ تاہم حسب ذیل لغزشیں اُن کے کلام میں ہماری نظر سے گزریں۔ جن کو دیکھ کر تعجب ہوا۔

اب عندلیبیں چمن میں کہاں، آگئی خزاں — تھی دھوم چار دن کی وہ ہنگامہ ہوگیا

یہاں بجائے ہوگیا، ہوچکا ہونا چاہئے۔ حضرت امیر ردیف کو صحیح طور پر نباہ نہ سکے۔

چار بھی نالے ہمارے سن کے چپکی لگ گئی — تھا بہت بلبل کو اپنی خوش بیانی پر گھمنڈ

چپکی لگ گئی کے بجائے چپ لگ گئی ہونا چاہئے۔ ممکن ہے کہ اہلِ لکھنؤ اسی طرح بولتے ہوں لیکن جلال لکھنوی کہتے ہیں۔ ع

کیوں لگی ہے تجھے چُپ کوئی تو پرساں ہوتا

اگر درکار ہے رنگیں تمہیں تکمہ گریباں کا — لگاؤ لعل اس میں قطرۂ خونِ شہیداں کا

قطرہ رقیق شے ہے اور لعل منجمد۔ ممکن نہیں کہ قطرۂ خون کبھی گریبان کے تکمہ میں لعل کی طرح لگایا جاسکے۔
اس مثال سے شاعر کی علم الاشیاء سے ناواقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اگر تشبیہ صرف سرخی سے دی گئی ہے۔ تو قطرۂ خونِ شہیداں کا لعل لگانا نہ کہنا چاہئے تھا۔
مبالغہ تو ہمارے شاعروں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ لہٰذا جنابِ امیر ہی پر کیا الزام عائد ہوسکتا ہے فرماتے ہیں:۔

کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخِ گل سے کوئی پھول — آتشِ گل سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ میں

ہماری زبان نے حال میں اس قدر ترقی کی ہے۔ کہ امیر کے کلام میں بھی چند متروکات پائے گئے موئے بمعنی مر گئے۔ جاکے بجائے جاکر۔ تلک بجائے تک۔ نہیں بچنے کا بجائے نہیں بچے گا۔ نہیں ماننے کی بجائے نہیں مانے گی۔ اجی بالکل متروک ہے۔ شعر

کیوں اجی غازہ مرے خون کا مل کر دیکھا — اور ہی چہرہ ہوا اور ہی رنگت نکلی"

آپ کے یہاں بھی دیگر شعراء کی طرح رکیک اشعار پائے جاتے ہیں مثلاً:۔

اے سبز رنگ خط بھی بنا اب تو بوسہ دے — بیگانہ تھا جو سبزہ چمن سے نکل گیا
ہوتے ہیں تر پسینے سے آغوش میں حسیں — پھولوں سے مجھ کو ڈھب ہے عرق کی کشید کا
حسن جس طفل کا چمکا وہ ہوا باعثِ قتل — جس نے تلوار سنبھالی مرا قاتل ٹھہرا
خط جو نکلا رُخِ جاناں پہ ملا بوسۂ خال — یہی دانہ فقط اس کشت کا حاصل ٹھہرا
دیکھ کر ناف و کمر اُس بُت کی آتا ہے خیال — رہبرِ راہِ عدم کو بھی خطر ہے چاہ کا

دو کی جگہ دیئے مجھے بوسے بہک کے چار — تھے نیند میں پڑا انہیں دھوکا حساب میں

کیا گرم ہیں کہ کہتے ہیں خوبانِ لکھنؤ — لندن کو جائیں وہ جو فرنگن کے یار ہیں

زلف اُس کی مرغ دل کے لئے جال ہو گئی — چوٹی گندھی تو جال کا جنجال ہو گئی

چھپ کے بھی آئے مرے گھر تو وہ دربانوں کو — اپنی پازیب کی جھنکار سناتے آئے

آپ کے یہاں تعلی کے اشعار بھی ہیں۔ مثلاً۔

میں شعر پڑھ کے بزم سے کیا اٹھ گیا امیر — بلبل چہک کے صحن چمن سے نکل گیا

دور اگلے شعراء کا تھا کبھی اور امیر — اب تو ہے ملک معانی میں زمانہ تیرا

کہتا ہے شعر سن کے کوئی واہ کوئی آہ — کچھ میرزا کے کچھ ہیں کچھ میر کے خواص

لوٹا ستمگروں نے مگر پھر بھی اے امیر — مضموں ہزار ہا مرے دیوان میں رہ گئے

کہیں کہیں آپ کے کلام میں مقامی رنگ کی بھی جھلک نمایاں ہے۔ مثلاً

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے — وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

کہاں ہونگی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں — رہیگا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

امیر جائیں گے ہم بے نظیر آج ضرور — خبر ہے میلے میں اُس سرو قد کے آنے کی

بعض اصحاب کا یہ خیال ہے۔ کہ قیام رامپور کے زمانہ میں امیر نے داغ کی تقلید کی اور سادگی اور روزمرہ کو اپنا شعار بنایا۔ چنانچہ اُن کے دیوان صنمخانۂ عشق کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ رائے ایک حد تک صحیح ہے۔ تاہم داغ کی آمد اور زبان یہ دو چیزیں ایسی ہیں۔ کہ امیر کو غزل گوئی میں داغ پر کسی طرح ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ قصائد میں بلا شبہ امیر داغ پر فوقیت رکھتے ہیں بے شک امیر کی علمیت اور فضیلت مسلمہ ہے لیکن امیر کے یہاں آورد اور داغ کے یہاں آمد ہے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں نواب کے زمانہ میں لکھنؤ اور دہلی کے شعراء کا جمگھٹا رامپور میں تھا۔ اور میل جول اور اتفاق و اتحاد سے ایک کے خیالات کا اثر دوسرے پر نامعلوم طریقہ سے ہوتا رہتا تھا۔ لکھنؤ کی آئندہ نسل نے جو دہلی کا اتباع کیا۔ اُس کی بنیاد رامپور میں پڑ چکی تھی۔ اور امیر و جلال نے جو خالص لکھنوی ہیں۔ دہلی کی شاعری کی تقلید شروع کر دی تھی چنانچہ ایک مقطع میں خود امیر فرماتے ہیں۔ اور یہ غزل صنمخانۂ عشق میں موجود ہے۔ جو اُن کا آخری دیوان ہے۔

پچھلا کلام بھی ہے جو اس میں شریک امیر — دیواں میں اب کا رنگ کہیں ہے کہیں نہیں

امیر و جلال و تسلیم کے شاگردوں نے درویست غالب و مومن کو پیش نظر رکھا اور ناسخ اور اس کے شاگردوں کو یک قلم بھلا دیا۔ اگرچہ موجودہ شعرائے لکھنؤ امیر و جلال و تسلیم میں بھی دبستان لکھنؤ کے کچھ نشانات پائے جاتے

ہیں- تاہم جو اہمیت ناسخیت کو دی جا رہی تھی- اُس کا خاتمہ ہو گیا-

داغ اور امیر کے دیوانوں میں بکثرت ایسی غزلیں دستیاب ہو سکتی ہیں- جو ایک ہی طرح میں ہیں- اُن کو بغور پڑھنے سے ظاہر ہو سکتا ہے- کہ ہماری رائے کہاں تک صحیح ہے- ذیل میں چند اشعار دونوں اُستادوں کے لکھے جاتے ہیں، جو ہم قافیہ ہیں- اور ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں- کہ غزل گوئی میں داغ کا کیا رتبہ ہے اور امیر کس درجہ میں ہیں

داغ	امیر
غنچۂ گل میں دھرا کیا ہے بتا اے بلبل	مشک [illegible] اُڑ گئے بو آئیں تو گندھے کیوں چوٹی
جمع ہیں چند ورق وہ بھی بکھرنے والے	مشکیں بندھواتے ہیں خود بال بکھرنے والے
،، عمر بھر حسنِ خدا داد رہا کرتا ہے	،، لے گئے دل کہتے ہیں وہ بال بکھرنے والے
دو گھڑی بعد بگڑتے ہیں سنورنے والے	کر بگڑنے میں بھی بنتے ہیں سنورنے والے
،، خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر اے صیاد	،، آبِ خنجر کو بھی قاتل نے مجھے ترسایا
ہم سے اچھے رہے صدقے میں اترنے والے	نہ دئے حلق سے دو گھونٹ اترنے والے
،، حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے	،، آسماں پر جو نکل آئے ستارے تو امیر
اور ہونگے تری محفل سے ابھرنے والے	یاد آئے مجھے داغ اپنے ابھرنے والے
،، ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی	،، آئینے میں ہر ادا کو دیکھ کر کہتے ہیں وہ
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی ،،	آج دیکھا چاہئے کس کس کی ہے آئی ہوئی
،، ٹوکا کر دیتے ہیں پیار آ ہی گیا اُس شوخ پہ	،، موت آتی روح جاتی ہے کرے کون اہتمام
وہ نظر حیرت زدہ وہ بات گھبرائی ہوئی ،،	اک نگاہِ واپسیں پھرتی ہے گھبرائی ہوئی
،، مجھ کو یہ دعویٰ کوئی تیرے سوا دل میں نہیں	،، وصل میں خالی ہوئی اغیار سے محفل تو کیا
اُس کا یہ الزام اچھی قسمتِ تنہائی ہوئی	شرم بھی جاتے تو میں جانوں کہ تنہائی ہوئی
،، دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں	،، وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں ،،	میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں
،، آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار	اُٹھتا نہیں ہے اب تو قدم مجھ غریب کا
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں	منزل سے کہہ دو دوڑ کے لے مجھ کو راہ میں

جناب امیر نے اندازاً پندرہ سولہ ہزار اشعار صرف غزل میں کہے ہیں- اور اُن کے بعض بعض اشعار مرغوبِ طبع اور دلکش بھی ہیں، لیکن حقیقتاً وہ فطری شاعر نہیں ہیں- طبیعت پر زور ڈال کر شعر کہتے ہیں- خود بخود اُن

کی زبان سے شعر نہیں نکلتے۔

آپ کا منتخب کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

کچھ غم نہیں جو پیش ہے دفترِ قصور کا
عنوان نامہ نام ہے ربِ غفور کا

وہ مست ہوں کہ ساغرِ مے جب میں پا گیا
اک بار یا غفور کہا اور چڑھا گیا

بیگانہ ہو کے سارے جہاں سے جدا ہوا
اے عالمِ آشنا جو ترا آشنا ہوا

کیسی گھڑی تھی گھر سے جو نکلا تھا میں غریب
پھر دیکھنا نصیب نہ مجھ کو وطن ہوا

نہ جہت تیرے لئے ہے نہ کوئی جسم ہے تو
چشمِ ظاہر کو ہے مشکل نظر آنا تیرا

منہ پھیر کر چلی تھی خفا ہو کے تیغِ یار
پاسے جھپٹ کے میں نے گلے سے لگا لیا

حیا تو اس کو بٹھائے ہزار پردے میں
مگر جو بیٹھنے دے شوق خود نمائی کا

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

رہ رہ کے اک کھٹک سی سینے میں ہو رہی ہے
شاید ابھی ہے باقی ٹکڑا کوئی جگر کا

بات رکھ لی مری قاتل نے گنہگاروں میں
اس گنہ پہ مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا
کرتا نہ میں گنہ تو گناہِ عظیم تھا

ہوش کی بھی اب تو کوئی بات کرتے ہیں امیر
کچھ تو وحشت نے کمی کی کچھ تو سودا کم ہوا

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

بات کرتے ہیں تو جاتی ہے ملاقات کی رات
کیا بری بات ہے رہ جاؤ یہیں رات کی رات

داد بھی دیگا وہی جس نے یہ کی ہے بیداد
دوڑتی پھرتی ہے ہر سو مری فریادِ عبث

دنیا رکی نہ ہم کو درم کی ہے احتیاج
بس تیری اک نگاہِ کرم کی ہے احتیاج

مرتبہ پیشِ خدا ہوتا ہے اتنا ہی بلند
جس قدر ملتا ہے انساں سے انساں جھک کر

ہوا سوا ہم کو جوشِ وحشت چمن میں رت جو بہار آ کر
گلوں نے ہنس ہنس کے مار ڈالا رلا دیا غنچوں نے مسکرا کر

جاتا ہوں اس لئے صنمِ بے وفا کے پاس
پہنچا جو اس کے پاس وہ پہنچا خدا کے پاس

کروں ضبطِ نفس ہمدم کہاں تک
لگی ہے آگ اک دل سے زباں تک

کیوں نالے کریں بلبلِ گلشن تو نہیں ہم
اے ضبطِ جنوں عقل کے دشمن تو نہیں ہم

کیا ہے ذوقِ شہادت نے محو یہ دمِ قتل
لگے ہیں زخم کہاں جسم پر نہیں معلوم

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

کیا دیر ہے امیر کے عفوِ گناہ میں
اللہ کیا کمی ہے تری بارگاہ میں "

ہیں شوخیاں یہی جو تمہاری نگاہ میں
بجلی گرے گی چار طرف جلوہ گاہ میں "

وہ تو سنتا ہی نہیں ہے - داد خواہی کیا کروں
کس کے آگے جا کے سر پھوڑوں الٰہی کیا کروں

داغ سے بڑھ کے نہیں دل میں کسی کا جلوہ
گھر کی رونق کسی مہمان سے ہم دیکھتے ہیں

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی "
یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

مثلِ نفس نہ آمد و شد سے ملا فراغ
جب تک رہی حیات، رہے اضطراب میں

واماندہ دور سے یوں منزل کو دیکھتے ہیں
کشتی شکستہ جیسے ساحل کو دیکھتے ہیں،

کیوں نہ موسیٰ کو خطر ہو شوقِ برقِ طور میں
مشکلیں پڑتی ہیں سالک کو حجابِ نور میں

قاصد یہ کوئے یار سے کہتا ہوا پھرا
اپنی خبر نہیں ہے مجھے کس کی تمہیں کہوں

سنتے ہیں آپ سارے زمانے کا دردِ دل
کہیئے تو میں بھی قصۂ سوزِ جگر کہوں

وطن کی یاد ہے لیل و نہارِ غربت میں
یہی ہے ایک بڑی غمگسار غربت میں

یہ پوچھیے یہ صحبت یہ عالم کہاں
خدا جانے کل تم کہاں ہم کہاں

روشن چراغِ برق سے رہتا ہے رات بھر
چمکے ہوئے نصیب مرے آشیاں کے ہیں

مری حالت پہ ہجرِ یار میں مر مر گئی حسرت
دلِ ناتواں سے روئی لپٹ کر آرزو برسوں

رہے تصویرِ حیرانی ہم اُن کے روبرو برسوں
لبِ خاموش سے کی دردِ دل کی گفتگو برسوں

بے حجابانہ مرے گھر جو وہ آ جاتے ہیں "
ایک تصویر در دل پہ لگا جاتے ہیں

گل سے مطلب ہمیں گلشن سے نہ بلبل سے غرض
سیر کرنے کو کبھی باغ میں آ جاتے ہیں

مرقد میں بھی نصیب کی گردش وہی رہی
سمجھے تھے ہم زمیں کے تلے آسماں نہیں

دامنِ رحمت اگر آیا ہمارے ہاتھ میں
پھول ہو جائیں گے دوزخ کے شرارے ہاتھ میں

بڑھتی ہے عمر جتنی ہوتی ہے عقل افزوں
ہر دم نیا مزا ہے اس بادۂ کہن میں

یارانِ رفتہ کا ہے غم اے امیر ناحق
چھوٹے ہوئے سفر کے مل جائیں گے وطن میں

ہے باغ باغ بلبل جس طرح تو چمن میں
پھرتے تھے یوں ہی ہم بھی خوش خوش کبھی وطن میں

وصلِ بت ہوتا نہیں ہے یا خدا ملتا نہیں
ڈھونڈنے پر آدمی آئے تو کیا ملتا نہیں

امیر اس باغ میں رہ کر کریں کیا دم الجھتا ہے
نہ نکہت چھوڑتے ہیں گل نہ کانٹے خو بدلتے ہیں

گو کہ دیکھے خواب اچھے سب نے تعبیریں کہیں
وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں

گھر گھر تجلیاں ہیں طلبگار بھی تو ہو
موسیٰ سا کوئی طالبِ دیدار بھی تو ہو

زاہد اُمیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے
پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

وہ یاس ہے کہ وصل میں بھی ہر نگاہ پر
ڈرتا ہوں میں کہیں نگہ واپسیں نہ ہو

راحت کی جستجو میں ہیں اہلِ جہاں عبث
ہاتھ آئے وہ کسی کو کہاں جو کہیں نہ ہو

آنکھوں سے فائدہ جو نہ دیدار ہو نصیب
حاصل جبیں سے کیا جو ترا آستاں نہ ہو

گھبرا کے ہم آئے تھے سوئے حشر
یاں پیش ہے اور ماجرا لو

کیسا سلوک مجھ سے کیا اشکِ شرم نے
زائل سیاہیِ خطِ اعمال ہو گئی

اک ذرا پاؤں اُٹھائے ہوئے اے توسنِ عمر
مدتوں سے خبر آئی نہیں کچھ یاروں کی

اس دل پہ ہزار جان صدقے
جس دل میں ہے آرزو تمہاری

کونین میں ہے جلوۂ حسنِ جمالِ دوست
ہے ایک روشنی کہ ادھر بھی اُدھر بھی ہے

اک ذرا وحشتِ دل بڑھ کے خبر تو لیتا
خاک کیا نجد میں مجنوں نے اُڑا رکھی ہے

جلوہ دکھا کے رنگِ جوانی ہوا ہوا
آتے ہی اُلٹے پاؤں پھرے دن بہار کے

دل ہی نہ رہا اُمید کیسی
جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

خدا نے شانِ یوسف سے تمہاری شان افضل کی
کھلا سب نقشِ ثانی سے حقیقت نقشِ اول کی

کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم
جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے

بوقت بحرِ غم سے کشتیِ جانِ حزیں نکلی
کبھی بیٹھی کبھی اچھلی کہیں ڈوبی کہیں نکلی

فنا کیسی بقا کیسی جب اُس کے آشنا ٹھہرے
کبھی اِس گھر میں آ نکلے کبھی اُس گھر میں جا ٹھہرے

کوئی آتا ہے عدم سے تو کوئی جاتا ہے
سخت دونوں میں خدا جانے سفر کس کا ہے

دو روز بتکدے کی بھی کر آئیں چل کے سیر
زاہد خدا کے گھر میں بہت میہماں رہے

پوچھو نہ اس زمانہ میں اُلفت کا حال کچھ
اک رسم تھی قدیم سو موقوف ہو گئی

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
چاہئے ہیں ایک کم سن کے لئے

گھبرا رہے ہو حشر میں کیوں اس قدر امیر
اتنی ہی سی تو بات ہے کہہ دو خطا ہوئی

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مدت سے امیر اُس کے ملنے کی تمنا تھی
آج اُس نے بلایا ہے لینے کو قضا آئی

داغ

ن نواب مرزا خاں نام داغ تخلص تھا۔ نواب شمس الدین خاں کے بیٹے تھے۔ اور ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ
مطابق ۱۸۳۱ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپ مشکل سے چھ سات برس کے ہونگے کہ باپ کا سایہ سر
سے اٹھ گیا۔ ماں نے شاہزادہ فتح الملک عرف مرزا فخرو خلف بہادر شاہ ابوظفر سے عقد ثانی کر لیا۔ اور آپ
بھی اپنی والدہ کے ہمراہ لال قلعہ پہنچ گئے۔ وہیں نشو و نما پائی۔ اور تعلیم و تربیت حاصل کی۔ چونکہ قلعہ میں
شعر و سخن کا چرچا تھا۔ اور بادشاہ اور مرزا فخرو دونوں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ اس لئے آپ نے
بھی استاد ذوق سے اصلاح لینی شروع کر دی۔ اور بہت دنوں تک اُن کے ساتھ چلتے اور داد سخن
لیتے رہے۔

ہنگامہ غدر سے ایک سال قبل مرزا فخرو نے وفات پائی۔ ماں کے ساتھ آپ بھی لال قلعہ سے نکلے
بجائے خود یہی مصیبت کیا کم تھی۔ کہ غدر کی شورش برپا ہو گئی۔ اور آپ کو بھی وہ سب مصیبتیں برداشت
کرنی پڑیں۔ جو اس پر آشوب زمانہ میں دلی والوں نے جھیلیں۔

جب امن و امان قائم ہوا۔ تو آپ رامپور تشریف لے گئے۔ اور نواب یوسف علی خاں بہادر کی
سرکار میں ملازم ہو گئے۔ اُن کے جانشین نواب کلب علی خاں نے بھی آپ کے ساتھ تلطف آمیز برتاؤ رکھا
اُن کی قدر دانی کی وجہ سے اُن کی زندگی بھر رامپور رہے۔ کہیں اور جانے کا خیال بھی نہ آیا۔ چنانچہ خود فرماتے
ہیں :-

ہر چند رامپور میں گھبرا رہا ہے داغ　　　کس طرح جائے کلب علی خاں کو چھوڑ کر

نواب کے انتقال کے بعد آپ نے حیدر آباد دکن کا رخ کیا۔ وہاں کئی برس تک امیدواری میں
زندگی بسر کی۔ آخر کار قسمت نے پلٹا کھایا۔ اور آپ ملازم سرکار آصفیہ ہو گئے۔ پہلے ساڑھے چار سو روپیہ
ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اور روز ورود سے اس وقت تک کی تنخواہ مل گئی۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایک
ہزار روپیہ ماہانہ مقرر ہو گیا۔ اور آپ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کی مصاحبت میں
نہایت فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ بیش قرار صلوں کے علاوہ [illegible] الدولہ [illegible] مقرب السلطان

بلبلِ ہندوستان، جہاں اُستاد، ناظم یار جنگ، دبیرالدولہ "فصیح الملک" کا خطاب پایا۔
آپ ظریف، خوش طبع، رنگین مزاج، فصیح البیان تھے۔ ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۵ء کو بہتر برس کی عمر میں اِس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رخصت ہوئے۔
گلزارِ داغ، مہتابِ داغ، یادگارِ داغ مع ضمیمہ اور مثنوی فریادِ داغ آپ سے یادگار ہیں۔ اور جب تک اُردو زبان قائم ہے۔ آپ کے کلام کی سادگی اور روانی یادگارِ زمانہ رہے گی۔

کلام پر تبصرہ

داغ کی شاعری کی ابتدا قلعۂ معلیٰ سے ہوئی۔ جبکہ وہاں بچہ بچہ شعر و سخن کی گود میں پل رہا تھا۔ اور ذوقِ شعر شاہ و گدا، امیر و فقیر اور اعلیٰ و ادنیٰ سب میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ اُستاد ذوق کا طوطی بول رہا تھا۔ اور محاورات اور زبان کی صفائی اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی۔ داغ نے بھی ذوق کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا۔ اور اُستاد کے اثر سے سلاستِ زبان کو پیشِ نظر رکھ کر طبع آزمائی شروع کر دی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ قدرت نے شعر گوئی کا ملکہ داغ کی طبیعت میں ودیعت کر دیا تھا۔ جو کچھ اُس نے اپنی نومشقی کے زمانہ میں کہا۔ اُس سے اِس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک دن جہاں اُستاد ہونے والا تھا۔ داغ ابھی کم سن تھا۔ لیکن مرزا غالب جیسے سخن شناس سے حسبِ ذیل شعر پر دادِ سخن حاصل کئے بغیر نہ رہا۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں   اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

زوالِ سلطنت کے بعد اِس نوجوان شاعر کو معاش کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اور خوش قسمتی سے نواب کلب علی خاں والئے رامپور کی فیاضی نے اُسے وہاں پہنچا دیا۔ لکھنؤ اور دہلی کی تباہی کے بعد شاعری کی قدردانی رامپور میں ہوئی۔ جہاں دونوں جگہ کے اہلِ کمال یکجا ہو گئے۔ خوب خوب مشاعرے ہوئے اور خوب خوب طبع آزمائیاں ہوئیں۔ شعرائے دہلی کے سرگروہ داغ اور شعرائے لکھنؤ کے سردار امیر مینائی ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے لیکن غزل گوئی میں اوّل الذکر گوئے سبقت لے گیا اور آخر الذکر قصیدہ نگاری میں سب کو مات کر گیا۔ چونکہ مقابلہ سخت تھا۔ اور اہلِ سخن کا مجمع تھا۔ اس لئے ہر شاعر دیکھ بھال کر اور طبیعت پر زور ڈال کر کچھ کہتا تھا۔ نقادانِ فن موجود تھے۔ اور حرف گیری اور نکتہ چینی سے گریز نہ کرتے تھے۔ لہٰذا کلام کو پاک و صاف بنانے کی طرف سب کی توجہ مبذول رہتی تھی۔ چنانچہ گلزارِ داغ اور آفتابِ داغ میں جو کلام شائع ہوا ہے۔ وہ مہتابِ داغ کی غزلوں سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ کہ داغ نے رامپور میں جگر کاوی اور دماغ سوزی سے کام لیا۔ اور حیدرآباد دکن میں آرام اور فارغ البالی سے دن بسر کئے۔ نہ کسی کی تنقید کی پروا کی اور نہ محنت و کاوش سے کچھ کہا۔ رامپور کے معرکوں کے بعد اُس کی زبان سے یہ شعر نکل چکا تھا۔

ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے　　اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

آپ اُسے مطلق خیال نہ تھا۔ کہ میں کیا کہتا ہوں۔ جو جی میں آتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ اور عقیدتمند اشخاص اُس کو سر اور آنکھوں پہ جگہ دیتے تھے۔ مثلاً گلزارِ داغ میں ایک غزل ہے۔ حساب میں، جواب میں۔ اسی طرح میں مہتابِ داغ میں بھی آپ نے کچھ فرمایا ہے۔ دونوں غزلوں کا موازنہ کیا جائے۔ تو یہ کہنا پڑے گا کہ گلزارِ داغ کی غزل مہتابِ داغ کی غزل سے نہ صرف بہتر ہے۔ بلکہ بہتر تھا۔ کہ حضرتِ داغ اس طرح میں دوبارہ طبع آزمائی نہ فرماتے۔ یہاں چند اشعار ہم قافیہ درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ ناظرین خود اندازہ کر سکیں۔ کہ داغ کے کمال نے دکن میں زوال کی صورت اختیار کر لی تھی یعنی مضامین کی تلاش جاتی رہی تھی البتہ سلاست اور روانی نے مشق کی پختگی کے ساتھ اور ترقی کر لی تھی۔

از گلزارِ داغ

شوخی نے تم کو ڈال دیا اضطراب میں "
کچھ تمکنت کا لطف نہ دیکھا شباب میں
گر وہ نہ آئیں گے تو اجل آئے گی ضرور
تسکیں ملی ہوئی ہے مرے اضطراب میں
دنیا کی بازپرس سے اب تک نہیں نجات
اُلجھا ہوا ہوں حشر کے دن بھی حساب میں
کوئی گلہ کرے گا نہ غصہ کی بات کا
کہنا ہو جو کسی کو وہ کہہ لے عتاب میں

از مہتابِ داغ

پوچھے تو کوئی حضرتِ واعظ سے اتنی بات
ایسے ہی تھے جناب بھی عہدِ شباب میں
دیکھا دلِ اُن کا غیر نے سینے پہ رکھ کے ہات
وہ کاش دیکھتے نہ مجھے اضطراب میں
آؤ نہ اتنی دیر نہیں تم کریں کلام
روزِ جزا ابھی ہے توقف حساب میں
تر ہو گئے ہیں کیسے وہ برسے ہیں کس قدر
لگتی لگاتی بات جو کہہ دی عتاب میں

داغ کو جو شہرت تمام اطراف واکنافِ ہند میں ہوئی ہے۔ اُس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اُن کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلا۔ اُن کے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے۔ طوائف کو اُن کا دیوان ازبر تھا۔ اور محفلِ رقص وسرود میں اُن کی غزلیں لطف انگیز اور جوش آور ہوتی تھیں اُن کی قدردانی بھی ایسی ہوئی۔ کہ آج تک کسی اُردو شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اُن کے شاگردوں کی فہرست مصحفی، ناسخ، آتش، ذوق اور غالب سب سے زیادہ طویل ہے۔ اُس وقت ہر غزل گو کی یہ خواہش تھی۔ کہ کسی نہ کسی طرح داغ کی شاگردی کا فخر حاصل کرے۔ خطوط کے ذریعہ سے اصلاح ہوتی تھی۔ اور یوماً فیوماً شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر اقبال بھی جن کا رنگ اپنے اُستاد سے بالکل الگ ہے۔ داغ کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہونے پہ مجبور ہوئے۔ اگرچہ یہ بھی سچ ہے۔ کہ حضرتِ داغ کی بدولت اُن کی زبان کے اسقام بہت کچھ دور ہو گئے

ورنہ اُن کا اکثر کلام بے داغ نہ ہوتا۔
داغ کے انتقال کے بعد اس شاعری کا خاتمہ ہوگیا۔ جو دلی کے زمانہ سے چلی آتی تھی۔ اگرچہ شاگردانِ
داغ مدعی ہیں۔ کہ ہم اب بھی اُس کو چلا رہے ہیں۔
لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ میر و سودا کے بعد جس طرز پر عشقیہ شاعری چلی آتی تھی۔ اُس کی ترقی رک گئی
تھی۔ مصحفی نے اگلوں کی تقلید کو اپنے لئے کافی سمجھا لیکن جرأت نے معاملہ بندی سے ایک نئی کیفیت پیدا
کر دی۔ انشاء نے چھکڑپن اور ریختی کو شاعری میں داخل کر کے نیا شگوفہ کھلایا۔ اور خلیق و ضمیر نے تغزل
سے قطع نظر کی۔ اور مرثیہ گوئی کی طرف راغب ہو گئے۔ ظاہر ہے۔ کہ جب اصل چیز میں دل کشی باقی نہیں
رہی تھی۔ یا وہ دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ تو اُسی وقت ان لوگوں نے دوسری طرف رُخ کیا ہوگا۔ ان
کے بعد جو شاعر پیدا ہوئے۔ اُن کو بالکل صاف نظر آنے لگا۔ کہ اب پرانے رنگ میں کچھ کہنا تحصیل حاصل
ہے۔ اس لئے ناسخ نے تشبیہات و استعارات سے اپنے کلام میں نئی رُوح پھونکنی چاہی۔ اور ذوق و
آتش نے ناسخ کی تقلید اکثر جگہ کی، اگرچہ خاص اپنے رنگ میں بھی ان دونوں نے ایسے اشعار بکثرت کہے
ہیں۔ جن سے اُن کا نام روشن ہے۔ یہاں یہ ضرور کہنا پڑے گا۔ کہ غالب نے اپنا نیا رنگ نکالا۔ جو
اُس وقت قبولِ عام کی سند حاصل نہ کر سکا لیکن حالی نے اُس کے کلام کی خوبیاں ایسے دلپذیر طریقہ سے
بیان کیں۔ کہ سب کی نظروں میں وہی رنگ کھب گیا۔ اور اس کا اتباع ایسی کامیابی کے ساتھ کیا۔ کہ
اوروں کو بھی اسی طرز پہ لکھنے کی جرأت ہوگئی۔ مومن نے نزاکتِ خیال کو اس درجہ پہ پہنچا دیا۔ کہ وہ ناقابلِ
تقلید ہوگیا۔ اُدھر دبیر اور انیس نے مرثیہ گوئی کو آسمانِ عروج پہ پہنچا دیا لیکن آیندہ دور نے اپنی آنکھوں
سے دیکھ لیا۔ اور اپنی زبان سے کہہ دیا۔ کہ ع

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو

ہاں ہم قدیم شاعری کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ نے سنبھالا لیا۔ اور داغ نے پرانے رنگ کو جھلکا
دیا لیکن اب یہ رنگ کچھ ایسا ہلکا ہو گیا تھا۔ کہ کسی پہ نہیں چڑھنے پاتا تھا۔ داغ نے ہزار کوشش کی۔ اور
امیر و تسلیم و جلال وغیرہم نے اُن کا ساتھ دیا۔ مگر یہ چیز لوگوں کے دل سے اُتر چکی تھی کیونکہ دلکشی اور تاثیر
اس شاعری میں باقی نہ رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ غزل گوئی کو معاملہ بندی کے اشعار نے جس قدر دلچسپ بنایا
تھا۔ اُسی قدر وہ صاحبانِ بصیرت کی نظر سے اور گرتی چلی گئی۔ اور آخر کار یہی فیصلہ ہوا۔ کہ اب تغزل اگر
کسی رنگ میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ تو وہ صرف طرزِ غالب ہے۔ ورنہ بیکار اشعار کہہ کر اپنا اور اپنی آیندہ
نسلوں کا مذاق خراب کرنا ہے۔ اور شاعری کو بدنام کرنا ہے۔

داغ نے تقریباً چودہ پندرہ ہزار اشعار صرف غزلوں میں کہے ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن میں بھی پانچ چھ ہزار اشعار ہوں گے لیکن مسدس شہر آشوب کو مستثنیٰ کرنے کے بعد اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو جو مزہ داغ کی غزلوں میں ہے۔ وہ اُن کے کسی اور صنفِ کلام میں نہیں ہے۔ اس شہرت کے باوجود داغ کو اس خاص صنف میں حاصل ہے۔ اور حالی نے بھی جس کو اس شعر میں اس طرح تسلیم کیا ہے۔

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

داغ اور حالی کی ہم طرح غزلوں کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ حالی کا تخیل کہاں سے کہاں پہنچا ہے۔ لیکن داغ نے دلی کی گلیوں سے آگے قدم نہیں بڑھایا یعنی داغ نے قدیم مضامین کو دہرایا ہے اور حالی کے یہاں جدت اور طرزِ ادا میں ندرت ہے۔ ایک غزل کے چند قافیے جو دونوں کے یہاں بندھے ہیں۔ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

حالی - اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا
رو رو کے ہم کو اور رُلانا ضرور تھا

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

دردا کہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا

حالی نہ قدرِ رحمتِ حق پارسا سکے کچھ
ٹھہرا قصوروار اگر بے قصور تھا

دُردی کشانِ بزمِ مغاں کا نہ پوچھ حال
ہر ایک رندِ نشۂ وحدت میں چور تھا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا صبور تھا

داغ - پاسِ ادب سے رہ گئی فریاد کچھ اُدھر
میں کیا کہوں کہ عرشِ بریں کتنی دور تھا

اے داغ صدمۂ غمِ ہجراں بجا درست
یہ سب سہی مگر تمہیں جینا ضرور تھا

یاں امتحانِ برقِ تجلّی ضرور تھا
کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا

کیوں نا امیدِ عفو ہوں کیسا یہ سنے گا وہ
اس کا نہ بخشنا تری رحمت سے دور تھا

ہم [illegible] کے آپ سے [illegible] چال کر گئے
یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا

دیکھا سلف سے آج تک انصافِ عشق کا
تقصیر وار تھا وہی جو بے قصور تھا

رکھا جو تشنہ لب مجھے ساقی نے سیر تھی
جس کو نظر لگی وہی پیمانہ چور تھا

کٹتی نہیں فراق میں بیمار داریاں
ہاتوں میں ساری رات دلِ ناصبور تھا

ہم ایک اور غزل کے چند ہم قافیہ اشعار ذیل میں لکھتے ہیں تاکہ موازنہ کرنے میں اور آسانی ہو جائے :-

حالی - سنگِ گراں ہے راہ میں تمکینِ یار کا
اب دیکھنا ہے زور دلِ بیقرار کا

ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو
ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا

اک خو سی ہو گئی ہے تحمّل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال
سن لیں گے وہ مآل شبِ انتظار کا

داغ - کیا ہو سکے مقابلہ مژگانِ یار کا
دل ایک ہاتھ کا ہے جگر ایک وار کا

انداز کچھ ملانے لگا جورِ یار کا
اب لطف دیکھنا ستمِ روزگار کا

فرقت میں ہم نے اپنی تسلّی کے واسطے
رکھا ہے نام شوخ دلِ بے قرار کا

رہتی تھی اُس کی یاد وہ راتیں کدھر گئیں
اب مجھ کو انتظار ہے اُس انتظار کا

حالی کا یہ شعر بہت مشہور ہے لیکن داغ کے یہاں اس قافیہ کا کوئی شعر نہیں ہے۔

آدم مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل
کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا

ایک اور غزل حوالۂ قلم کی جاتی ہے جس میں سوائے قضا کے اور کوئی ہم قافیہ شعر نہیں :-

حالی - شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد
اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا رجا کے بعد

ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور
ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

گر درد دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا
آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

یادِ خدا میں جب نہ گئی دل سے اُس کی یاد
آگے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد

کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم

داغ - اُس نے اگر کرم بھی کیا تو جفا کے بعد
آیا مری خبر کو ستمگر قضا کے بعد

" ہمدرد کونسا ہے پھر اُس آشنا کے بعد
ہم جی کے کیا کریں گے دلِ مبتلا کے بعد

" آخر بشر کے واسطے کچھ شغل چاہیے
کیجے گا آپ کیا ستمِ ناروا کے بعد

" حسرت سے تک رہا ہوں جو تجھ کو سبب یہ ہے
خاک اڑتے دیکھتا ہوں میں اپنی وفا کے بعد

" یہ چاہتا ہے شوق کہے جائیں حالِ دل
جب تک ہماری زیست ہو ورنہ جزا کے بعد

" بھاگوں علاجِ دردِ محبت سے کیوں نہ میں

حالی - ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد
" آخر کو ماننا پڑا اسے نفسِ خیرہ سر
تیرا بھی حکم کم نہیں حکمِ قضا کے بعد
" مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر
بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد
" حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش
دلکش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

داغ - دیں گے طبیب زہر یقیں ہے دوا کے بعد
" دیتے ہیں داغ لطف و عنایت سے پیشتر
دل مانگتے ہیں کینہ و جور و جفا کے بعد
" بھولے ہم اُن کو پہلے ہی ناراض کر دیا
چوکے ہم اُن سے کرنے تھے شکوے گلہ کے بعد
" خاموش ہیں جو ہوں تو یہاں کامیاب ہے
تاثیر پھر ملے گی نہ میری دعا کے بعد
" آرام کے لئے ہے تمہیں آرزوئے مرگ
اے داغ اور جو چین نہ آیا فنا کے بعد

داغ نے اپنے مقطع میں وہی خیال ظاہر کیا ہے جو اُس کے اُستاد ذوق کے یہاں نہایت عمدہ طریقہ پر بندھ چکا تھا۔ نہیں معلوم داغ نے یہ کیوں گوارا کیا۔ کہ وہی مضمون باندھ دیا۔ اس باب میں داغ کا کچھ قصور نہیں۔ یہ ہماری اس شاعری کا قصور ہے جس میں قافیہ کو اول جگہ دی جاتی ہے۔ پھر اُس کے مناسبِ حال مضمون تراشا جاتا ہے۔ مضمون کے بعد قافیہ نہیں سوچا جاتا۔ یا یہ کہ خیالات تو محدود ہیں۔ جو اس قسم کی شاعری میں کھپ سکتے ہیں۔ لہٰذا وہی خیالات دہرائے جاتے ہیں۔ ذوق کا مشہور شعر یہ ہے:۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

حالی نے تقریباً اُن تمام قافیوں کو بچا کر لکھا ہے۔ جو عشقیہ شاعری کے جزو لاینفک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس غزل میں حالی اور داغ کے ہم قافیہ اشعار کہیں نہیں۔

جب عشقیہ شاعری کی باگ داغ کے ہاتھوں میں پہنچی تو یہ ایک بیجان چیز تھی۔ اور کوئی روح اس شاعری میں باقی نہ رہی تھی۔ لیکن زبان کے چٹخارے نے اس میں ایک لطف پیدا کر دیا۔ کہیں کہیں رفعتِ تخیل نے بعض بعض جگہ تازگیِ مضامین نے اور اکثر مقامات پر حسنِ بیان نے داغ کے کلام کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ لیکن معاملہ بندی نے خصوصاً عام اور بازاری خیالاتِ عشق کے اظہار نے جہاں عوام میں مقبولیت حاصل کی وہاں خواص میں تنفر پیدا کر دیا۔ اور داغ کے شاگردوں نے اسی کو ذریعۂ فروغ سمجھ کر اپنا منتہائے خیال بنا لیا۔ الغرض یہ شاعری ایسی خراب ہوئی۔ کہ اب اس کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہا۔ خدا بھلا کرے حسرت موہانی کا جس نے قدیم شاعری کو خاک مذلت سے اٹھایا اور رفتہ رفتہ گوشۂ عافیت میں پہنچا دیا۔ اب غزل میں ہر قسم کے مضامین ادا ہونے لگے عشقیہ مضامین خال خال ہوتے ہیں۔ زیادہ تر جذبات و حسیاتِ انسانی پر لطیف پیرایہ

جو اپنے دل سے آپ کہے بدمزا جہاں　　ایسے اکھڑے سے بھلا کوئی کیا ملے

آپ کے یہاں شوخی بھی ہے۔ اور بعض جگہ خلافِ شانِ عشق بھی کچھ فرما گئے ہیں۔

شوخی:۔ بسر کیونکر کریں گے خلد میں ہم واعظِ ناداں　　ہمارے جدِ امجد کو نہ واں رہنے کا ڈھب آیا

" کیوں نگہباں بنے آپ پرائے دل کے　　مفت کا مال ہے کھو جائے جو کھو جائیگا

" پھینکنا پیرِ مغاں حضرتِ واعظ تو نہیں　　کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھ کو

خلافِ شانِ عشق:۔

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں　　آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

ہائے وہ دن کہ میسر تھی ہمیں رات نئی　　روز معشوق نیا روز ملاقات نئی

دنیا میں وضعدار حسین اور بھی تو ہیں　　معشوق اک تمہیں تو نہیں اور بھی تو ہیں

تشبیہ یا تلازمہ آپ کے یہاں بھی موجود ہے۔ مثلاً:۔

جب اُس کے مقابل مرے داغِ جگر آئے　　خورشیدِ قیامت کو بھی تارے نظر آئے

چشمک زنی نہ کی ہو کسی چشمِ مست نے　　نرگس کی آنکھ آج جو آئی ہوئی سی ہے

ابروئے یار کیوں نہ کھنچے اس مثال سے　　اُس کے تو ناخنوں میں پڑے ہیں ہلال سے

رکیک اشعار آپ کے یہاں کیوں نہ ہوتے۔ الا ماشاء اللہ اس بارہ میں تو آپ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

نکل کر مرے گھر سے یہ جان لو تم "　　نہ ہوگا کسی گھر گزارا تمہارا

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے　　عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

شربتِ خضر کو منہ بھی نہ لگاؤں ہرگز　　ہو میسر جو لعابِ دہنِ یار کی بوند

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک　　مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار　　اور جو ہم نے آ کے دیکھ لیا

مزا جب ہے کہ اس انداز سے ہوں پیار کی باتیں　　ہمارا ہاتھ سینے پر تمہارا ہاتھ گردن میں

ادھر آ کلیجے سے تجھ کو لگا لوں "　　تجھی پر تو دل آگیا ہے کسی کا

نقد و وعدہ پہ دو بوسوں کے دل لیکر وہ کہتے ہیں　　ہمارا ہی کچھ آتا ہے تمہارا کیا نکلتا ہے

حالانکہ داغ کے یہاں قدیم متروک الفاظ کا کیا ذکر خود اپنے زمانہ میں انہوں نے بعض الفاظ کا استعمال ترک کر دیا تھا لیکن ہماری زبان ترقی کے مراحل جلد جلد طے کر رہی ہے۔ اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ داغ کے زمانہ میں اگرچہ بعض الفاظ مروج اور فصیح تھے۔ ہمارے زمانہ میں متروک ہوگئے ہیں۔ مثلاً:۔

بل بے ۔ ایسے ناداں، کیجے گا بجائے کیجئے گا - وائے ری قسمت بجائے وائے قسمت - اسے لو بالکل متروک ہے - آپی بجائے آپ ہی، کسی پاس بجائے کسی کے پاس -

کون آتا ہے برے وقت کسی پاس اے داغ
لوگ دیوانہ بتاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

سمانے کا بجائے سماؤنگا - ع

میں نہیں پھولا سمانے کا کفِ صیاد میں

بچنے کا نہیں بجائے نہیں بچیگا - جا کے آنے کی نہیں بجائے جا کر نہیں آئے گی - ع

کہ پھر کبھی نہیں رات جا کے آنے کی

مئے عشق میں سرشار ہے اس کی بجائے اب کہیں گے کہ مئے عشق سے سرشار ہے یعنی میں کی بجائے سے استعمال کریں گے ؎

ہم نہیں جانتے کچھ دیر و حرم کا رستہ
ہم مئے عشق میں سرشار چلے جاتے ہیں

یہ ترکیبات زیادہ تر گلزارِ داغ سے لئے گئے ہیں - آفتابِ داغ میں کم اور مہتابِ داغ میں بالکل ان کا پتہ ہی نہیں - ذیل میں داغ کے کلام سے منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں -

عدو سے سامری فن دیکھے اعجاز رقم میرا
عصائے موسوی ہے حق حقائق میں قلم میرا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہِ الفت کبھی نہ کرنا
تمہیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

غضب کیا ترے وعدہ پر اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

آنکھ کھلتے ہی خواب غفلت سے
ہائے کیا کیا نظر نہیں آتا

یا نہ آتے تھے حسینوں کو یہ اندازِ جفا
یا کوئی اگلے زمانہ میں خطا وار نہ تھا

کیونکہ اب اس نگہِ ناز سے جینا ہوگا
زہر وہ ہے اس پہ بہ تاکید کہ پینا ہوگا

دل میں نے دیا تھا اسے کچھ سوچ کے اپنا
سودا تو مجھے ناصحِ ناداں نہ ہوا تھا

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

وعدے پہ کہے ان کے قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ ادھر کل ہے ادھر آج

تمام عالم میں خاک چھانی یہ عشق آخر کو تنگ ہو کر
جب آدمی کو بنایا تو وہ تو دل پہ بیٹھا خدنگ ہو کر

جھکی ذرا چشم جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

یہاں دل میں خیال اور ہے وہاں مد نظر اور
ہے حال طبیعت کا ادھر اور ادھر اور

کیا ہے پیدا اس صنم کو ہزاروں طوفاں اٹھا اٹھا کر
نگاہیں وہ تہ نہیں کہ بولا خدا خدا کر خدا خدا کر

دوستی کا ہو زمانے میں بھروسا کس پر
تو مجھے چھوڑ چلا اے دل شیدا کس پر

کیا ہے مروت خلق ہے سب جمع ہیں بسمل کے پاس
تمہارا قاتل رہا کوئی نہیں قاتل کے پاس

وہی دوست ہیں وہی آشنا وہی آسمان ہے وہی ہیں
عجب اتفاق زمانہ ہے کہ بشر نہیں ہے بشر سے خوش

کبھی یہ دل تماشا گاہ تھا عیش و مروت کا
اب اس میں حسرت و شوق و تمنا سیر کرتے ہیں

حضرت دل کی قضا آئی ہے اس کوچہ میں
کہ یہ دو ڈٹے ہوئے ہر بار چلے جاتے ہیں

تیرہ بختی نہ گئی اپنی تو جانا ہم نے
کہ کبھی رنگ زمانہ کا بدلتا ہی نہیں

حضرت دل آپ ہیں جس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

ہم نہ سمجھتے تھے یہ کہتے تھے کہ مر جائیں گے
تم نہ پہنچو یہ کہتے تھے کچھ انساں ہی نہیں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے چھپے رہیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

اڑ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں

فغاں میں آہ میں فریاد میں شیون میں
سنائیں درد دل طاقت اگر ہو بیٹھنے والے ہیں

فلک دیتا ہے جن کو عیش ان کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

روز محشر میں الٰہی کرے گم مجھ کو
اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

دوستیاں بھی کام آئی نہ دشمنی
شکل زاہد نے نہ پہچانی مری

تدبیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی
بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

تیرے پی لو تو ابھی بہہ جائیگی زاہد
کمبخت قیامت ابھی آتی نہیں جاتی

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی
چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی

رہیں گی دم مرگ تک خواہشیں
طبیعت کوئی آج بھر جائے گی

مل جائے کوئی عاشق دیرینہ تو پوچھوں
کس طرح بسر کرتے ہیں ایام جدائی

چھوڑا ہے ساتھیوں نے پس کارواں مجھے
لیجائے دیکھئے مری قسمت کہاں مجھے

بہتے مغرور وہ جب آ مہری لے اٹھ کبھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

ایسی باتوں سے تو بہتر ہے خموشی واعظ
کہ تری ضد نے کیا اور

یوں تو اے اہمیتہ بھی نہیں ملتا تیرا
توبہ کرتے ہی چھلکتی ہے سیاہی تیری

یار کا پاس نزاکت دل ناشاد سے ہے
نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے

ترے وعدہ کو بت حیلہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے
کبھی شام ہے کبھی صبح ہے کبھی صبح ہے کبھی شام ہے

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لئے

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

سب حسرتوں کا یاس نے کھٹکا مٹا دیا
جن سے خلش تھی دل میں وہ کانٹے نکل گئے

نہ سمجھا عمر گزری اس بت خود سر کو سمجھاتے
پگھل کر موم ہو جاتا اگر پتھر کو سمجھاتے

نیرنگ روزگار سے بدلا نہ رنگ عشق
اپنی ہمیشہ ایک طرح پر گزر گئی

رہتی ہے کب بہار جوانی تمام عمر
مانند بوئے گل ادھر آئی ادھر گئی

ہوا جو ان کی خموشی سے کچھ ملال مجھے
جواب دینے لگی طاقت سوال مجھے

غم اٹھانے کے واسطے دم ہے
زندگی ہے اگر تو کیا غم ہے

صدقے میں تم نے چھوڑ دئے ہیں بہت اسیر
میں بھی رہا ہوا کہ گرفتار ہی رہا

قتل ہونے نہ دیا شکر جتانے مجھ کو
کام آتے ہیں برے وقت میں اوسان بہت

چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو
وہ طریقہ تو بتا دو تمہیں چاہیں کیونکر

یہ کیا کہا کہ داغ کو پہچانتے نہیں
وہ ایک ہی تو شخص ہے تم جانتے نہیں

نگاہ پھیر کے عذر سوال کرتے ہیں
مجھے وہ الٹی چھری سے حلال کرتے ہیں

بھویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

رہرو راہ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

کچھ آنے لگا جب سے اثر آہ رسا میں
دل اور ہوا ہیں ہے مگر اور ہوا میں

کل تک تو آشنا تھے مگر آج غیر ہو
دو دن میں یہ مزاج ہے آگے کو خیر ہو

ہر دل میں نئے درد سے ہے یاد کسی کی ” ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی
سبق ایسا پڑھا دیا تو نے دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
اُس کی چتون نظر میں پھرتی ہے اک چھُری سی جگر میں پھرتی ہے
گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے
ہمارے دم نکلنے میں بھی اک عالم نکلتا ہے کہ وہ مشتاق ہیں دیکھیں تو کیونکر دم نکلتا ہے
جو راہِ عاشقی میں مٹا کیمیا ہوا کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا
وہ صدمے اُٹھائے ہیں کہ ہر دم یہ دُعا ہے دُنیا میں کسی کو نہ محبت ہو کسی کی
اب وہ یہ کہہ رہے ہیں مری مان جائیے اللہ تیری شان کے قربان جائیے
پرسش جو اُن سے ظلم کی روزِ جزا ہوئی اتنا ہی کہہ کے چھوٹ گئے وہ خطا ہوئی
لذتِ سیرِ دگر چشمِ تمنا لے گئی ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گئی

حالی

آپ کا نام خواجہ الطاف حسین اور حالی تخلص ہے۔ آپ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء
میں بمقام قصبہ پانی پت پیدا ہوئے۔ آپ کے باپ خواجہ ایزد بخش کا سلسلۂ نسب
حضرت ابو ایوب انصاری سے ملتا ہے۔ اور آپ کی پیدائش کے بعد آپ کی والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور
جب آپ نو برس کے تھے۔ تو آپ کے والد کا سایۂ عاطفت بھی اٹھ گیا۔ آپ کے بڑے بھائی اور بہنوں
نے آپ کی سرپرستی کی۔ اول آپ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد سید جعفر علی مرحوم سے جو فارسی لٹریچر، تاریخ
اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر
سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق پیدا ہو گیا۔ اور حاجی ابراہیم حسین انصاری
سے صرف و نحو پڑھی۔ مگر چند روز بعد بھائی اور بہن نے تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت آپ کی عمر سترہ
برس کی تھی۔ آپ کو تعلیم کا شوق تھا۔ اور گھر والے نوکری کی تلاش کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ آخر کار
آپ گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلے گئے۔ اور ڈیڑھ برس کے قریب وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو
اور ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے پڑھیں۔ آپ نے ابھی شرح سلم ملا حسن اور
میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ پانی پت عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار ناچار واپس جانا پڑا۔
اور وہاں برس ڈیڑھ برس تک بطور خود اکثر پڑھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ ۱۸۵۶ء میں
صاحب کلکٹر کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ لیکن غدر کے زمانے میں آپ پانی پت کے مشہور فضلا سے کسی
ترتیب اور انتظام کے بغیر کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث اور کبھی تفسیر پڑھتے رہتے۔ اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر
بھی کسی کی اصلاح یا مشورہ کے بغیر لکھتے۔ جس زمانے میں آپ دلی میں قیام پذیر تھے۔ آپ مرزا
اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور اکثر ان کے اردو اور فارسی دیوان کے اشعار
جو سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ان کے معنی ان سے پوچھا کرتے تھے۔ اور چند فارسی قصیدے کلیات کے انہوں نے
آپ کو اپنے دیوان میں سے پڑھائے تھے۔ آپ نے دو ایک غزلیں لکھ کر ان سے اصلاح بھی لی۔
غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزر گئے۔ تو فکر معاش نے گھر سے

نکلنے پر مجبور کیا۔ حسن اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں مرحوم سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں
شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا مذاق رکھتے تھے، شناسائی ہوگئی۔ آٹھ سات برس تک
بطور مصاحبت کے اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی صحبت میں آپ کا طبعی میلان جو اب تک
مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر
غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ آپ کو بھی لکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور مرزا غالب کے پاس اصلاح کے لئے
بھیجیں۔ مگر درحقیقت آپ کو مرزا کے مشورہ و اصلاح سے اتنا فائدہ نہیں ہوا۔ جتنا کہ نواب صاحب
مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے۔ اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف
پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے
تھے۔ ان کے ان خیالات کا اثر آپ پر بھی پڑنے لگا۔ چنانچہ مرزا غالب اور نواب شیفتہ سے استفادہ
شاعری کی نسبت جو آپ کا خیال ہے۔ وہ آپ کے اس شعر سے ہویدا ہے۔

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں
غالب کا معتقد ہوں، مقلد ہوں میر کا

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں آپ ملازم ہوگئے۔ اور آپ کو یہ
خدمت کرنی پڑتی تھی۔ کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے۔ ان کی عبارت درست کیا کرتے
تھے۔ اس سلسلے میں آپ چار برس تک لاہور میں رہے۔ اور وہاں چار مثنویاں ایک برسات پر،
دوسری امید پر، تیسری رحم و انصاف پر، اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔ بعد ازاں لاہور سے اینگلو عربک
اسکول دہلی کی مدرسی پر بدل کر آگئے۔ یہاں سے پھر آپ سپیشل کالج لاہور میں گئے۔ اور وہاں آٹھ ماہ
تک اتالیق رہے۔ مگر چونکہ یہ اسامی آپ کے مذاق کے موافق نہ تھی۔ اس لئے پھر اپنی جگہ واپس
چلے آئے۔

تصنیفات

آپ نے نظم کے سوا نثر اردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۸۶۷ء میں تریاق مسموم
ایک عیسائی کی کتاب کے جواب میں لکھی۔ لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو
جیالوجی میں تھی ترجمہ کیا۔ ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لئے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النسا
لکھی۔ پھر دلی میں سعدی شیرازی کی حیات اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا۔ جس کا نام حیات سعدی
ہے۔ پھر شاعری پر ایک مبسوط مضمون لکھ کر بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے
بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے۔ اور نیز
ان کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے، یادگار غالب کے نام سے لکھ کر شائع کی۔ بعد ازاں سر سید احمد خاں

کے حالاتِ زندگی موسوم بہ حیاتِ جاوید جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے، لکھی۔ ان کتابوں کے علاوہ فارسی
گرامر وغیرہ پر بھی کتابیں لکھیں۔ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے۔ اردو کے
علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم آپ کی نظم و نثر موجود ہے۔ آپ نے ۱۸۷۹ء میں مدوجزرِ اسلام
لکھا۔ جو مسدسِ حالی کے نام سے مشہور ہے۔

شمائل و خصائل

آپ کے شمائل و خصائل کا باب نہایت وسیع ہے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ آپ کے
اوصاف کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ آپ انسان تھے۔ لیکن فرشتہ صفت
آپ فرشتہ تھے۔ لیکن انسانی خصائص کے ساتھ۔ آپ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہونے سے قلب
کی عجب کیفیت ہوتی تھی۔ وہ سکون اور اطمینانِ خاطر میسر ہوتا تھا۔ جو اولیاء کرام کی صحبت میں لوگوں
کو حاصل ہوتا ہے۔ آپ کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال اور انصاف پسندی تھی۔ کبھی کسی
کی برائی آپ کی زبان سے نہیں سنی گئی۔ آپ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے
عزیزوں سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ غریبوں کی امداد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ مذہباً نہایت
بے تعصب تھے۔ اگرچہ آپ کے والدین شیعہ تھے، مگر آپ کے بڑے بھائی سُنّی ہو گئے تھے جن کے سایۂ عاطفت
میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی اس لئے آپ بھی سنی المذہب تھے۔ آپ بلند خیال، نیک نفس، محبِ اہلِ بیت اور
صوفی منش تھے مسلمانوں کے مذہبی اختلاف کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ آپ کے پاس بیٹھنے اور باتیں سننے سے
نہایت بدباطن اشخاص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

آپ میں عدل و میانہ روی کے ساتھ ساتھ رحم و مروت کی صفات بھی تھیں۔ پانی پت
بلکہ اس تمام علاقہ کو فخر ہو سکتا ہے۔ کہ ایسا انسانِ کامل پیدا ہوا۔ جس نے خود کو کبھی غیر معمولی آدمی
بھی نہ سمجھا۔ اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجے کا اعتدال تھا۔
عزیزوں اور اولاد کی محبت، تعلیم کا خیال، عالم کی خیر خواہی اور نیک آدمیوں کی قدردانی میں آپ کی
مثال ضرور ملے گی۔ مگر نہایت کم۔ آپ کا انتقال دو دن کے کرب کے بعد قرآن شریف اور ادعیہ
سنتے سنتے یکایک ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو ہو گیا۔

آپ کی شاعری پر اودھ پنچ اور بہت سے اخبارات و رسائل نے نکتہ چینیاں کیں۔ لیکن آپ
نے کسی کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خود فرماتے ہیں:—

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

کلام پر تبصرہ

حالی کی شاعری مستغنی عن التعریف ہے۔ جب مرزا غالب جیسا سخن فہم اور سخن گو حالی سے پہلی غزل کی اصلاح کے وقت یہ کہے۔ کہ میرا قاعدہ ہے کہ میں لوگوں کو شاعری سے محترز رہنے کی صلاح دیا کرتا ہوں مگر تمہارے لئے میرا یہ مشورہ ہے کہ شاعری نہ ترک کرنا۔ ورنہ تم اپنی طبیعت پر بہت جبر کرو گے۔ تو حالی کے فطری شاعر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ بہت ہی اچھا ہوا کہ طبیعت کی اُفتاد اور اُستاد کی نصیحت نے شاعری کو خیرباد نہ کہنے دیا، ورنہ ہم مسدس مد و جزر اسلام جیسی نادر و لاجواب شے سے بھی محروم ہو جاتے بیشک حالی نے اُس وقت بھی جبکہ تغزل کا دور دورہ تھا۔ اور شاعری صرف غزل گوئی تک محدود تھی۔ اپنے لئے ایک تیار راستہ نکال لیا تھا۔ ہم کو معلوم ہے۔ کہ اُس وقت مرزا غالب کا رنگ ممتنع الجواب تھا۔ اور مومن کی نازک خیالی صرف اُن کی ذات تک وابستہ تھی۔ لیکن ذوق اور اُن کے شاگرد عام شاہراہ پر چل رہے تھے۔ اور نہ صرف ذوق اور اُن کے شاگرد، بلکہ تمام لوگ جو شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے، قدما کی تقلید کو فخر سمجھتے تھے۔ اور وہی مضامین اور وہی خیالات مختلف الفاظ کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ ان حالات میں حالی کا وہ رنگ تغزل اختیار کرنا جس کی اور لوگ بھی تقلید کر سکیں جو متانت و رزانت میں اپنی آپ نظیر ہو، جو سیاٹ اور کیکا نہ ہو۔ عام فہم لیکن کسی قدر غور طلب ہو، جو زندگی کے مسائل سے تعلق رکھتا ہو، جو شاعرانہ انداز میں پند و نصیحت کا مجموعہ ہو، جو عاشقانہ مضامین کے بیان میں انداز دلگدازی رکھتا ہو، بیحد قابل تعریف ہے۔ سچ یہ ہے۔ کہ حالی نے نہ صرف نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی اور اس کے عمدہ نمونے ہمارے سامنے پیش کئے، بلکہ در حقیقت رنگ تغزل میں بھی وہ مخترع اور موجد کے نام سے موسوم کئے جانے کے اہل ہیں۔ اُن کا اپنا رنگ سب سے نرالا ہے، مگر جس انداز سے اُنہوں نے اپنے مضامین کو غزل میں بیان کیا ہے۔ بعض بعض جگہ میر کا اور کہیں کہیں غالب کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ مومن کی نازک خیالی کا بھی بعض اشعار سے پتہ لگتا ہے لیکن حقیقت نفس الامری یہی ہے کہ یہ انداز سخن خاص حالی کا ہے۔ اس کو نہ میر کا کہہ سکتے ہیں نہ غالب کا، اور نہ مومن کا۔ ہمارے موجودہ شعرا کا رنگ بھی حالی سے ملتا جلتا ہے۔ اگرچہ وہ حالی کے مقلد ہونے کو فخر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے، وہ غالب کی تقلید کو فخر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس لحاظ سے وہ بالکل ناکام ہیں۔ اگر اُن کے عمدہ اشعار بغور ملاحظہ کئے جائیں۔ تو فی الواقع وہ غالب کی نسبت حالی سے زیادہ

قربت رکھتے ہیں

میرا یہ خیال ہے کہ اب غزل میں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی، اگر باقی ہے تو حالی ہی کے رنگ میں کچھ کہہ کر موجودہ شعرا اپنے آپ کو شاعر کے معزز خطاب سے مخاطب کر سکتے ہیں۔ ورنہ ان کی جد و جہد میدانِ شاعری میں بے ہنگام اور نا مشکور ثابت ہوگی۔

میر کی طرح حالی کے یہاں بھی معمولی تشبیہات ہیں۔ لیکن نادر الوجود وہ خود اُن کی اپنی ہیں۔ اور مضمونِ شعر کا پورا پورا نقشہ کھینچ دیتی ہیں۔ میر کا شعر ہے :-

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

کیسی معمولی تشبیہ ہے، لیکن اگر یہ تشبیہ نہ ہو۔ تو شعر بے لطف ہو جائے۔ اسی طرح حالی کے یہاں حسبِ ذیل تشبیہات ملاحظہ کیجئے اور لطف اٹھائیے۔

ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کئے بغیر
دام اٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کئے بغیر

نفس ہے سر پہ ہوئی دانش نہ صبر و عقل و ہوش
ایک دشمن پہ سر کہیں ہو تو ہیں سب یار ہیچ

یاد ہیں تیری سب کو بھول گئے
کھو دئے ایک دُکھ نے سب امراض

عشق سے ہے مجتنب زاہد عبث
شیر کو صید زبوں سے کیا غرض

وعظ میں عمل کرتے ہیں واعظ
منہ میں اُن کے زباں ہے یا مقراض

صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

منہ سے دھواں سا اٹھا لیتے ہی نام سلام
یاد درد بچھ رہی تھی گویا لب و دہن میں

ہائے بزم بھی اب ملتی نہیں اُسے جا
رندوں میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
اپنے الجھاؤ ترے کا کل پیچاں میں نہیں

حقیقت محرم اسرار سے پوچھ
مزا انگور کا ہے خوار سے پوچھ

میر کے رنگ میں حالی نے بعض طویل بحروں میں خوب اشعار کہے ہیں۔ مثلاً۔

رہے ہیں وحشت جنوں کی تیرے عجب مزا خوشگوار دیکھا
نہ اس سفر میں تکان دیکھی نہ اس نشہ میں خمار دیکھا

چمن میں بھولے سے جا بھی نکلے اگر کبھی داغدار تیرے
گل اُن کی نظروں میں چبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا

سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دئے ہاتھ باندھ سب کے
جنہیں تھا یاں اختیار سب کچھ اُنہیں بھی بے اختیار دیکھا

جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوئے کان ہمیں

کچھ روزوں غفلت میں پھرے یاں ڈھونڈتے ہم آسائش کو
کھل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا خلجان ہمیں
(یعنی دنیا میں آرام و راحت کی تلاش بے سود ہے)

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اُس کو سارے تمہارے آگئے یاد احسان ہمیں

سُر بھی وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غُل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب حالیؔ یاں سمجھو تم مہمان ہمیں

غالب کے رنگ میں بھی بہت سے اشعار ہیں۔ مثلاً اُن میں سے چند پیش کرتا ہوں۔

قیدِ خودی میں رہتے آتے نہیں نظر ہم
وحشت رہے گی دل کی دکھلا کے جوہر اپنا

پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزبان کوئی مہماں نہ تھا

کیا جانئے نہ جائیگا جی اک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط مگر ہم جاں نہ تھا

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

سنگِ گراں ہے راہ میں تمکینِ یار کا
اب دیکھنا ہے زور دلِ بے قرار کا

اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا
ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب

سرمایۂ خلافتِ دو عالم ہے رازِ دل
باتوں میں ہم نے زہر ملایا نہیں ہنوز

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

سنتے ہیں اُس کے گو ہیں بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

ہیں دورِ جامِ اوّلِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھئے ہم کو سحر کہاں

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

نہیں آبِ بقا جز جلوۂ دوست
کسی لبِ تشنۂ دیدار سے پوچھ

فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل
یہ نکتہ عندلیبِ زار سے پوچھ

دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے

پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی
اُتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے

چارہ گر! انکار یہ اندازۂ تدبیر نہیں
کیجیو ہمت اگر وقتِ دعا یاد رہے

مومن کی نازک خیالی بھی حالی کے یہاں موجود ہے۔ مثلاً

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا

آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل
کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا

کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

آیا نہ ہوگا اُس کو تغافل میں کچھ مزا
ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز

گو صبح بھی تھی روزِ مصیبت کی قیامت
پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہے درپیش

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے
شکوے وہ سب سنا گئے اور مہرباں رہے

ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں
وہ اگر ہمت آزمانے لگے

جان بچتی نظر نہیں آتی
غیر الفت بہت جتانے لگے

تقاضائے محبت ہے وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو لے گیا ہے وہ بیدادفن کہاں

غصے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے
آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے

کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

حق ہوا کس سے ادا اُس کی وفاداری کا
جس کے نزدیک جفا باعثِ آزار نہیں

بیقراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال
اک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

حالی کی خصوصیات

ہمارے مشرقی شعرا جو اخلاقی لحاظ سے بھی بلند پایہ رکھتے ہیں بعض اوقات رنگین اشعار کہنے میں تامل نہیں کرتے۔ چنانچہ سعدی علیہ الرحمۃ بھی اپنی

ہزلیات کی وجہ سے کافی طور پر مشہور ہیں۔ اور میر صاحب جن کی بد دماغی مشہورِ عالم ہے۔ اور جن سے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ کہ حسبِ ذیل شعر اُن کا ہوگا۔

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

اِس آلودگی سے اپنے دامن کو نہیں بچا سکے۔ لیکن یہ حالی کی خصوصیت ہے۔ کہ کیا نظم اور کیا نثر دونوں میں متانت و وقار کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کوئی شعر مخربِ اخلاق کیا معنی سُبکی کی طرف مائل نہ پایا جائے گا۔ جن مضامین کو ہمارے یہاں کے شعرا بے تکلف شرمناک الفاظ کے ساتھ باندھ جاتے ہیں۔ اور معاملہ بندی کی داد حاصل کر لیتے ہیں۔ حالی کے یہاں اوّل تو اس قسم کے اشعار ہی نہ ملیں گے۔ اور اگر کہیں کچھ اس کا شائبہ بھی ہوگا۔ تو ایسے الفاظ انتخاب کئے ہوں گے، جن سے خود اصل مضمون بھی بلند ہو گیا ہوگا۔ مثلاً

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیئے جواب — مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا
کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے — پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ — ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا
نہیں بھولتا اُس کی رخصت کا وقت — وہ رو رو کے ملنا گلا ہو گیا
مجھ میں وہ تاب ضبطِ شکایت کہاں ہے اب — چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب

حالی کی جس قدر غزلیں ہیں مرصع ہیں، اور جس قدر اُن کے اشعار ہیں سب خوب ہیں۔ بھرتی کے اشعار نہیں۔ یہ ممکن ہے۔ کہ ایک شعر کسی دوسرے شعر یا چند اشعار سے بہتر ہو۔ لیکن ان کا ہر شعر بھی ایک معنی خیز مضمون رکھتا ہے اور غالباً دیوان میں داخل نہیں کیا گیا جب تک اس کے اندر کوئی خوبی نہیں دیکھی گئی۔ دیگر اساتذہ کے یہاں یہ بات نہیں پائی جائے گی۔ شاید میر درد اس خوبی میں حالی کے شریک ہوں تو ہوں۔ ورنہ میر صاحب سے لے کر اب تک کسی شاعر نے اس امر کا التزام نہیں کیا۔ کہ بھرتی کے اشعار کو اپنے دیوان سے خارج کر دیا ہو۔

حالی کی غزل کے مضامین اُن چند خیالات تک محدود نہیں ہیں۔ جو ولی سے آج تک ہمارے شعرا یکے بعد دیگرے لکھتے چلے آتے ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف مسائل کو پیش کرتے ہیں اور مختلف پہلوؤں سے اُن پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ یہ مختلف خیالات جن کی ادائیگی کے لئے کوئی ہموار زبان ہمارے سامنے نہ تھی۔ حالی نے ایسی شستہ و رفتہ زبان میں ان کو ادا کیا ہے۔ کہ عام شاہراہ

سے ان کے مختلف ہونے کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں اُن کی اور ان کا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلائشوں ہیں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دُنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

سب کی سُن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور ان کا رازداں سب سے الگ

شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہوئے
دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک مُندی
اس میں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی

دوست گر بھائی نہ ہو دوست تجھ بھی لیکن
بھائی گر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی

جی گئے ہم پہ رہے مُردوں سے بدتر حالی
دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی

ہمارے اساتذہ کے دیوانوں کو چھان ڈالئے۔ ذال، صاد، ضاد، اور غین وغیرہ کی ردیف کے اشعار کہیں پُر لطف نہ ملیں گے۔ مگر حالی کے یہاں یہ بات نہیں۔ ان ردیفوں میں بھی اسی قدر بلند اور عمدہ اشعار ہیں۔ جس قدر کہ دیگر آسان اور رائج الوقت ردیفوں کے ہیں۔ مثلاً

جس کا تو قاتل ہو پھر اُس کے لئے
کونسی نعمت ہے خنجر سے لذیذ

گو زمانے نے بھلا دی دل سے اپنے فصلِ گُل
یاد ہیں لیکن وہ بلبل کی صدائیں خاص خاص

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص

حور و غلماں کے لئے لائیں دل آخر کس کا
ہوتے دیتا نہیں یاں عہدہ برآ ایک ہی شخص

عشق کو ترکِ جنوں سے کیا غرض
چرخِ گرداں کو سکوں سے کیا غرض

کر چکا جب شیخ تسخیرِ قلوب
اب اُسے دُنیائے دوں سے کیا غرض

کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن
سُنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ

جنگل میں تختۂ گلِ خودرو کو دیکھ کر
تازہ ہوا زمانہ کی ناقدریوں کا داغ

کرے گی بادِ بہار آ کے اب کسے سرسبز
رہا نہ باغ قدم بہار کے لائق

تغزل میں حالی کی زبان صاف، ستھری اور منجھی ہوئی ہے۔ اور کیوں نہ ہو خاص دلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ ہندی الفاظ کو نہایت خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ میر کے سوا شاید اور کوئی شاعر ہندی الفاظ کو ایسی خوبی سے نہیں ادا کر سکا۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کش ہیں۔

توفیق نے ہمیشہ کی نت نت پر ختیاں
جب ناؤ ڈگمگائی پاس آگیا کنارا

نفس دعویٰ بے گناہی کا سدا کرتا رہا
گرچہ اترے جی سے دل اکثر ابا کرتا رہا

چٹکیاں سی دل میں بے لیتا ہے کون
شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

سچی ہے الفت بے اور محبت سے کلفت نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

آس کھیتی کے پنپنے کی انہیں ہو یا نہ ہو
ہیں اسے پانی دیئے جاتے کسانوں کی طرح

کاہشوں سے پرورش پاتی ہے روح
اب لگا کھایا پیا سب آ کے انگ

ہم سے کچھ دنیا ہی تپیا کی نہ حالی ورنہ یاں
دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم

یہ طبل تہی ہیں جو بنکارتے ہیں
جنہیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

ہے افسردہ مجلس کی شہ مست سے واعظ
وہ گرمائے گا یہ پسیجیں گے جب کچھ

پھر اوروں کی تکتے پھرو گے سخاوت
بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ

صبر و سکوں سے ہم کو یہی نبیڑنے دے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اے کاہش نہانی

جب وقت پڑے دیجئے دستک درِ دل پر
جھکئے فقرا سے نہ جھکیئے امرا سے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہل نظر کی تم پر
تم میں روپ اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ نظموں میں حالی نے بعض متروک الفاظ استعمال کئے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کا استعمال جائز سمجھتے ہیں۔ اور ان کو ترک کرنا پسند نہیں فرماتے۔ ظاہر ہے کہ کوئی لفظ بذاتہ برا یا بھلا نہیں ہوتا، کثرت استعمال سے فصیح ہو جاتا ہے۔ اور عدم استعمال سے غیر فصیح جو لوگ نظموں کی دقتوں سے واقف ہیں۔ وہ ہرگز اپنی زبان کے الفاظ کو محدود کرنا پسند نہ کریں گے اور اسی میں حالی کے متروک الفاظ استعمال کرنے کی معذرت پنہاں ہے۔

حالی پر کم فہم لوگوں نے بہت اعتراضات کئے ہیں۔ اور اکثر ناشاعر لوگ جو اپنے آپ کو شاعر سمجھتے ہیں۔ حالی کے بہت منہ آتے ہیں، لیکن ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ مبالغہ ہرگز شاعری کی جان نہیں۔ اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنا دینا حقیقی شاعری ہے۔ اور یہ کمال حالی میں موجود ہے

کمال ہے ضد بے کمالی، نہیں ملاپ ان میں زینہار!
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجئے گا، تو آپ بے جا نہ کیجئے گا

ذیل میں مولانا حالی کے منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں:-

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندہ نافرمان ہے حمد سرا تیرا

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا
چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا

قفلِ درِ مراد سب اک بار کھل گئے
چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا

دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر
لا تقنطوا جواب ہے ھل من مزید کا

بہتر ہے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ سے کیا یہ تجھ کو دیکھا کبھی نہ سرگرم کار دیکھا

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے
اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا

رونا نہ ہوگا حالی شاید یہ کم ہمارا
جیسے دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمہارا

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا
دیکھا ہے ہم نے برسوں الطاف و کرم تمہارا

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا

یارب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذبِ حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

خلوت میں تری صوفی گر نورِ صفا ہوتا
تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

تھا آفتِ جاں اس کا اندازِ کماں داری
ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

درد اک لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

اک خوشی ہوگئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

غربت کے مشغلوں نے وطن کو بھلا دیا
خاتمہ ہے خاطرِ الفت شعار کا

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا
چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب

حالی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش
وہ علم و دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت — پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے — مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

اُن کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں — دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

سمجھ کر کیجو قتل حالیؔ کو دیکھو — مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

گو دردِ دل سے پائی بھی اس نے چارہ گر شفا — آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

کرتے رہے خطائیں ندہب کے بعد ہم — ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد

جس کا تو قاتل ہو پھر اُس کے لئے — کون سی نعمت ہے خنجر سے لذیذ

گو ہو شفا سے یاس پہ جب تک ہے دم میں دم — بن آئے گی نہ درد کا درماں کئے بغیر

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

ڈر ہے دلوں کیساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں — اے آسیا ہے گردشِ لیل و نہار بس

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں — فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

اعتراضوں کا زمانہ کے ہے حالیؔ پہ نچوڑ — شاعر اب سارے خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

یارب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو — بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں — مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک ایک

ہم نہ تھے آگاہ واعظ زشتخوئی سے تری — آدمی تجھ کو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم

راہ کے طالب ہیں پر بے راہ پڑتے ہیں قدم — دیکھئے کیا ڈھونڈتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم — کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خود رفتگیِ شب کا مزا بھولتا نہیں — آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق — بدلیں گے تجھ کو زندگیِ جاوداں سے ہم

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری — سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

عیب یہ ہے کہ کرو عیب، ہنر دکھلاؤ — ورنہ یاں عیب تو سب فردِ بشر کرتے ہیں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر — تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی " — دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالیؔ — عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے — جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں

جی ڈھونڈھتا ہے بزمِ طرب میں انھیں مگر — وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

دل ہو گیا ہے لذتِ غربت سے آشنا — اب ہم کہاں ہوائے نشاطِ وطن کہاں

مرے دل میں ہو گو مجھ سے نہاں ہو " — مجھے بھی ڈھونڈھ لیتا تم جہاں ہو

مصیبت کا ایک اک سے احوال کہنا — مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے — گر مے نہیں دے زہر ہی کا جام پلا دے

درگزرے دوا سے تو بھروسے پہ دعا کے — درگزریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذاتِ خدا — ورنہ بے عیب زمانہ میں چلن کس کا ہے

کیا جو ہیں بے وفا کرتے آئے ہیں احباب — کہا زمانے کی عادت بدلتی جاتی ہے

دلِ غنی رکھتے ہیں اے دولتِ دنیا جو لوگ — تیور ان کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر — پھول ہیں گر آن ہے کانٹے ہیں بھی اک شان ہے

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی سے مل کے ہو گئے تم افسردہ دل بہت — اگلے سے ولولے وہ اب اس میں کہاں رہے

ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر — نہ ہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا " — اب لیا چشمۂ بقا تو نے

بے وفا کونسی خوبی ہے نہیں جو تجھ میں؟ — وصف جتنے ہیں جہاں، ایک وفا ورنہ سہی

اکبر

۱

اکبر حسین نام اکبر تخلص تھا۔ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ دیسی مکاتب اور سرکاری مدرسوں میں تعلیم پاکر ۱۸۶۶ء میں امتحان وکالت درجۂ ادنیٰ پاس کیا۔ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ اور ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ کے مسل خواں مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں وکالت درجۂ اعلیٰ کی سند حاصل کرکے ۱۸۸۰ء میں سب جج اور ۱۸۹۴ء میں جج عدالت خفیفہ درجۂ اول اور سشن جج مقرر ہوئے اور کئی سال تک ہزار بارہ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پاتے رہے۔ ۱۹۰۳ء میں اپنے مستقل عہدہ ججی عدالت خفیفہ الہ آباد سے نہایت نیک نامی کے ساتھ پنشن لے کر علیحدہ ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ نے خان بہادر کا خطاب مرحمت فرمایا۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی مقرر ہو گئے تھے۔

اکبر منشی غلام حسین صاحب وحید الہ آبادی کے شاگرد رشید تھے۔ عربی، فارسی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور زبان انگریزی اور اس کے علم ادب سے بخوبی ماہر تھے۔ وحید خواجۂ آتش کے شاگرد تھے۔ اور اس طرح اکبر کا سلسلۂ تلمذ مصحفی سے ملتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۲۱ء میں بمقام الہ آباد رحلت فرمائی اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ کے کلام نے تمام ہندوستان کو مسخر کر لیا تھا۔ اپنے طرز خاص میں مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں ظریف الطبع، خوش اخلاق، نیکوکردار ہونے کے علاوہ آپ وحید عصر اور یگانۂ روزگار تھے۔

کلام پر تبصرہ

اکبر اپنے زمانہ کا نہایت خوشگوار، بذلہ سنج اور ظریف شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اُس کی شاعری کی ابتدا دبستان لکھنؤ میں ہوئی۔ امیر، تسلیم، نفیس، اوج، جلال وغیرہم کا زمانہ تھا۔ ممکن ہے رشک شاگرد ناسخ بھی زندہ ہوں۔ طبع آزمائی کے لئے میدان وسیع پایا۔ ظرافت فطری تھی۔ قدرتی سامان یہ ہوا۔ کہ منشی سجاد حسین کاکوروی نے اودھ پنچ نکالنا شروع کر دیا۔ بس اب کیا تھا جیسے بارود میں

آگ لگا دی۔ مضحک یا طعن آمیز غزلیں اور نظمیں شائع ہونی شروع ہوگئیں۔ سر سید انگریزی تعلیم کا پرچار کر رہے تھے۔ اور کالج کی بنیاد علی گڑھ میں ڈال چکے تھے۔ علمائے کرام انگریزی تعلیم کے خلاف تھے۔ اور اکبر مذہبی لحاظ سے ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری اور ظرافت سے کام لے کر سر سید کے مشن کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ کلیاتِ اکبر کے حصہ اول میں صفحہ ۱۵۹ پر ایک قطعہ ہے۔ جس کا پہلا شعر ہے

خدا جانے کہا کس نے یہ کس دن عقلِ مسلم سے
کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

گئی دُنیا تو پھر ہم دین کو اب کیوں لگا رکھیں"   بُرا معلوم ہوتا ہے مسائل کا یہ پشتارا
مضر ہیں مذہبی قیدیں مناسب ہے شکست اِن کی   مزاحم ہیں مگر یہ مولوی اِن کا نہیں چارا
وہ چھینٹے دیجئے اُن کو حکیمانہ طریقوں سے   کہ بجھ کر راکھ ہی ہو جائے مذہب کا یہ انگارا
چلے معتراض تدبیر ایسے پیچیدہ طریقوں سے   کہ جڑ کٹ جائے مذہب کی یہ گھر ہو منہدم سارا
اِدھر تحریر اُدھر اپیچ اِدھر سازش اُدھر بندش   اِسے جھڑکا اُسے ڈانٹا اِسے گانٹھا اُسے مارا
نتائج پر نظر کب مردِ عاشق تن کی ہوتی ہے   وہ سمجھا ہیں نئی اک قوم کا بن جاؤں گا دارا
نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے   نہ اکبر کی ظرافت سے رُکے یارانِ خود آرا
ہوا سب کو تعجب کیوں ہوئیں یہ حالتیں پیدا   نہ تھا یہ مطلب سید کہ اِس رُخ پر چلے دھارا

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر   تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں۔   خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و وا ویلا
ہمنشیں کہتا ہے کچھ پروا نہیں مذہب گیا   میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا
سید اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے   شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

مختصر یہ کہ اکبر کی ظرافت سے سر سید کا کام تو نہیں رُکا۔ اور نہ اکبر کا شاید یہ قصد تھا۔ وہ خود انگریزی جانتے تھے۔ اور جج کے عہدہ پر فائز تھے۔ لیکن اکبر میں جو قدرت نے شاعری کا مادہ ودیعت کیا تھا۔ وہ اُبھر آیا۔ اور اکبر کے جو کچھ ذاتی احساسات و خیالات تھے۔ اُن کو سلیقے کے ساتھ ظاہر کر دیا اگر اودھ پنچ کا اجرا نہ ہوتا۔ یا علی گڑھ کی تحریک نہ ہوتی۔ تو اکبر بحیثیت شاعر ہمارے سامنے جلوہ گر

نہ ہوتے۔ لیکن اب

امید ہے دعا کی اہلِ سخن سے اکبر
میرے حقوق بھی کچھ اردو زبان پر ہیں

زمانہ اپنا رنگ بدل چکا تھا۔ قدیم شاعری کے خلاف معرکہ آرائی شروع ہو گئی تھی۔ مگر جمادِ جمود کی حالت تھی۔ شعرائے عصر اپنی قدیم وضع و گفتار کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اور اسی میں مست تھے اکبر نے اس رنگ کو ترک کیا لیکن اس طرح کہ ظرافت کے ساتھ ساتھ خیالات میں بھی تبدیلی کرتے رہے۔ اور ایک آدھ شعر متانت کے ساتھ قدیم وضع پر بھی کہتے رہے۔ اور یہی رنگ انہوں نے آخر تک نبایا۔

ایک صاحب نے آپ کے کلام کی نسبت یہ رائے ظاہر فرمائی ہے۔

"قوتِ متخیلہ و ممیزہ دونوں میں اعلیٰ درجہ کا حصہ فطرتاً آپ کی طبیعت میں ودیعت ہوا ہے چنانچہ تعلیم و تہذیبِ مغربی کا جو روز افزوں اثر ہمارے ہندوستانی نوجوانوں پر ہو رہا ہے۔ اور اس سے جو نتیجے پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ ان کے متعلق آپ اکثر نہایت قابلِ قدر خیالات ظاہر فرماتے رہتے تھے۔ زبان نہایت صاف اور پاکیزہ اور طرزِ بیان دلچسپ و دلکش ہے۔ نغز گوئی اور بذلہ سنجی آپ کی شوخ طبیعت کا ایک ادنیٰ جوہر ہے مگر ساتھ ہی مضمون آفرینی اور نازک خیالی سے خالی نہیں۔ عاشقانہ رنگ کے شعر میں بات پیدا کرنی ان کی جدت پسند طبیعت کا ایک خاص مذاق ہے۔ کلام میں صفائی اور سادگی اپنے اپنے محل و موقع پر دلآویز جھلک دکھاتی ہیں۔ الغرض آپ کا کلام برگزیدہ و پسندیدۂ عام ہے۔ عیوبِ شاعری سے مبرا و نقائص سے سراسر معرا ہے۔ ہر رنگ، ہر بحر، ہر زمین میں کامل دسترس تھی۔ پولیٹیکل اور سوشل معاملات میں آپ کی رائے نہایت متین و مناسب ہوتی ہے۔ خیالات بھی نہایت شستہ ہوتے اور اکثر اچھوتے ہیں . . . . ."

ہماری رائے میں آپ کی شاعری کی جان ظرافت ہے۔ یہ اگر نکال لو۔ تو پھر کچھ نہیں رہتا اگر کچھ رہتا ہے تو بہت ہی کم جس طرح غالب کے خطوط نثر میں اپنی دلکشی اور ظرافت کی وجہ سے ناقابلِ تقلید ہیں۔ اسی طرح اکبر کا وہ کلام جو ان کا خاص جوہر ہے تقلید اور پیروی سے کسی دوسرے کے حصہ میں نہیں آسکتا۔ غالب کی ظرافت طبع خداداد تھی۔ اسی طرح اکبر کی بذلہ سنجی بھی فطری ہے۔ یہ چیزیں اکتساب سے حاصل

نہیں ہوسکتیں۔ غالب کو اپنے فدرتی میلان کے اظہار کے لئے نثر اردو عطا ہوئی۔ اور اکبر کو نظمِ اُردو سے حصہ ملا۔

اِس میں بھی شک نہیں۔ کہ اکبر جہاں کہیں اپنے رنگ سے علیحدہ ہو کر متانت کے ساتھ اظہارِ خیال کرتا ہے۔ تو وہاں اُس کی اُستادی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً

نگاہیں کاملوں پر پڑہی جاتی ہیں زمانہ کی ۔۔۔ کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

ہر لحظہ دیکھتا ہوں زمانہ کی شان اور ۔۔۔ گویا زمین اور ہے اور آسمان اور

بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس ۔۔۔ ایک سر بھی اُسے آمادۂ سودا نہ ملا

رونا تو ہے اسی کا کوئی نہیں کسی کا ۔۔۔ دُنیا ہے اور مطلب مطلب ہے اور اپنا

لیکن یہ رنگ بہت ہی کم ہے۔ بعض بعض غزلوں میں تو اس کا پتہ نہیں۔ اور اکثر غزلوں میں اگر موجود ہے۔ تو ایک آدھ شعر سے زیادہ نہیں۔

بعض واقعاتِ دُنیا کو خوب بیان کیا ہے:۔

ہوتا ہے انبساط غذائے لطیف سے ۔۔۔ غنچے کو دیکھئے کہ ہوا کھا کے کھل گیا

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے ۔۔۔ اُسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا

علومِ دنیوی کے بحر میں غوطے لگانے سے ۔۔۔ زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

طریقِ مغربی کی کیا یہی روشن ضمیری ہے ۔۔۔ خدا کو بھول جانا اور محوِ ماسوا ہونا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم ۔۔۔ رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

بہت مشکل ہے بچنا بادۂ گلگوں سے خلوت میں ۔۔۔ بہت آساں ہے یاروں میں معاذ اللہ کہہ دینا

خیر خواہ آج زمانے میں کہاں ملتے ہیں ۔۔۔ ہے یہی لاکھ غنیمت کوئی بدخواہ نہ ہو

بات میں سے بات پیدا کرنا بھی آپ کی عادت ہے مثلاً:۔

تعجب ہے مجھے اِن شاعروں کے شور و غوغا پر ۔۔۔ کوئی پوچھے کہ تم کو کیا جو کوئی خوبصورت ہے

میرے حواس عشق میں کیا کم ہیں منتشر ۔۔۔ مجنوں کا نام ہو گیا قسمت کی بات ہے

اُمید و بیم کے جھگڑوں سے آگاہی نہیں رکھتے ۔۔۔ سبب یہ ہے کہ ہم کوئی تمنا ہی نہیں رکھتے

صبر اس لئے اچھا ہے کہ آیندہ ہے اُمید ۔۔۔ موت اس لئے بہتر ہے کہ آسان یہی ہے

حضرتِ اکبر بعض اوقات عجیب و غریب قافئے لاتے ہیں۔ اور اُن کو نہایت خوبی سے باندھتے ہیں۔ مثلاً

مسلمانوں کی خوشحالی کی بے شک دُھن ہے سید کو
مگر یہ کام نکلے گا نہ لکچر سے نہ چندوں سے

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تُلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

قرآن چھوڑ بھاگے شیطان کے مقابل
اس معرکہ میں اکثر احباب ہیز نکلے

یہ سوال اُن کا ہے البتہ بہت بامعنی
کہ سمجھ بوجھ کے قرآن بھی کبھی پڑھتے ہو

دین کو سیکھ کے دنیا کے کرشمے دیکھو
مذہبی درس الف بے ہو علی گڑھ سے تو ہو

اکبر نے سترہ برس کی عمر میں شاعری شروع کی تھی۔ اشعار ذیل اُن سے یادگار ہیں۔

چشمِ عاشق سے گریں لختِ دلِ بیتاب و اشک
آپ یوں دیکھیں تماشا جان کر سیماب و اشک

اپنے دامن پہ گرا کر کیوں اسے کرتے خراب
جانتے یکساں اگر ہم گوہرِ نایاب و اشک

جب آپ کی عمر انیس سال کی ہوئی تو آپ نے ۱۸۶۴ء میں ایک غزل کہی جس کا مطلع ہے

بے تکلف بوسۂ زلفِ چلیپا لیجئے
نقدِ دل موجود ہے پھر کیوں نہ سودا لیجئے

بیس برس کی عمر میں آپ کا امتحانِ شاعری لیا گیا۔ اور یہ مصرع دیا گیا:۔

یاد آتی ہے بلبل مجھے تقریر کسی کی

آپ نے بہت اچھا مصرع لگایا۔ جس سے دوسرے مصرع میں بھی جان پڑ گئی۔ فرماتے ہیں:۔

سنتا ہوں چمن میں جو تری زمزمہ سنجی
یاد آتی ہے بلبل مجھے تقریر کسی کی

آپ کا ابتدائی کلام جو کلیاتِ اکبر کے حصہ اول میں صفحہ ۳۹۸ سے صفحہ ۴۰۴ تک درج ہے، بالکل بے لطف اور بے کیف ہے۔ مشکل سے ایک آدھ شعر اچھا نکل آتا ہے۔ اس تمام مجموعہ میں صرف ایک شعر مجھے پسند آیا:۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اس خیال سے کہ اکبر کی ابتدائی مشق ظاہر ہو جائے۔ اس کلام کا کلیات میں شامل کرنا قابلِ اعتراض نہیں۔ ورنہ کلام بہت معمولی ہے۔ اور اس سے ہرگز یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ آگے چل کر اکبر اس قدر عمدہ شاعر ہو جائیں گے۔ یہ خاص بات ہے۔ کہ اکبر کی ظرافت اِن اشعار سے بالکل ظاہر نہیں ہوتی۔ اُس زمانہ میں جیسے اور غزل گو شعر کہا کرتے تھے۔ وہی آپ کا انداز ہے۔ ہم تو پھر وہی بات کہیں گے۔ کہ

اودھ پنچ کے اجرانے اور سرسید کی تحریک نے اکبر کو شاعر بنا دیا۔ اکبر جو کچھ نمایاں ہوئے۔ وہ ۱۸۸۶ء سے ہوئے ہیں۔ آپ کا پہلا کلام اس قابل نہیں کہ اس پر کوئی نگاہ غلط انداز بھی ڈالے۔ یا اس کو پڑھنے کی زحمت گوارا کرے۔ یہ کیا شاعری ہے؟:-

گلے لگائیں کریں پیار تم کو عید کے دن | ادھر تو آؤ مرے گلعذار عید کے دن
شوق نظارہ کبھی دل سے نکلتا ہی نہیں | جی ہمارا بے ترے دیکھے بہلتا ہی نہیں

۱۹۰۵ء تک جبکہ نواب مرزا داغ کا انتقال ہوا۔ اکبر کے کلام کو وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جو اس کا حصہ تھا۔ وجہ یہ کہ داغ نے دلوں پر ایسا احاطہ کر لیا تھا۔ کہ داغ کی غزل کے سامنے کوئی اور رنگ نہیں جمتا تھا۔ اس وقت بھی جاننے والے ضرور اکبر کی شاعری کی قدر کرتے تھے لیکن اکبر ۱۹۰۵ء کے بعد چمکے اور ایسے چمکے کہ آج تک چمک رہے ہیں اور ہمارا خیال ہے۔ کہ آپ کی شاعری کا ستارہ جب تک اردو زبان قائم ہے۔ برابر چمکتا رہے گا۔

اکبر کی شاعری غزل تک محدود نہیں۔ ہر بحر اور ہر صنف میں اکبر نے طبع آزمائی کی ہے۔ ہر قسم کے خیالات خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی یا مذہبی اپنی حسب معمول ظرافت میں خوب بیان کئے ہیں مقامی رنگ میں تمام کلیات ڈوبا ہوا ہے۔ اپنے زمانہ کے خیالات کا عکس آپ کے کلام میں موجود ہے روانی اور شگفتگی بھی آپ کے کلام کا خاص جوہر ہے لیکن یہ کہنا کہ آپ کے کلام میں کوئی نقص نہیں بالکل غلط ہے۔ اکثر جگہ ظرافت حدود سے متجاوز ہو کر رکاکت بن گئی ہے۔ مثلاً:-

ٹٹو پہ جس طرح سے ہو نازی کا ساز بوجھ | یوں بابو الٰہی ہند پہ ہے اب نماز بوجھ
تخلیہ بھی ہے ہوا سرد ہے اور رات بھی ہے | پھر بھی انکار مری جان یہ کوئی بات بھی ہے
اپنی بہ احتیاط کہ بوسے پہ اکتفا | اس پہ بھی یہ عتاب کہ تو بدمعاش ہے

اکبر نے بعض ایسے الفاظ جو ہماری زبانوں پر جاری ہیں لیکن تحریر میں نہیں آتے۔ داخل شعر کر دیئے ہیں۔ مثلاً خفا ہونا سب لکھتے آئے ہیں۔ مگر جھنجھلانا کوئی نہیں لکھتا۔ البتہ بولتے سب ہیں۔ اکبر فرماتے ہیں:-

خیر چپ رہئے مزا ہی نہ ملا بوسے کا
یاں بھی بے لطف ہوا آپ کے جھنجھلانے سے

یا مستان بجائے مست:-

بڑھا کہ غیب کی محفل میں مجھ کو اس نے فرمایا
سنو اکبر کی غزلیں دیکھ یہ مستان حاضر ہے

ٹیم ٹام :- پھر بھی اُٹھائی خموشی سے چل دیئے اکبر
سفر میں رکھتے نہیں کام ٹیم ٹام سے ہم

پچول :- مذہب ہی سے حفاظت قومی ہے اے عزیز
نادان ہے کوا رہ ہٹائے جو پچول سے

بعض بعض جگہ اکبر نے متروک الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً تلک بجائے تک، نہیں رہنے کا بجائے نہیں رہے گا۔ یا یہ کہ دونوں لفظوں کو ساتھ استعمال کیا ہے۔ مثلاً

لیکن خدا کے واسطے خلق خدا سے بل
سمجھے گا اس کو وہ کہ جو اہل شعور ہے

یہاں صرف جو کافی تھا۔ بعض جگہ ایسے الفاظ کی جمع استعمال کی ہے۔ جو صرف واحد ہی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً فہم کی جگہ فہمیں۔ یہ کچھ بھونڈا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔

شارح معنی حسن بُت دل خواہ نہ ہو
فہمیں قاصر نہ ہوں خلقت کہیں گمراہ نہ ہو

اُس زمانہ کے شاعروں نے لفظ بُت کو تنہا استعمال کرنا پسند نہیں کیا۔ ہمیشہ کسی صفت کے ساتھ اُس کو باندھا ہے۔ مثلاً بُت کافر یا بُت طناز وغیرہ۔ لیکن اکبر مجرد بُت استعمال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

سچ بات کا انکار نہیں کیونکر کہدیں لے بُت بے شک مجھے آتی ہے کبھی یادِ خدا بھی

ناکامیابی غلط ہے۔ ناکامی ہونا چاہئے۔ اکبر کہتے ہیں :-

مری ناکامیابی کی کوئی حد ہو نہیں سکتی صداقت چل نہیں سکتی خوشامد ہو نہیں سکتی

داغ نے اپنے زمانہ میں یہاں، وہاں کی بجائے یاں، واں لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اور دیگر شعرا بھی اس کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن اکبر کے یہاں اس قسم کی احتیاط نہیں پائی جاتی۔ فرماتے ہیں :-

ہم صنم خانہ جہاں کرتے تھے اپنا قائم پھر کھڑے ہوتے تھے واں حور کے شیدائی بھی

کبھی کبھی آپ پھبتی کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مثلاً

نزاکت پر ستم ہے اُن کا جوڑا اس قدر بھاری دوپٹہ ہے مصیبت پائنچہ مشکل سے اُٹھتا ہے

بعض اہم مسائل پر آپ نے متانت کے ساتھ بھی رائے زنی کی ہے جس کی دلآویزی میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً :-

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں — ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سِرا ملتا نہیں

آپ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کی تعریف میں بھی بُخل سے کام نہیں لیا۔ فرماتے ہیں:-

دعویٔ علم و خرد سے جوش تھا اکبر کو رات — ہو گیا ساکت مگر جب ذکرِ اقبال آ گیا

یا:- اڈیٹر بول اٹھے دیکھ کر شبلی کے فوٹو کو — اسی کے دم سے اب زندہ ہے مشرق کا کتب خانہ

ذیل میں آپ کے کلیات سے بہتر اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ آپ کا کلام ایسا اچھا ہے کہ اس مقررہ تعداد سے ہم نے تجاوز کرنا چاہا۔ لیکن اصولِ مساوات نے ہم کو روک دیا۔ آپ نہایت پُرگو تھے اور اندازہ یہ ہے کہ آپ نے کم از کم چودہ ہزار اشعار کہے ہیں۔ اور اس حساب سے آپ میر تقی میر کے برابر ہیں۔

"برقِ کلیسا"

بات اُس مِس سے کلیسا میں ہوئیں دو چار — ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ اُبھار

زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مُرید — قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں — گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں

گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے — دلکش آواز کہ سن کر جسے بلبل چہکے

دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں — سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتشِ حسن سے تقویٰ کو جلانے والی — بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی

پہلوئے حسنِ بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق — ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا لوٹ گیا، دل میں سکت ہی نہ رہی — سر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا — یا حفیظ کا کیسا ورد مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار — دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے — ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی — ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے — بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر — حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں — آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائے کوئی میدان میں تو اترا جائیں — پائیں سامانِ اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح

شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہے براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی ہی نہیں خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہرِ تیغِ مجاہد تری ابرو پہ نثار
نورِ ایماں کا ترے آئینۂ رو پہ نثار

اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک
دو دِلے ہوئے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موجِ کوثر کی کہاں اب ہے، مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ "تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو"

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد
اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دلخراش

کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسلِ قوم
کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصال و بدمعاش

دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ
ہو کے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش

ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قومِ انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش

جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو
سوپ و کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش

لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز و طریق
ہال میں ناچو کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش

بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش

جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہو گیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش

سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش و جادو نظر
یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش

اس کی چتون سحر انگیں اس کی باتیں دلربا
چال اس کی فتنہ خیز اس کی نگاہیں برق پاش

وہ فروغِ آتشِ رخ جس کے آگے آفتاب
اس طرح جیسے کہ پیشِ شمع پروانے کی لاش

جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برقِ بلا
دستِ سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دور باش

دونوں جانب تھا رگوں میں جوشِ خونِ فتنہ زا
دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

بارہا آتا ہے اکبرؔ میرے دل میں یہ خیال
حضرتِ سید سے جاکر عرض کرتا کوئی کاش

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبرؔ زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

لامذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم
ہرگز گذر سکیں گے نہ اِن منزلوں سے آپ

کعبے سے بُت نکال دیے تھے رسول نے
اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں
اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں

ممکن نہیں شیخ امرؤالقیس بنیں"
پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

غزلیات

عنایت مجھ کو ہے بزم میں نا آشنا ہوتا
غضب ہیں یہ ادائیں دم ہی بھر میں کیا سے کیا ہوتا

قیس کا ذکر مری شانِ جنوں کے آگے
اگلے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا

غنچۂ دل کو نسیمِ عشق نے وا کر دیا
میں مریضِ ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا

ادھر وہی طبع کی نزاکت اُدھر زمانہ کی آنکھ بدلی
بڑی مصیبت شریف کو ہے امیر ہو کر غریب ہونا

بڑھنے تو ذرا دو اثرِ جذبۂ دل کو
قائم نہیں رہنے کا یہ انکار تمہارا

اک عکسِ ناتمام پہ عالم کو وجد ہے
کیا پوچھنا ہے آپ کے حسن و جمال کا

تعلیمِ مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے
سب مِل گیا اُسے جسے اللہ مِل گیا

وہ مرادیں جو ملیں چار تمنائیں کیں
ہم نے خود قلب میں آرام کو رہنے نہ دیا

ہم مصلحتِ وقت کے منکر نہیں اکبرؔ
لیکن یہ سمجھ لو کہ وفا بھی ہے کوئی چیز

مری بینا بیاں بھی جزو ہیں اک میری ہستی کی
یہ ظاہر ہے کہ موجیں خارج از دریا نہیں ہوتیں

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم اُن کے ہاتھ میں تعلیم اُن کے ہاتھ میں

دلیلیں فلسفہ کو نورِ باطن کر نہیں سکتیں / کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں

دل بھی حاضر سرِ تسلیم بھی خم کو موجود / کوئی مرکز ہو کوئی قبلۂ حاجات تو ہو

ممکن نہیں کہ عشق ہو اور دل حزیں نہ ہو / میرا ہی حال دیکھ لے جس کو یقیں نہ ہو

حالت تو یہ پہنچی ہے کہ دیکھی نہیں جاتی / اور دل سے محبت ہے کہ اب بھی نہیں جاتی

عشق کو دل میں دے جگہ اکبر / علم سے شاعری نہیں آتی

تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر / بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

بزمِ عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں / کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

میں نے کہا اکبر میں کوئی رنگ نہیں ہے / کہنے لگے شعر اُسکے جو سُن لو تو پھڑک جاؤ

حاصلِ عمر سوا موت کے جب کچھ بھی نہیں / چار دن کے لئے یہ عیش و طرب کچھ بھی نہیں

وفاتِ سرسید مرحوم

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا / نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

کہے جو چاہے کوئی، میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

شاد

علی محمد نام اور شاد تخلص تھا۔ سادات عظام عظیم آباد سے ہیں۔ ابتداء میں شاہ الفت حسین فریاد کے شاگرد رہے۔ جن کی ایک سوانح عمری بھی آپ نے تصنیف فرمائی ہے۔ استاد کا بیحد ادب کرتے تھے۔ فقیروں سے ملنے کا بھی شوق تھا۔ اگرچہ آپ شیعہ تھے۔ لیکن فقراء کی خدمت آپ کا شعار تھا۔ اور تصوف سے بہرۂ وافی رکھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

بھلا منظور ہو اپنا تو خدمت کر فقیروں کی	قضا کو روک دیتی ہے دعا روشن ضمیروں کی
مرے کلام کا جن کو مزا نہیں اے شاد	یقین مان کہ دل ہی نہیں گداز اُن کے

"محمد شاہ کے بخشی نواب خانِ دوراں خاں جو نادر شاہ سے لڑائی میں بمقام کرنال مارے گئے آپ کے اجداد میں تھے۔ نادر شاہ گردی میں آپ کے بزرگ دہلی چھوڑ کر پٹنہ جا بسے۔ رؤسائے پٹنہ میں ہر طرح موقر، ممتاز اور بارسوخ تھے۔ عرصۂ دراز تک میونسپل کمشنر اور آنریری مجسٹریٹ رہے۔ اور عوام و خواص کو اپنے طرزِ عمل سے خوش رکھا۔ ملکہ وکٹوریہ اور بادشاہ ایڈورڈ کی ہر تقریب اور جشن میں قصاید تہنیت لکھ کر پیش کئے۔ ۱۲۹۲ھ میں ایک اخبار پٹنہ سے جاری کیا اور چار برس تک اس کے آنریری اڈیٹر رہے۔ ایک مدرسہ بھی اسی زمانہ میں جاری کیا تھا۔ تصنیف کا ہمیشہ سے شوق رہا۔ چنانچہ چھوٹی بڑی ۵۴ کتابیں اور رسالے اُن کی زندگی میں چھپ گئے تھے۔ زود نویسی اور شعر گوئی کا یہ عالم تھا کہ پوری ایک الماری نظم و نثر کے مسودوں سے بھری ہوئی تھی۔ مراثی اور قصاید بھی لاتعداد رقم کئے ہیں۔ جس طرح آپ علوم و فنونِ مشرقی کے زبردست ماہر ہیں علوم جدیدہ فلسفہ، طبیعیات اور الٰہیات وغیرہ کے دقیق مضامین اور مسائل بھی بلا تکلف سلیس اور بامحاورہ زبان میں جابجا نظم فرماتے ہیں۔ مرثیہ گوئی میں روایات کاذبہ سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور واقعات کی حقیقت اور اصلیت قائم رکھتے ہیں۔ میر انیس مرحوم نے جب لکھنؤ میں آپ کے مرثیے سنے تو بہت تعریف فرمائی اور اس امر پر تعجب کیا کہ باوجود مبالغہ اور کاذبی

روایات سے احتراز کرنے کے کلام میں پورا درد اور اثر نمایاں ہے۔ اور مرثیہ کی علت یعنی رقت پیدا کرنے کی صفت معدوم نہیں ہوئی۔ قطعات تاریخ کہنے میں بھی آپ کو خاص ملکہ تھا۔ پُرگوئی کا یہ عالم ہے کہ قطعات کی تعداد کا اندازہ دو ہزار کے قریب کیا جاتا ہے۔" (از خمخانۂ جاوید)

کلام پر تبصرہ

ہم نے جن شعراء کو صفِ اوّل میں جگہ دی ہے۔ اُن کے کلام سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ کہ اُن میں ایک خصوصیت ہے۔ جو صفِ دوم کے بیٹھنے والوں میں نہیں پائی جاتی۔ اُسی عہد کے درجۂ اوّل اور درجۂ دوم کے شعراء کے کلام کا موازنہ کیجئے۔ تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ جو پختگی اور شستگی طبقۂ اوّل کے شعراء میں ہے طبقۂ دوم کے شعراء میں نسبتاً کم ہے۔ خواہ ہم اُن کے کلام کو زمانہ حال کے مطابق نہ پائیں۔ اور اُن کے خیالات اور اندازِ بیان سے ہم کو اتفاق نہ ہو۔ لیکن یہ خاص صفت اُن میں ضرور موجود ہوگی۔ شادؔ عصرِ حاضر سے کم تعلق رکھتے ہیں۔ بجز اس کے کہ ۱۹۲۷ء میں انتقال فرمایا۔ درحقیقت آپ داغؔ و حالیؔ کے ہمعصر ہیں۔ اُن کے زمانہ میں قدیم شاعری کا دَور دَورہ تھا۔ اور آپ نے جو کچھ لکھا۔ اسی انداز میں لکھا ہے۔ لیکن اُن کا کلام صاف صاف ہمیں بتلا رہا ہے کہ وہ دوسرے درجہ کی مخلوق نہیں ہیں بلکہ وہ صفِ اوّل میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔

آپ کا کلام مختلف رسائل میں میری نظر سے گزرتا رہا ہے۔ اور میں آپ کے کلام میں ایک امتیازی حیثیت دیکھ کر ہمیشہ متاثر ہوتا رہا ہوں۔ اس وقت میرے پیشِ نظر آپ کے دیوان کا وہ انتخاب ہے۔ جو حسرت موہانی نے شائع کیا ہے۔ اگر آپ کے وہ عمدہ اشعار جو ممکن ہے۔ حسرت کے انتخاب میں رہ گئے ہوں میرے انتخاب میں نہ شامل ہو سکیں۔ تو مجھے اہلِ نظر معاف فرمائیں۔ کہ ان حالات میں جو کچھ مجھ سے ہو سکا۔ اُن کی تفننِ طبع کے لئے پیش کر دیا۔

بعض اصحاب آپ کو میر کا مقلد بتلاتے ہیں۔ اور بعض میرِ ثانی کہتے ہیں۔ آپ کا کلام دیکھ کر ان صاحبان کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ میر کی ہر طرح آپ کے یہاں لمبی لمبی بحریں بہت ہیں۔ اور اُن میں اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔ کلام میں صفائی اور سادگی جو میر کا حصہ ہے۔ آپ کے یہاں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ دل گدازی بھی ہے۔ جو میر کی خاص صفت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جہاں میں پھیلے ہیں جتنے مذہب ہر اک میں آخر کلام نکلا
نہ کشف سے مدعا بر آیا نہ کچھ دلیلوں سے کام نکلا

امانتِ غم کے سونپنے کو قضا نے جب آ کے فال کھولی
جو سب سے عاجز تھے اُس گھڑی میں انہیں غریبوں کا نام نکلا

جلو میں پیرِ مغاں، رہبر بغل میں ساقی سا فیض گستر   پڑھے تکلف سے آیا ساغر، بڑے تجمل سے جام نکلا

ابھی تو محشر کا حال سن کر دلوں کو کچھ کچھ تو ہے سہارا   کہاں غریبوں کا پھر ٹھکانا جو وہ بھی شورِ عوام نکلا

اٹھے کبھی مست ہو کے میکش جھکے کبھی جا کے پائے خم پہ   جو آئے مسجد سے میکدہ میں وہی سجود و قیام نکلا

بڑا تعجب تو شاد پر ہے وہ شاد سب جن کو جانتے ہیں   اسی کو سمجھے تھے لاابالی وہ شیخ بیت الحرام نکلا

صفائی اور سادگی دیکھ چکے - اب دل گدازی کے بھی اشعار ملاحظہ ہوں :-

ہم باغ میں ناحق آئے تھے بلبل کی حکایت کیا کہئے   منقار کو رکھ کر کلیوں پہ کچھ اپنی زباں میں کہہ جانا

تکلیف کسی کو گر پہنچی تو اس میں تکلف کیسا نکلا   حیران رکھا گر قاتل کو تو دیدۂ حیراں کچھ نہ کیا

کچھ ضبط نہ اپنے کام آیا بات آ گئی آخر کہنے میں   سب ہم نے کیا جو ہم سے ہوا پر تم نے مری جاں کچھ نہ کیا

ان کو اسی سے شوق ہے ظلم کریں جفا کریں   یہاں ہے خموشیوں سے کام یہ نہ کریں تو کیا کریں

ہوں گی زیادہ اس سے بھی عشق میں جگ ہنسائیاں   دل نے تو آپ مول لیں اپنے لئے برائیاں

شاد میر کا صرف مقلد نہیں ہے - بلکہ اس نے اپنی راہ علٰحدہ بھی نکالی ہے - اس کا اندازِ بیان یا حسنِ بیان سب سے نرالا ہے - اور اسی سے اس کی استادی کا قائل ہونا پڑتا ہے - ارشاد ہوتا ہے

لقب کیونکر نہ ہو طبعِ رسا، معجز رقم میرا   عصا موسیٰ نبی کا تیغ حیدر کی، قلم میرا

لیے یا جائے دونوں حالتیں یکساں ہیں کیا پروا   نہ روح اپنی نہ صبر اپنا نہ دل میرا نہ غم میرا

جہاں روشن ہے جس سے داغ سینہ میں وہ لایا ہوں   یہ حسرت کیوں نہ منہ تکتا کرے شمعِ حرم میرا

مجھی سے زندگانی فنِ شعر و شاعری کی ہے   غنیمت اس عظیم آباد میں ہے شاد دم میرا

دوسری غزل پڑھئے :-

کسی طرح سے تو آئے انہیں خیال اپنا   ضرور چاہئے اُن سے بیانِ حال اپنا

نگاہِ ناز نے تفصیل تک نہ کرنے دی   ہزار حیف کہ مجمل رہا سوال اپنا

امیدِ وصل نے کس کس کے گھر کئے نہ تباہ   مگر ہمیں بہ خدا کچھ نہیں ملال اپنا

کوئی تو روئے گا اے شاد اپنی میت پہ   کوئی تو یاد کرے گا کبھی کمال اپنا

جو اپنے آپ میں میرا دلِ حزیں ہوتا   تو کچھ مقامِ تردد نہ تھا کہیں ہوتا

بہت سے شک تھے دیا ہیں بتائے گئے   کہیں کا میں نہ رہا تھا اگر یقیں ہوتا

بعض فارسی تراکیب کا برمحل استعمال قابلِ تعریف ہے :-

دیر آشنا   زمانہ چاہئے دل کو کہ حاصل ہو نیاز اس کا   بہت دیر آشنا ہے اے جبینِ شوق ناز اس کا

گوش بر آواز :-

جاؤ بجا شبِ غم میں کئے ناحق نالے — یہ نہ سمجھے کہ کوئی گوش بر آواز بھی تھا

پیشگانِ با وفا — لیکن ایک کی "ندا رہے جو نقص نہیں خوبی ہے

بیا صنعت پیش گانِ باوفا کی شان پیدا کر — جو راحت چاہتا ہے دل میں اطمینان پیدا کر

آپ واقعاتِ دنیا کو بھی خوب بیان کر جاتے ہیں :-

لباسِ اہلِ تقویٰ پر نہیں کچھ منحصر واعظ — کہیں کیا ہم نے کس کس بھیس میں دیکھا ہے دنیا کو

زمانہ چاہتا ہے وزن ہر شئے کا برابر ہو — گھٹا دیتا ہے اعلیٰ کو بڑھا دیتا ہے ادنیٰ کو

یہ بزمِ مے ہے یہاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

بدلی وہ وضع، طور سے بے طور ہو گئے — تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے

وقت خدا نخواستہ پڑ جو گیا تو سب خلاف — شاد کہاں کسی کو یاد اگلی تری بھلائیاں

بعض بعض اشعار میں محاورات بھی خوب استعمال کئے ہیں :-

اب بھی جو سال بھر یہ چمن میں نہ آئے گی — عقبیٰ میں کیا بہار مجھے بخشوائے گی

فصلِ خزاں ہے بد بلا اس سے خدا پناہ دے — منہ پہ صبا کے بھی گلو چھٹنے لگیں ہوائیاں

سینہ ہے غم سے داغ داغ، پہلو و دل فگار ہیں — میری تو واصل کیا بھلا مجھ سے وہاں ہزار ہیں

اک غم فقط نہیں ہے دلِ ناشکیب میں — ایسے پڑے ہوئے ہیں بہت اپنی جیب میں

تعلّی کے اشعار بھی کچھ کم نہیں۔ میں یہاں صرف تین شعر نقل کرتا ہوں :-

رہے گا ورد، زباں آوروں کو نام ترا — "سند ہوا، فصحا کے لئے کلام ترا"

مشقت کے سوا کیا مل گیا مشقِ سخن کر کے — عدو چاروں طرف پیدا کئے ہم نے یہ فن کر کے

زندگی تک فقط اے شاد عداوت کر لے — میرے مر جاتے پہ مداح زمانہ ہو گا

داغ کا ہمعصر اور متروکات کا استعمال جمع بین النقیضین ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ آپ کے یہاں نظموں میں نہیں غزلوں میں بھی متروکات کا استعمال پایا جاتا ہے

وہ تیغ ٹیکے کہتے ہیں "دیکھیں تو حق پر کون ہے" — ہم اک طرف، شاد اک طرف، سارا زمانہ اک طرف

ٹیکے کی بجائے ٹیک کر ہونا چاہئے۔

پڑے کے لحد میں ہاں دلا چین کر اب تو حشر تک — اب کے جفا کی سختیاں تو نے بہت اٹھائیاں

آجکل کی زبان کے مطابق دلا کی جگہ اے دل اور اٹھائیاں کی جگہ اٹھائی ہیں ہونا چاہئے۔

ہزار کھینچ کر جُدا ہو ہم سے ہزار دُوری ہو میرے تیرے　　جو اک کشش حسن و عشق میں ہے مرے ترے درمیاں رہیگی

یہاں پہ میرے تیرے کی بجائے مجھ میں اور تجھ میں ہونا چاہیئے۔

حسب ذیل شعر میں بہاریں کی جگہ بہار کو ہونا چاہیئے۔

کہاں گلوں کے وہ تختے وہ لالہ زار کہاں　　بہاریں تو نظر لگ گئی بہار کہاں

عموماً آپ کا کلام صاف ستھرا ہے مضمون آفرینی کم ہے۔ باتوں ہی باتوں میں مضمون پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ نئی بات کہہ گئے ہیں۔ لیکن حقیقتاً وہی پرانی باتیں ہیں۔ ان کو صرف نئے لباس میں جلوہ گر کیا ہے جس زمانہ کے آپ شاعر ہیں۔ اُس وقت اُردو شاعری کی صنفِ غزل میں درحقیقت کچھ کہنے کو باقی ہی نہ رہا تھا۔ یہ آپ ہی جیسے اربابِ سخن کا کمال ہے۔ کہ پھر بھی کچھ نہ کچھ کہہ لیا۔ اور وہ مرغوبِ طبع ہو کر مقبول ہو گیا۔

ذیل میں ایک مسلسل غزل درج کی جاتی ہے۔ جس میں جنابِ شاد نے اُردو شاعری کے اصطلاحی الفاظ کو بتلایا ہے۔ کہ ان سے کیا مراد لی جاتی ہے۔ جیسا کہ مرزا غالب نے کہا ہے:۔

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

حضرت شاد فرماتے ہیں:۔

صورتِ یار سے مقصود ہے قدرت اُس کی　　ذہن تنگ ہے کیسا چیز حقیقت اُس کی

مے سے عرفاں کہیں مقصود کہیں عشق مراد　　مطلب اِس بزم سے بزمِ مے وحدت اُس کی

مدعا موت سے اکثر ہے وصالِ محبوب　　زندگی سے کہیں مطلوب ہے فرقت اُس کی

جس کو کہتے ہیں جنوں نام ہے اُس کا عرفاں　　عقل کے فہم میں کب آئے گی حالت اُس کی

کہیں مستوں سے ہے مطلب عرفا و صُلحا　　وہی واقف ہیں کہ کیسی ہے عذوبت اُس کی

لفظ کچھ اور ہے مطلوب یہاں ہے کچھ اور　　دیکھنی چاہیئے نقاد کو حالت اُس کی

استعارے تو ہیں پر بے ادبی کا ڈر ہے　　کیونکہ اک طرح کی یہ بھی ہے عبادت اُس کی

شاد اشعار میں جس شخص نے رکھی یہ مراد　　کاش لگ جائے ٹھکانے کہیں محنت اُس کی

غزلوں کے سوا معلوم نہیں، دیگر اصنافِ سخن میں آپ نے کیا کیا گلکاریاں فرمائی ہیں۔ چند رباعیات جو ہم تک پہنچیں ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

بعثت بعد الموت :-

خوابیدۂ خلوتِ عدم نکلیں گے
ذی رُوح ہیں جس قدر بہم نکلیں گے
برسات میں جس طرح نکل آئیں حشرات
محشر میں زمیں سے یوں ہی ہم نکلیں گے

مسئلہ جبر و اختیار :-

یہ سچ کہ ہجوم کار میں رکھا ہے
یہ جھوٹ کہ اضطرار میں رکھا ہے
تو غور کرے تو چند چیزوں کے سوا
سب کچھ ترے اختیار میں رکھا ہے

موت سے ڈرنا نہیں چاہئے :-

کیا خوف ہے دُنیا سے گزر جانے میں
کیوں ڈرتے ہو شاد اپنے گھر جانے میں
کچھ نہیں ہے زندگی میں راحت کیسی
راحت تو ہے میری جان مر جانے میں

ذیل میں آپ کے منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

- وہی آخر ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا مشیت میں
گلہ ہے شاد قسمت کا نہ تدبیروں کا ہے شکوا
- کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی
خم آئیگا صراحی آئیگی تب جام آئے گا
- گلی میں یار کی اے شاد سب مشتاق بیٹھے ہیں
خدا جانے وہاں سے حکم کس کے نام آئے گا
- بسی ہوئی ہے اُمیدوں کی اک نئی دنیا
اُسی کی شان ہے اتنے سے دل کی وسعت کیا
- کہا یہ رُوح نے تن سے وداع ہوتے وقت
مرا سلام ہے اب میں تری نہ تو میرا
- زہر کیا چیز ہے اک تلخ دوا ہے ناصح
میں نے جس بات کو اک ٹھان لیا ٹھان لیا
کچھ شکایت نہیں یہ بھی مری قسمت ساقی
تو بھی پیمانۂ خالی کو لبالب سمجھا
کوئی صہباکشی میں طاق کوئی مے پرستی میں
خراباتِ مغاں میں جمع ہے اُستاد ہر فن کا
خزاں کے ہاتھ سے آسودگی دل کو نہیں ملتی
ہمیشہ لالہ گوں رہتا ہے گوشہ اپنے دامن کا
کوئی سبب نہیں دشمن ہو کیوں فلک تیرا
اِس امرِ خاص میں اے دل بجا ہے شک تیرا
دام ہاتھوں میں لئے تاک میں صیاد آیا
پھول کھلنے بھی نہ پائے تھے کہ میں یاد آیا
کس سے کس سے نہیں شرمندہ ہوئے دیدۂ شوق
تو جو ہنگامۂ محشر میں مجھے یاد آیا
- شاد ایسے میں نہ توڑا تھا بھلے کو میں نے
پھول پہ ہاتھ بڑھایا تھا کہ دل یاد آیا
- دل اُس گلی میں جاکے نہ یوں بے سبب رہا
ذرے کی کیا بساط کہیں جاکے دب گیا
گستاخ تھا پہنچ گیا پروانہ شمع تک
میں بد نصیب تھا مجھے مانع ادب رہا

طوفاں کا ظلم ایک طرف، موج اک طرف
نہ اضطراب ہے باقی نہ بے قراری ہے
ہر طرف ہے، وہی ہر شے میں ہے جلوہ اُس کا
چشمِ بینا میں کہاں چھپتی ہے دو دن کی بہار
اپنی ناکامی کا کیا ذکر مگر حشر کے دن
ہو خفا اس سے تو جائے کدھر اُس کا عاشق
میں تو اک حسرت واندوہ کا پتلا ٹھہرا
خوشا وہ وقت کہ عالم میں تو ہی تو ہوگا
کبھی تو آپ کے حسرت زدہ سمجھ لیں گے
آسماں نے بھی اسی چال کو مانا ہوگا
نہ چھوٹے جستجو کے بار، خضرِ شوق کہہ دو
دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
زیست ہے نام تیری فرقت کا
حالِ دل سب بیان کروں کیونکر
کہتے ہیں اس جہاں کے صورت گر
جب اہلِ ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا
سینے سے چلا جب نالۂ دل تب تارِ نفس ہو ٹوٹ گیا
تیرے عاشقوں کی بھلا کہیں یہ اُمنگ ہے تیرے عشق میں
یہی آرزو ہے ملیں اگر مجھے شادِ مجلسِ وعظ میں
سراپا یاس بنتا جا سراپا درد ہوتا جا
غفلت میں ہوئی اوقات بسر اے عمرِ گریزاں کچھ نہ کیا
ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے اکثر قصۂ خواب
خود غرض دنیا کی حالت قابلِ عبرت تھی شاد
زباں پہ مرتے ہوئے اُن کا نام آ ہی گیا
کہا تھا میں نے کہ واعظ بتوں کا ذکر نہ چھیڑ

جس وقت تک حباب رہا جاں بلب رہا
ہمیں تو موت نے پہنچا دیا پیام ترا
ترکِ نعمت جو کروں، ترک ہے گویا اُس کا
گُل جو کھلتے ہیں تو ہنس دیتا ہے شیدا اُس کا
کیا قیامت ہے کہ منہ دیکھے گی دنیا اُس کا
باغ اُس کا ہے جو اے شاد تو صحرا اُس کا
بھول جاتا تجھے پر تو تو نہ بھولا ہوتا
جدھر کو آنکھ اٹھاؤ مقام ہو ہوگا
کبھی تو موقعِ اظہارِ آرزو ہوگا
چلتے چلتے یہ ہے تاکید کہ آنا ہوگا
کسی دن خود لگا لے گی پتہ عمرِ درازِ اُس کا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا
کچھ ٹھکانا ہے اِس مصیبت کا
حشر کُل ایک دن ہے مہلت کا
پھول چڑھا ہے تیری صورت کا
ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا
اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل شب کو وہ قیدی چھوٹ گیا
کہ وہ کام کرتے ہیں شیب میں کہ جو مقتضائے شباب کا
کہیں آج ان کے کان میں بھنک پڑے کہ یہ حال کیا ہے جناب کا
جہاں تک بن پڑے اے جسمِ لاغر زرد ہوتا جا
جانے کا وہاں کے شوق ہی تھا جانے کا ساماں کچھ نہ کیا
اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا
لطف جینے کا نہ اپنے میں نہ بیگانے میں تھا
وہ اک خلوص جو تھا دل میں کام آ ہی گیا
خدا کے باب میں آخر کلام آ ہی گیا

چمن میں گل بھی ہیں غنچے بھی بلبلیں بھی مگر
بہارِ عمر تھی جن سے وہ غم گسار کہاں

اپنی ہستی کو غم و درد و مصیبت سمجھو
موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو

تکیہ وعدہ پہ ہے سب چپکے پڑے ہیں تہِ خاک
حشر کا دن جو نہ آیا تو قیامت سمجھو

جب میں کہتا ہوں گوارا مری ذلت نہ کرو
سر جھکا لیتے ہیں کہتے ہیں محبت نہ کرو

کسی پتے کے لب پر بھی اگر نامِ خزاں آیا
نکالا باغباں نے اُس کو رسوائے چمن کر کے

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
اُس پہ کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

نہ پوچھو شاد ویرانی کو دل کی کیا بتاؤں میں
تمنا جا چکی حسرت غریب اِس میں اکیلی ہے

طبقۂ دوم

ظہیر

ظہیر الدین نام اور ظہیر تخلّص ہے۔ سید جلال الدین حیدر آپ کے والد ماجد تھے۔ جو دِلّی کے رہنے والے اور ابوظفر بہادر شاہ کے خوشنویسی میں اُستاد تھے۔ دربار شاہی سے اُن کو اصلاح الدولہ مرصع رقم خان بہادر کا خطاب عطا ہوا تھا۔

ظہیر کی عمر ابھی بارہ سال کی تھی۔ اور آپ نے صرف چند فارسی درسی کتابیں اور عربی کے مختصرات پڑھے تھے۔ کہ قور بیگی کے عہدہ پر سرفراز ہوگئے۔ چند روز کے بعد راقم الدولہ کا خطاب پایا۔ تنخواہ پچاس روپیہ ماہوار بدستور قائم رہی۔

شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی۔ اتفاق سے آپ کے مکان ہی کے قریب قطب الدین مشیر شاگرد نصیر نے اپنے مکان پر مشاعرہ قائم کیا۔ یہ وہاں آنے جانے لگے۔ اور رفتہ رفتہ ذوق کے شاگرد ہوگئے۔ اُس وقت آپ کا سن چودہ برس کا تھا۔

ہنگامۂ انقلاب ۱۸۵۷ء میں دِلّی سے نکلے۔ جھجر، سونی پت اور نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی پہنچے۔ وہاں کچھ دنوں قیام کیا۔ اور بعد ازاں رامپور چلے گئے۔ چار برس وہاں رہے۔ اس کے بعد دہلی واپس آئے۔ اور محکمۂ چُنگی میں ملازمت اختیار کی۔

کچھ دنوں بعد اخبار جلوۂ طور (بلند شہر) کی اڈیٹری مل گئی۔ مہاراجہ شیودان سنگھ والی الور کی نظر سے یہ اخبار گزرتا تھا۔ وہ نہایت قدردان اور ہنرپرور تھے۔ انہوں نے ظہیر کو بلا بھیجا۔ چنانچہ آپ وہاں تشریف لے گئے۔ اور چار برس تک رہے۔ تنخواہ کے علاوہ تقریبوں پر قصاید کا صلہ بھی ملتا تھا جس کی وجہ سے یہ بہت اچھی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن مہاراجہ کے اختیارات سلب ہوجانے کی وجہ سے آپ الور سے چلے آئے۔ اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور میں

آپ کو محکمۂ پولیس میں جگہ مل گئی۔ اُنیس برس تک جے پور میں رہے۔ اِس کے بعد نواب احمد علی خاں رونقؔ خلف نواب امیر خاں مرحوم نے اِن کو ٹونک بُلا بھیجا۔ اور اِن کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ پندرہ سولہ برس تک آپ ٹونک میں رہے

آخر عمر میں حیدرآباد جانے کا شوق ہوا۔ چنانچہ ٹونک سے رخصت لے کر حیدرآباد گئے۔ وہاں آٹھ مہینے تک باریابی کی تمنا میں پڑے رہے۔ جس کا نتیجہ ہوا۔ کہ ٹونک سے بھی جو کچھ اِن کو ملتا تھا۔ بند ہو گیا۔ آخر کار باریابی کی نوبت آئی اور ہر تقریب پر قصیدے بھی پیش ہوئے۔ مگر تنخواہ مقرر نہ ہوئی تھی۔ کہ پیامِ اجل آپہنچا۔ اور موت کے ساتھ تمام آرزوؤں کا خاتمہ ہو گیا۔

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں :-

ایک دیوان جس کا نام گلستانِ سخن ہے۔ چھپ گیا ہے۔ اور ہمارے پیشِ نظر ہے۔

دیوانِ دوم و سوم کا حقِ تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریمی بمبئی نے خرید لیا تھا معلوم نہیں چھپا یا نہیں۔

دیوانِ چہارم جس میں بقول حسرت موہانی تین سو غزلوں کے علاوہ بہت سے قصیدے اور مسدس شامل ہیں۔ اِن کے نواسے کے پاس تھا۔ جس کو لالہ سری رام ایم۔ اے نے چھپوا دیا۔

کلام پر تبصرہ

ہمارے پاس جو دیوانِ ظہیر ہے وہ نامکمل ہے شروع کے آٹھ صفحے غائب ہیں۔ تاہم غزل کے ساڑھے چار ہزار اشعار پر حاوی ہے۔ مخمس۔ قصاید اور قطعات اِس کے علاوہ ہیں۔ قصائد سے علمیت اور زور کلام ظاہر ہے۔ غزل میں اپنے اُستاد کی پیروی بہت کم کی ہے۔ زیادہ تر مومن خاں کا تتبع پایا جاتا ہے۔ خود فرماتے ہیں :-

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

کلام دلچسپ ہے۔ زبان کی صفائی میں البتہ اُستاد کا اثر ہے۔

بعض بعض ترکیبیں قابلِ داد ہیں۔ مثلاً :-

خاطرِ بیداد ساماں، نوازش ہائے پنہاں۔ پُشتِ برگشتہ مژگاں۔ ذوقِ سجدہ ریزی۔

شکایت اثر سے

ناکامیوں سے کام ہے مجھے عمر بھر رہا
شکرِ ستم زباں پہ شکایت اثر رہا

دیدۂ خونابہ افشاں ۔ شورشِ اثر ۔ سرِ بازِ نمک پاشِ جراحت ۔ جیبِ ناز ۔ برقِ جہندہ ۔ کشمکشِ نالۂ پیہم ۔ گستاخ دستی ۔ پالغز وغیرہ وغیرہ ۔

مومن کے تتبع میں جو اشعار کہے ہیں ان کا نمونہ ذیل میں درج ہے :۔

دیکھ لیتا ہے شوقِ ستم کا مآلِ کار
تم سے کبھی عدو کو ستایا نہ جائیگا

کہتے کہتے حالِ دشمن رک گیا
دل میں سمجھا وہ ستم ایجاد کیا

ہمنشیں یہ بھی طالعِ ناساز تو دیکھ
دورِ گردوں کو کبھی رنگ بدلنے نہ دیا

لگ رُخ داغِ جگر ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں
مجھ سے چھپتے ہیں وہ اتنا کہ چھپا بھی نہ سکوں

جاں بلب ہوں حسرتِ دیدار سے
زندگی ہے موت کے آزار سے

وفا پر التجا تم سے جفا کی
بتو یہ بے نیازی ہے خدا کی

اس مرگِ خوش انجام کی ہم کو نہ خبر تھی
وہ نعش پہ یوں نالہ و فریاد کریں گے

وعدے ہیں جانفزا غمِ ہجراں ہے جاں گسل
مرنا محال ہے مجھے جینا محال ہے

ہے صبحِ شبِ وصل، قیامت اگر ایسی
دشمن کو نہ دکھلائیو یا رب سحر ایسی

سہہ سہہ کے ظلم ان کو ستمگر بنائیں گے
ہم خود بگڑ کے جان عدو پر بنائیں گے

غمِ تغافل اثر نہ ہو جائے
یاس کا دل میں گھر نہ ہو جائے

ہم اسیرِ جنوں ہیں خانہ بدوش
کہیں زنداں بھی گھر نہ ہو جائے

جانے بھی دو عدو سے تمہاری بلا ملے
ملتے ہیں ملتے سب ہیں نہ ملنے سے کیا ملے

ہے جا ہیں اب تو جو کہ ہجراں سے کا وشیں
آزارِ رنج ہیں یہ صعوبت بلا ہیں ہے

مجھ سے بے مہری دشمن کے گلے ہیں ان کو
واہ کس لطف کے پردے میں جفا کرتے ہیں

بعض محاورات بھی خوب ہیں ۔ مثلاً

فیصلہ پاک کیا تیغِ نگہ سے تم نے
بے وفا کو نہ کسی اہلِ وفا نے دیکھا

واہ وا خوب شبِ وعدہ لگائی مہندی
رات بھر تم نے ستایا مجھے انگاروں پہ

ہے رقیب نہ تھے غیر و پاسباں کس رنج
مردوں کی جان پہ ٹوٹا نہ آسماں کس رنج

سوزِ غم گل کھلائے گا کب تک — داغ آنکھیں دکھائے گا کب تک
سب کرشمے مری نظر میں ہیں — تو نگاہیں چرائے گا کب تک

رعایتِ لفظی کہیں کہیں آپ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ آپ کا شعار نہیں ۔

وصالِ دوست میں اپنا نظارہ کیا کرتا — کنارہ مجھ سے قطرہ کنارہ کیا کرتا
ہم ایسے بحر میں ڈوبے جہاں پتہ نہ لگا — حبابِ موجۂ یم سے کنارہ کیا کرتا
ازل سے میں دلِ صد چاک لیکے آیا ہوں — ہوائے گل میں گریباں کو پارہ کیا کرتا

بعض بعض جگہ آپ کے کلام میں شوخی بھی ہے مثلاً :-

اظہارِ تمنا پہ آئینہ دکھاتے ہیں — ہرگز نہ سنا ہوگا معقول جواب ایسا
فقر و فاقہ ہے نصیبِ زاہدِ مایوس میں — ان نصیبوں پہ ہے ظالم حورِ جنت مانگتا
زہد و واعظ میں کچھ کلام نہیں — سب مسلّم مگر شباب بھی ہے؟
کچھ ہو شبِ فراق میں جینا ضرور تھا — وہ تو یہی کہیں گے طلبگارِ حور تھا
مجھے اشارۂ ساقی سے مے پیتے ہی بنی — سوالِ حرمتِ صہبا دوبارہ کیا کرتا

آپ کے یہاں متروک الفاظ بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً

چھپائے بجائے چھپانے - ع

نہ چھپائے سے چھپی زخمِ جگر کی صورت

پچھتا بجائے پچھتا - ہے ہے بجائے آہ! - سوگند کھائی بجائے قسم کھائی - بل بے بالکل متروک ہے کیجے بجائے کیجیے۔

حسبِ ذیل شعر میں "ہے" زائد معلوم ہوتا ہے

طبیعت آؤ چلو اب میکدے کو — نکالا زہد و تقویٰ ہے کہاں کا

بعض جگہ فارسی محاورہ کا اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ مثلاً نظر کردن

چشمِ حق بیں سے حسینوں کو نظر کر زاہد — یہ وہ بندے ہیں خدا سے جو ملا دیتے ہیں

یہ حضرات اپنے محبوب کے لئے جو لفظ چاہتے ہیں بے تکلف استعمال کر بیٹھتے ہیں۔ اور اس کی شان کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں :-

خود بد آموز ہو جب تم ہی تو کیا جرمِ رقیب
کہ ابھارے سے ابھرتے ہیں ابھرنے والے

بعض اشعار رکیک ہیں لیکن اُن کی تعداد بہت کم ہے۔ مثلاً

گھبرا کے اختلاط میں کہتے ہیں ناز سے
کمبخت نامراد کے ہیں کس بلا کے ہاتھ

بے پردہ لطفِ صحبت با ہم بلا ہوا
شرما کے اُس نے رکھ لئے منہ پر اُٹھا کے ہاتھ

اللہ کرے تو بھی بچھڑے میری طرح سے
اور غیر تجھے منہ نہ لگائے مرے آگے

ہم جب اُن کی بلائیں لیتے ہیں
ہٹ پرے دور دور کہتے ہیں

ہمارے شاعروں کا کلام چند مضامین پر محدود ہوتا ہے۔ اور وہ کوئی خاص پیغام نہیں رکھتے بلحاظ نوعیت مضامین تقریباً تمام شعرا یکساں ہیں۔ جدت اور انداز بیان دوسری شے ہے حقیقت یہ ہے کہ اب ایشیائی شاعروں میں اپنا خاص پیغام اپنی قوم کو پہنچانے کا خیال پیدا ہونا بھی مغربی تقلید کا نتیجہ ہے۔ اور اگلے لوگ اس سے قطعی نا آشنا تھے۔ اور جب کسی شے کی اُن کو واقفیت ہی نہ تھی۔ تو وہ اُن کے کلام میں کیسے راہ پا سکتی ہے۔ ہمارے شاعروں کے یہاں حضرت ظہیر ہی پہ کیا موقوف ہے۔ اس لطیف شے سے سب کے دواوین خالی ہیں۔ البتہ حسن و عشق کے جذبات سے لبریز ہیں۔ دیوانِ ظہیر قابلِ مطالعہ ہے۔ اور آپ اُس کو پڑھ کر ضرور محظوظ ہوں گے۔

ذیل میں آپ کے دیوان سے بہتر اشعار انتخاب کرنے کے بعد درج کئے جاتے ہیں:۔

زباں بند کی ہی دل کی حقیقت پردہ داری نے
تحیرِ عکسِ طلعت ہے شکایت ہائے پنہاں کا

عہدِ شکست ہم سے بھلایا نہ جائے گا
ہر جا سرِ نیاز جھکایا نہ جائے گا

کچھ شکوے گلے ہوتے کچھ طیش سوا ہوتا
قسمت میں نہ ملنا تھا ملتے بھی تو کیا ہوتا

بیٹھے ہوئے بتکدے میں نہ چھیڑ اے خدا پرست
جاتا رہوں نہ کفر سے ایمان تو گیا

جب زمیں پہ پاؤں دھرنے کا سہارا ہو گیا
آدمی سمجھا فلک کا میں ہی تارا ہو گیا

لہو و لعب میں عہدِ جوانی گذر گیا
جھونکا خزاں کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

واللہ ظہیر آپ بھی کیا سادہ روش ہیں
اُس شوخ ستمگر سے مقدر کی شکایت

دیتا پیامِ وصل ہے کچھ اضطرابِ شوق
تھمتا نہیں بغل میں دلِ بیقرار آج

آنکھوں میں رہے تم دلِ مضطر سے نکل کر
صد شکر کہ گھر ہی میں رہے گھر سے نکل کر

طرزِ نگہ نرگسِ مستانہ سمجھ کر
ہم پی گئے شکوے ترے پیمانہ سمجھ کر

صبحِ محشر یاد آئی شامِ ہجراں دیکھ کر
کھل گئیں آنکھیں مری خوابِ پریشاں دیکھ کر

ٹھہرا ہے حصرِ دردِ جدائی وصال پر
موقوف زندگی ہے اُمیدِ محال پر

حوصلے جرم کے کچھ اور بڑھا دیتے ہو
تم کچھ اس ڈھب سے بگڑتے ہو خطا واروں پر

وا رہ دامن کی فکر ہے ارباب زہد میں
جو دل میں ہے زباں پہ آیا نہیں ہنوز

دل دوڑتا ہے کیوں نگہ یار کی طرف
جاتی نہیں ہے جنس خریدار کی طرف

فتنہ گر شوخی حیا کب تک
دیکھتا اور نہ دیکھتا کب تک

توقع کو توقع بھی کہاں تک
یہ مرنا ہے حیات جاودانی تک

نہ سہی وصل مگر وعدہ تو کر لو منہ سے
کیا جئے جائیں گے ہم وعدہ وفا ہونے تک

ملتے ہیں اس جفا پہ جو اس بےوفا سے ہم
مجبور ہو گئے ہیں دل مبتلا سے ہم

تھوڑا علاج درد دل زار کر چکے
مایوس ہے اثر سے دعا اور دعا سے ہم

ستم وہ کس پہ کرتے ہیں کسے ناحق ستاتے ہیں
اسی کو آزماتے ہیں جسے اپنا بناتے ہیں

آزاد ہو کے دام سے جائیں کہاں اسیر
اتنے رہے ہیں دور کہ یاد آشیاں نہیں

ہوتی ہے قدر نعمت راحت بقدر رنج
الفت میں لطف کیا ہے اگر امتحاں نہیں

دشمن جاں ادا سہی ناز نہیں جفا سہی
ہم ہی نہ ہوں جو باوفا کوئی نہیں ستائے کیوں

پردہ سے خود نمائیاں خلق سے لن ترانیاں
سامنے آ نہ جائے کیوں شوق کوئی بڑھائے کیوں

زاہد نہیں ہوں رند قدح خوار بھی نہیں
مل جائے مفت کی تو کچھ انکار بھی نہیں

سو بات کا جواب ہے واں ایک خامشی
انکار گر نہیں ہے تو اقرار بھی نہیں

گلے لب پہ آتے ہیں بے ساختہ
یہ باتیں مری اختیاری نہیں

تعلق سے وارستہ انساں نہیں
گلوگیر کس کا گریباں نہیں

شاداں ہوں کہ وفا غیر کی قسمت میں نہیں
حوصلے وہ تو ستم کر کے بڑھا دیتے ہیں

ہے زندگی بھی ہجر کہ آتی قضا نہیں
یا وعدۂ وصال کہ ہوتا وفا نہیں

اک چھیڑ وصل میں ہے ستانے کے واسطے
عذر وفا سے ترک جفا مدعا نہیں

غرض نہ لطف سے ہم کو نہ قہر سے مطلب
ادا شناس ہیں اُن کی نظر کو دیکھتے ہیں

ذرہ میں وہی وہی قمر میں
ہے فرق مگر نظر نظر میں

شکستہ توبہ نے پھر آج پر پرزے نکالے ہیں
گھٹائیں جھومتی آتی ہیں بادل کالے کالے ہیں

دینے کو ایک جان ہے کسے دوں کسے نہ دوں
اور طالب اک جہاں ہے کسے دوں کسے نہ دوں

لے لی زری نے مرے جوہر کو چھپا رکھا ہے
جس قدر خلق میں گمنام ہوں مشہور نہیں

- توقع پر ستم سہتے رہیں کچھ دن / دگر نہ کیا دھرا ہے امتحاں میں
- نہیں کیا یہ بھی قدرت انقلاب چشم فتاں کو / کہ صبح وصل سے بدلے ہماری شام ہجراں کو
- وصل کا احتمال ہے مجھ کو / ہے اور اچھا خیال ہے مجھ کو
- آشوب روزگار سے خالی جہاں نہ ہو / سر پر مرے زمیں ہو اگر آسماں نہ ہو
- سب آفتیں جہاں کی مرے دم کے ساتھ ہیں / بجلی ہی کیوں گرے جو مرا آشیاں نہ ہو
- اک التفات عام نے سب کچھ بھلا دیا / ایسے سے کیا گلہ ہو جو نامہرباں نہ ہو
- پڑا ہے دل کہیں، بیٹھے کہیں ہو / مرے پہلو میں ہو اور پھر نہیں ہو
- آساں نہیں وصال تو دشوار بھی نہیں / ناساز ہے فلک تو خدا کارساز ہے
- ایسے دنیا میں وفادار کہاں ملتے ہیں / دم نکلتا ہے، نکلتا نہیں ارماں کوئی
- ناصح! تمہاری پند ہی کچھ کارگر ہوئی / کم کم ملے تو چاہ اُدھر بیشتر ہوئی
- مجھے کہتے تو ہو شوریدہ سر ہے / تمہیں بھی اپنے عالم پر نظر ہے
- وسعتیں دل کی ابھی ہرگز دشت و صحرا میں نہیں / اپنی وحشت کے لئے ویرانہ ایسا چاہیئے
- تغافل سے بشارت ہے محبت آزمائی کی / نگہ چھپتی نہیں بیگانگی میں آشنائی کی
- فلک سے موت گر مانگوں تو عمر خضر ملتی ہے / یہ کج رفتار جب چلتا ہے اُلٹی چال چلتا ہے
- ترقی عالم امکاں میں آغاز تنزل ہے / جوانی جوش پر آتی ہے جتنا حسن ڈھلتا ہے
- باز آئے زندگی سے کہاں ہم کہ اٹھائیے / نازک مزاجیاں فلک بدشعار کی
- یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ہم ان کو چھوڑ بیٹھے ہیں / جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروت آہی جاتی ہے
- یہاں پہلے ہی خوف معصیت نے پاؤں توڑے ہیں / تھکا دیتی ہے چلنے سے زیادہ فکر منزل کی
- بھولے ہوئے بیٹھے ہیں ابھی اپنی جفائیں / جب یاد کریں گے تو ہمیں یاد کریں گے
- کرتے تو گلے رنج کے تم سے ہی نہ کرتے / اللہ سے کیا شکوۂ بیداد کریں گے
- لو روز جزا بھی نہ ملی داد ہماری / اے داور محشر تجھے کیا یاد کریں گے
- نجد و یمن پہ نہیں حصر تجسس ہے شرط / ایسے ایسے تو بہت راہ میں جنگل آئے
- رشک کے غم شب ہجراں کے ستم بھول گئے / اک ترے ملتے ہی دنیا کے الم بھول گئے
- ہاں کعبہ و بت خانہ پہ ہے شیخ و برہمن / جو طالب جلوہ ہو الٰہی وہ کدھر جائے
- اِدھر بات کی دل بھر آیا اُدھر / طبیعت بھی کچھ چشم تر ہو گئی

غضب میں آئے تمہارے مزاجداں بن کر — کہ بات بات میں رنجش کا ڈھب ہے کیا کہئے

تغافل اور دلِ بیداد گر سے — محبت ٹپکی پڑتی ہے نظر سے

اٹھاتی ہے تمہارے آستاں سے — زمیں بھی کم نہیں کچھ آسماں سے

کیا کہیں کیا نظر آتا ہے ترے جلووں میں — منہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے ہیں حقیقت والے

کیا منہ دکھاؤں شرم سے اے اہلِ رستخیز — ہے خاک کوئے غیر جبیں پر لگی ہوئی

چاہت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بیقرار — دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

بنائے سے کہیں تقدیر بنتی اور بگڑتی ہے — مگر تقدیر سے تدبیر بنتی اور بگڑتی ہے

رگ رگ میں اک تپش جو سمائی ہوئی سی ہے — یہ آگ تو کسی کی لگائی ہوئی سی ہے

دیکھا ہے انقلاب تمہاری نگاہ کا — دنیا پلٹ گئی ہے یہ کافر جدھر ہوئی

۶۲ - مزہ تو جب ہے بروزِ محشر کہ جوش رحمت پکار اٹھے
کہ جاؤ لے جاؤ عاصیوں کو حساب ہم لے کے کیا کریں گے

مجروح

آپ کا نام میر مہدی اور مجروح تخلص ہے، میر حسین فگار کے بیٹے تھے، اور غالب کے شاگرد رشید تھے، اصل وطن شاہجہاں آباد تھا۔ لیکن غدر ۱۸۵۷ء میں دہلی سے ترک وطن کر کے پانی پت کے محلہ انصار میں آباد ہو گئے تھے۔ جب ۵۸ء کا فتنہ فرو ہو گیا۔ تو ایک عرصہ کے بعد دہلی واپس آئے۔ لیکن تلاش روزگار میں پھر گھر سے باہر نکلے۔ اور آخر کار مہاراجہ شیودان سنگھ رئیس الور کی قدردانی سے کچھ دنوں الور میں رہے۔

اس کے بعد آپ نے اپنا زمانہ بیکاری میں بسر کیا۔ آخر عمر میں قسمت نے یاوری کی۔ اور نواب حامد علی خاں والئے رامپور کی عنایت و مہربانی سے کچھ دن راحت و آرام سے گزارے۔

آپ سادات نجیب الطرفین سے تھے، آپ کے خاندان نے مغلوں کی آخری بہار میں ایران سے ہندوستان کا رخ کیا تھا، چنانچہ دربار میں علاوہ مصاحبت کے مورچہ جنبانی نسلاً بعد نسل خاندان میں چلی آتی تھی۔ پیدائش سنہ ۱۸۳۲ء میں ہوئی۔ کیونکہ آپ غدر کے زمانہ میں پچیس سالہ خوشرو جوان تھے۔ اور سنہ ۱۳۲۱ھ میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ اس حساب سے آپ کی عمر تقریباً بہتر سال ہوتی ہے۔

لباس ٹھیٹھ دلی والوں کا ہوتا تھا۔ پنج گوشیہ ٹوپی، ڈھاکہ کے ڈورئیے کا نیچی چولی کا انگرکھا، اس کے نیچے گلشن کا کرتہ ہر وقت عطر میں تر بتر رہتے تھے۔ اور یہی وضع مرتے دم تک رہی۔

ابتدائی تعلیم گھر میں پائی تھی۔ کیونکہ سارا خاندان دولت علم و فضل سے مالا مال تھا۔ والد جید عالم اور نزاکت آفریں شاعر تھے۔ درحقیقت میر مجروح کا پیشہ شاعری نہ تھا۔ لطف سخن خداداد رکھتے تھے۔ اور طبیعت میں شعر کا ذوق تھا جس نے آخر کار آپ کو شاعر بنا دیا۔

کلام پر تبصرہ

آپ کا دیوان غزلیات، مخمسات، ترجیع بند، رباعیات اور قطعات پر مشتمل ہے۔ ایک قصیدہ

منقبت میں ہے۔ اور کچھ تاریخیں ہیں۔ کلام میں سادگی اور شیرینی دونوں موجود ہیں۔ تقریباً تین ہزار اشعار صرف غزل کے ہونگے۔ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں آپ کی اردو عبارت کی تعریف کی ہے لیکن غزل گوئی کے متعلق کچھ ذکر نہیں کیا۔ آپ کی کوئی اردو تصنیف دیوان کے سوا ہماری نظر سے گزری۔ اور نہ ہم نے سنا کہ آپ کسی نثر کی کتاب کے بھی مصنف ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب نے صرف خطوط نویسی کی تعریف و توصیف فرمائی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"میر مہدی! جیتے رہو، آفرین صد ہزار آفریں، اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے مجھ کو رشک آنے لگا۔ سنو، دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت ہے، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ لے گیا، مگر میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے۔"

مرزا غالب کے خطوط سے جو میر مہدی کے نام ہیں، اُس محبت و شفقت کا پتہ چلتا ہے۔ جو بزرگوں کو خوردوں سے یا اُستادوں کو شاگردوں سے ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میر مہدی نے بھی حتی الوسع اس امر کی کوشش کی ہے کہ لائق اُستاد کے لائق شاگرد بنیں۔ چنانچہ تمام دیوان اس بات کی بیّن دلیل ہے لیکن مضمون آفرینی کم ہے۔ اور انہیں خیالات کو جو پہلے اُستاد باندھتے چلے آئے ہیں۔ اپنی زبان سے ادا کیا ہے۔ کہیں لطفِ سخن پیدا ہو گیا ہے۔ اور کہیں یہ بھی نہیں ہوا۔ آپ کا ایک شعر ہے:-

کیوں نہ ہر رنگ نہ ہو جائے ہوں انساں پیدا　　خانۂ دہر ہے گویا کہ گلستاں تیرا

معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال آپ نے ذوق کے حسبِ ذیل شعر سے اخذ کیا ہے:-

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن　　اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

لیکن آپ اپنے شعر میں کوئی خوبی پیدا نہ کر سکے۔ ذوق کے شعر میں اضافہ تو درکنار۔ اپنے شعر کو محدود کر کے خوبی سے بالکل معرا کر دیا۔

اگرچہ مولانا حالی نے ایک شعر میں آپ کی تعریف فرمائی ہے۔ اور داغ کے ساتھ نام لیا ہے لیکن ہمارے نزدیک آپ کا شمار اول درجہ کے اُستادوں میں نہیں ہو سکتا۔ دوسرے درجہ کے شعراء میں آپ کو شامل کرنا چاہئے۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں:-

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں　　نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

اب ہم خود مولانا حالی کے اشعار سے حضرت مجروح کے ہم قافیہ اشعار کا موازنہ کرتے ہیں جس سے ظاہر ہو جائیگا کہ آپ کے یہاں وہ علوئے تخیل ناپید ہے۔ جو حالی کے یہاں موجود ہے۔ اور جو انداز بیان حالی کا ہے۔ وہ آپ کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہو سکے گا۔ کہ اول درجہ کے شاعر اور دوسرے درجہ کے شاعر میں کیا فرق ہے۔ حالی کے یہاں جتنی بندش ہے اور مجروح کے یہاں یہ بات نہیں ہے پختگی کلام بھی حالی کے یہاں مجروح کی نسبت زیادہ ہے۔

مجروح ۔ پہلے نہ کیونکر صبح سے اٹھ بیٹھے شیخ شہر ۔۔۔ پائی ہے اس نے لذت خواب سحر کہاں

حالی ۔ ہیں دور جام اول شب میں خودی سے دور ۔۔۔ ہوتی ہے آج دیکھئے ہم کو سحر کہاں

مجروح ۔ ہم چشم میری چشم سے ہوا ابر تر کہاں ۔۔۔ اس سے بھلا تراوش خون جگر کہاں

حالی ۔ اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیش عشق ۔۔۔ رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

مجروح ۔ کچھ کچھ چلن ہے حشر میں رفتار یار کا ۔۔۔ ہے وہ بھی فتنہ خیز مگر اس قدر کہاں

حالی ۔ یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر ۔۔۔ تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

مجروح ۔ دل کو شاید ترے مژگاں کا تصور نہ رہا ۔۔۔ اب وہ پہلی سی کھٹک کاوش پنہاں میں نہیں

حالی ۔ کھو دیا پاس نے ذوق خلش فکر وصال ۔۔۔ اک مزا تھا سو وہ اب کاوش پنہاں میں نہیں

مجروح ۔ پاس آنے کا مرے کیوں نہ وہ وعدہ کرتا ۔۔۔ جانتا ہے کہ یہ بچتا شب ہجراں میں نہیں

حالی ۔ بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ ۔۔۔ اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

مجروح ۔ کسی عاشق کا پتہ دیتا ہے دل مضطر شاید ۔۔۔ آج کچھ بل جو ترے کاکل پیچاں میں نہیں

حالی ۔ دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ ۔۔۔ ایسے الجھاؤ ترے کاکل پیچاں میں نہیں

مجروح ۔ بیمار غم کا آتا ہے ہونٹوں پہ دم تو آئے ۔۔۔ پرسش کرے ہے وہ لب اعجاز فن کہاں

حالی ۔ کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے ۔۔۔ شکوہ ہے کو لے گیا ہے وہ بیداد فن کہاں

مجروح ۔ وہ گالیوں کی چھیڑ وہ طرار پن کہاں ۔۔۔ تمکیں اگر یہی ہے تو لطف سخن کہاں

حالی ۔ لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرف آشنا ۔۔۔ لیجائیے ہم کو دیکھئے ذوق سخن کہاں

مجروح ۔ اب ہم ہیں اور کنج قفس کی صعوبتیں ۔۔۔ وہ نغمہ سنجیاں وہ نشاط چمن کہاں

حالی:۔ فصل خزاں کمیں میں ہے صیاد گھات میں

مرغ چمن کو فرصت سیر چمن کہاں

قارئین کرام نے ان اشعار سے خود اندازہ کر لیا ہوگا۔ کہ مجروح کس درجہ کے شاعر ہیں

مزید تشریح کی ضرورت نہیں، البتہ خود مجروح نے حالی کی تعریف کی ہے ۔ وہ شعر بھی یہاں درج کیا جاتا ہے ۔ فرماتے ہیں :۔

قصرِ حالی کے حوالی ہیں ذرا تم مجروح ۔۔۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ بنانا ہرگز

آپ کے یہاں بعض بعض فارسی تراکیب خوب ہیں، مثلاً چشم برراہ ۔ خواجہ تاشِ ہادی الطریق ۔ مستحانِ فلک ۔ ریزشِ انتظار زائراں :

پیہم ہے بسکہ ریزشِ انتظار زائراں ۔۔۔ ہے فرشِ صحن خاص ہیں تارِ نگاہ کا

دریائے پرخروش ۔ شست وشو ۔ دلِ ہنگامہ طلب ۔ شوخِ ستیزہ کار ۔ چشمِ دو بیں ۔

سارا یہ اپنی چشمِ دوبیں کا قصور تھا ۔۔۔ ورنہ ہر ایک جنس دہیں کُل کا ظہور تھا

شورش افزائیاں ۔

نہ کر آہ یہ شورش افزائیاں ۔۔۔ تجھے بھی کبھی آزمائیں گے ہم

نگہِ نیم رس ۔ اشک ریز وغیرہ ۔

آپ کے یہاں متروکات بہت ہیں مثلاً "جو کہ" بجائے "جو" ۔

جنت و کوثر و طوبیٰ و قصور و انہار ۔۔۔ کچھ نہیں مانگتا وہ جو کہ ہے خواہاں تیرا

یہاں "کہ" بالکل زائد ہے ۔ اور قابلِ ترک ہے "جس کو کہ" بجائے "جس کو" ۔

وہ ترا ملک ہے جس کو کہ نہیں بیم زوال ۔۔۔ دستِ تاراج سے ایمن ہے گلستاں تیرا

"ہو سکے ہے" بجائے "ہو سکتا ہے" ۔

یہ کس سے ہو سکے ہے بجز فیضِ مصطفےٰ ۔۔۔ جو معصیت میں رنگ دکھلائے ثواب کا

"سدا" بجائے "ہمیشہ" ۔ "سمجھئے" بجائے "سمجھے" ۔

جو کہ میخانہ میں آئے کچھ نہ کچھ وہ پائے فیض ۔۔۔ سمجھئے پیرِ مغاں کی ذات کو دریائے فیض

"پوچھے سے" بجائے "پوچھنے سے" ۔

بھلا کیا ہر گھڑی پوچھے سے حاصل ۔۔۔ وہی اک حسرتِ دل کا بیاں ہے

"کبھو" بجائے "کبھی" ۔ ۔

وہ فتنہ ساز تو رکھتا نہیں کبھو باقی

ایک جگہ آپ نے نکات کی جمع جو خود جمع ہے نکاتوں بنائی ہے ۔ یہ بالکل غلط ہے ۔

مشکل ہے بہت اُس کے نکاتوں کا سمجھنا ۔۔۔ گنجینۂ اسرارِ نہانی ہے یہاں دل

"بچھا" میں جیم فارسی کو مشدد باندھا ہے۔ جو غلط ہے ؎

بچھا تھا رہ میں معجزۂ عیسوی کا فرش　　جب آپ آئے اُس لبِ معجز نما کیساتھ

ناکامیاب کی جگہ ناکام ہونا چاہئے۔ ؎

اُس چشمِ پُر فریب کا اللہ رے لگاؤ　　اب تک اُمیدوار یہ ناکامیاب ہے

"ثانی" کو مؤنث باندھ گئے ہیں۔ حالانکہ آجکل مذکر بولا جاتا ہے، فرماتے ہیں ؎

حسرتِ جاوید کی خواہش کسے　　کوئی دنیا میں نہیں ثانی مری

آپ کے یہاں رکیک اشعار نہیں پائے گئے۔ صرف حسبِ ذیل شعر کو رکیک کہہ سکتے ہیں۔

جب لئے بوسے بے شمار لئے　　کتنے ہی وہ کہا کئے بس بس

ذیل میں آپ کے دیوان سے منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

کرلیں بہت سے جرم اکٹھے کہ حشر میں　　ہونا ہے سامنا کرم بے حساب کا

اُفتادگی کسی کی نہ تھی آپ کو پسند　　سایہ اسی لئے نہ پڑا اُس جناب کا

محفل طرازیاں وہ کہاں اب تو کام ہے　　گھر میں پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

ظاہر ہے یہ کہ جاذبِ شبنم ہے آفتاب　　کافی ہمیں ہے یار کا اک بار دیکھنا

روکنا اُس کا سہل تھا لیکن　　شوق ہی جرأت آزما نہ ہوا

کہتے ہیں دردِ ہجر سے کیوں مر گئے نہ تم　　لو اور سنئے یہ بھی ہمارا قصور تھا

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو بُرا جانا　　سمجھے بھی تو کیا سمجھے جانا بھی تو کیا جانا

گو عمر بسر اس کی تحقیق میں کی تو بھی　　ماہیتِ اصلی کو اپنی نہ ذرا جانا

کچھ عرضِ تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا　　میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

انجام ہوا اپنا آغازِ محبت میں　　اس شغل کو جاں فرسا ایسا تو نہ تھا جانا

ہجر میں طرفہ ماجرا دیکھا　　زیست میں موت کا مزا دیکھا

گو ہر اک حال ہے واں ہم سے چھپایا جاتا　　رنگ محفل کا پر اچھا نہیں پایا جاتا

ذرا ذرہ کی تم مقدار دیکھو　　ہمارا بیش و کم کیا اور ہم کیا

بیچے کلیم ہوا طور جل کے خاک سیاہ　　کہیں وہ جلوہ جمال اور کہیں جلال ہوا

بیدار ایک میں ہی فراقِ صنم میں ہوں　　سوتی ہے ورنہ ساری خدائی تمام رات

ہم بھی اُمیدِ وصل سے خوش ہیں　　ہے زمانہ کو انقلاب بہت

اسیر رہنے کی ضامن شکستہ بالی ہے — مری طرف سے عبث ہے تو بدگماں صیاد

ظلم کا اُس کے یہ زینہ ہے تکبر کے سبب — کہ سدا سر پہ مرے رہتا ہے احساں ہو کر

تم بھی چوری کو یقیں ہے دکھو گے اچھا — اب ہمیں دیکھ کے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

عشق ہے ایک مگر آفتِ نو ہے ہر دم — یہ وہ مضمون ہے کہ ہوگا نہ پرانا ہرگز

قہر ہے چشمِ مست کا انداز — سحر سمجھو اگر نہیں اعجاز

اُس کے اِس ربط پر نہ جا اے غیر — کبھی ہم سے بھی تھا بڑا اخلاص

لوگ حضرت کو رسولِ دوسرا کہتے ہیں — ہم تو اِک مظہرِ اسرارِ خدا کہتے ہیں

کیوں میری بود و باش کی پرسش ہے ہر گھڑی — تم تو کہو کہ رہتے ہو دو دو پہر کہاں

اپنوں سے ارتباط نہ یاروں سے اختلاط — یہ عمر تم نے اتنی گزاری خضر کہاں

واں حسن کا غرور ہے یاں فرطِ شوق ہے — اُن کو ہماری اور ہمیں اُن کی خبر نہیں

اِس چار دن کے حسن پہ یہ کم نگاہیاں — افسوس کچھ مآل پہ تم کو نظر نہیں

نسبت ہے روزِ حشر و شبِ ہجر میں یہی — اُس کی نہیں جو شام تو اِس کی سحر نہیں

نہ کر مجروح کچھ کوشش کہ جب دن آئیں گے اچھے — تو بگڑے کام برسوں کے سنور جائیں گے دم بھر میں

کیا بتاؤں نشاطِ منزلِ دوست — دیر و کعبہ تو اُس کی راہ میں ہیں

ہم ہنر لیکے کہاں جائیں کسے دکھلائیں — جنس اچھی ہے پر اس کا کوئی خواہاں تو نہیں

چرخ اس واسطے لایا ہے کنوئیں سے باہر — کہ پھنسے حضرتِ یوسف ابھی زنداں میں نہیں

دل کی لے چٹکیاں گئیں نہ کہیں — اک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں

پھر کیا چیز ہے وفا کیسی — یہ تو باتیں ہی اب رہیں نہ کہیں

شبِ ہجر میں آنکھ لگنے نہ دی — وہ پھرتے رہے چشمِ بیدار میں

جھگڑتا ہوں ہر بات میں اس لئے — وہ ٹھیرے رہیں تا کہ تکرار میں

گھڑتے ہیں یوں تو سیکڑوں باتیں مگر وہاں — چپ ایسے بیٹھتے ہیں کہ گویا زباں نہیں

دل لے لیا لیا طلبِ جان ہے تو خیر — کچھ اُتنی اتنی باتوں کی پروا یہاں نہیں

وہ ادھر آئیں مری عیادت کو — یوں کہو یہ بھی آ گئی دل میں

ٹپکتی ہے شرارت چتونوں سے — وہ گو ظاہر میں شرمائے ہوئے ہیں

کج ادائی پہ سب ہمیں تک تھی — اب زمانہ کو انقلاب کہاں

جانا نہ بس ضرور تھا اُس جلوہ گاہ میں
ہم دیر و کعبہ چھوڑ گئے دونوں راہ میں

اب تو کچھ اور ہی نگاہیں ہیں
وہ نگہ ہائے لطف خیز نہیں

کھٹکا رہا سحر کا شبِ وصلِ یار میں
بادِ خزاں نے لطف نہ رکھا بہار میں

ہلتی ہے اُسکی وضع زبس خوئے یار میں
آئے نہ کیوں مزا ستمِ روزگار میں

پژمردہ دل کدورتِ ایام نے کیا
آئینہ اٹ رہا ہے یہ گرد و غبار میں

لٹنے میں یہ اُٹھائی ہے لذت کہ راہ میں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ ہے راہزن کہاں

نویدِ امن ہے اہلِ جہاں کو
ہمیں سے ضد ہے اب تو آسماں کو

فقط اک دوستداری ہیں تمہاری
کیا ہے ہم نے دشمن اک جہاں کو

ملا دیتے یونہیں کچھ ہاں میں ہاں ہو
یہاں ہو پر خدا جانے کہاں ہو

ہمیں شکوہ ہے اک بیداد گر کا
اب اس میں آپ ہوں یا آسماں ہو

دلِ درد آشنا دیا ہم کو
لو دیا بھی تو کیا دیا ہم کو

حال ابتر مریضِ غم کا ہے
اب تو مرجائے یہ تو اچھا ہو

دنیا کے طلب گار ہوئے دین کے بدلے
جاتا ہوں کدھر اور مجھے جانا ہے کدھر کو

اب حد سے بڑھ گئیں دلِ ہیچ و پوچ کی جراتیں
یہ اور اس کو عشق حبیبِ خدا کے ساتھ

قدم رکھتا ہے اُس کے در پہ شاید
مرے پاؤں کے نیچے آسماں ہے

کیا حالِ دل اُس شوخ ستمگر سے کہا جائے
جو جنبشِ لب دیکھتے ہی بات کو پا جائے

میں دیکھ آیا ہوں سب دیر و حرم کو
تمہارا شور ہر جا ہو رہا ہے

کسی رہبر کی یاں حاجت نہیں ہے
ہمارا شوقِ منزل رہنما ہے

مزا ہم کو ملتا ہے تکرار سے
وہ خوگر زیادہ ہوں انکار سے

میں ظاہر ہیں ہوں جنسِ کاسد و لے
مجھے پوچھ میرے خریدار سے

گریباں دری ہے نہ سینہ زنی
یونہیں آج بیٹھے ہیں بیکار سے

کبھی ان کا تھا آسماں پر دماغ
یہ مجروح پھرتے ہیں جو خوار سے

جلوۂ یار نے کیا بے خود
ہم تو آتے ہی اُن کے جانے لگے

بات بنتی نظر نہیں آتی
اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

ہزار آفتوں میں پھنسایا مجھے
بھلا آدمی کیوں بنایا مجھے

نبٹ لیں اور سے گر یہ بھی چھوڑے — بڑا دشمن تو سب سے آسماں ہے

اس کے ہوتے ہیں دو عالم مانگوں — قہر ہے پستیٔ ہمت میری

واں ستم تک دریغ ہے ہم سے — یاں توقع ہیں ہیں عنایت کے

کسی کے مرنے کا افسوس ہے عبث ناداں — مگر جہاں میں رہے گا ہمیشہ تو باقی

ہم نے یہ بھی تو نہ جانا کہ چمن ہے کیا چیز — اپنے ہی حال میں کچھ ایسے گرفتار رہے

اُس کا ملنا محال ہے لیکن
شوقِ ہمت بڑھائے جاتا ہے

جلال

حکیم سید ضامن علی نام اور جلال تخلص تھا۔ حکیم سید اصغر علی کے بیٹے تھے۔ طبابت خاندانی پیشہ تھا۔ سنہ ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۴ر شوال سنہ ۱۳۲۷ھ مطابق ۲۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء کو انتقال فرمایا۔

آپ نے فنِ شعر میں اول ہلالؔ کی شاگردی اختیار کی۔ جو میر علی اوسط رشکؔ کے تلامذہ میں ممتاز تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد خود رشکؔ کے شاگرد ہو گئے۔ فارسی اور عربی میں اعلیٰ استعداد رکھتے تھے۔ فنِ شعر سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے آپ کی قدردانی کی۔ اور وہاں طلب کیا۔ آپ رامپور کے مجمعِ شعراء میں اکثر معاصرین کے کلام پر نکتہ چینی بھی کرتے رہتے تھے۔ نثر میں سرمایۂ زبانِ اردو، منتخب القواعد اور فنِ عروض پر ایک رسالہ آپ سے یادگار ہیں۔ اور چار دیوان آپ نے مرتب فرمائے ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ ہم کو صرف چوتھے دیوان کی زیارت نصیب ہوئی۔ جس کی نسبت بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ یہ آپ کا پھیکا کلام ہے۔ لیکن یہ تعجب خیز امر ہے کہ بعض اردو کی درسی کتابوں میں حضرت جلالؔ کی اکثر غزلیں وہی انتخاب کی گئی ہیں۔ جو اس دیوان میں شامل ہیں۔ اور آپ کے انتقال کے بعد ایک لکھنوی صاحب نے جو مضمون رسالہ "زمانہ" سنہ ۱۹۱۰ء میں تحریر فرمایا تھا۔ اس میں بھی عمدہ نمونۂ کلام اسی دیوان سے دیا گیا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو۔ کہ پہلا اور دوسرا دیوان کمیاب بلکہ نایاب ہے۔

رامپور میں جلالؔ پچیس برس تک رہے۔ بعد ازاں ریاست منگرول علاقہ کاٹھیاوار میں ملازم ہو گئے۔ وہاں کے رئیس نے آپ کی قدردانی میں دریا دلی سے کام لیا لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ اپنے وطنِ مالوف کو واپس آ گئے۔ اور لکھنؤ میں اطمینان کے ساتھ رہنے لگے اب آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں آپ کا ایک شاگرد مل جاتا تھا۔

جلالؔ اپنے زمانہ میں ایک مغرور شاعر سمجھے جاتے تھے۔ اور وہ شہر کے مشاعروں میں عام طور

پر شریک نہیں ہوتے تھے اور کسی کے شعر کی داد دینا اُن کی خلقت ہی میں نہ تھا۔
آپ کو ضیق النفس کا عارضہ تھا۔ مدت سے ایک موذی مرض میں مبتلا تھے۔ لیکن مرضِ ملموت صرف معمولی بخار تھا جس نے دو چار روز میں کام تمام کر دیا۔ آپ کو آخر عمر تک کتب بینی کا شوق رہا۔ اور اس حد تک رہا کہ آنکھوں میں ناسور پڑنے کے باوجود اور بائیں آنکھ کے زخم سے مواد جاری رہنے پر بھی علی الصباح نہایت باریک خط کے قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ اور عینک کی کبھی احتیاج نہیں ہوتی تھی۔ ع

چھپا ہے شاعری کا مہرِ تاباں

۷ ۲ ۳ ۱ ھ

اس مصرعہ سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

کلام پر تبصرہ

چونکہ ہم نے پہلا اور دوسرا دیوان نہیں دیکھا۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ آپ درحقیقت کیسے سخنگو تھے بعض شاعر جوانی میں خوب کہتے ہیں۔ اور بڑھاپے میں ان کی شاعری کو ضعف لاحق ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے یہی صورت جلالؔ کو بھی پیش آئی ہو۔ مگر ہمارے سامنے جو نمونہ کلام موجود ہے۔ اُسی پر رائے زنی کی جا سکتی ہے۔ قیاسات کو دخل نہیں دیا جا سکتا۔ بیشک داغؔ نے اپنے ایک شعر میں حضرتِ جلالؔ سے ملنے کی آرزو ظاہر کی ہے۔ اس سے کم از کم یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ کہ مرزا داغؔ اُن کو ایک اچھا شاعر سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

اسے داغؔ ہے دکن سے بہت دُور لکھنؤ ملتے امیر احمد و سید جلالؔ سے

ایک صاحب نے ادیب الہ آباد سنہ ۱۹۱۰ء میں آپ کے کلام کی نسبت یہ رائے ظاہر کی تھی۔ "اُن کا رنگِ سخن بہ نسبت جدت طرازی کے زیادہ تر پختگی لئے ہوئے تھا۔ اور اگرچہ اُن کے کلام میں رنگین اشعار بکثرت موجود ہیں۔ مگر زیادہ تر صفائی اور روزمرّہ پر زور دیتے تھے اور یہی اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ جلالؔ کی شاعری پر ایک نکتہ شناس کا ریمارک ہے۔ کہ انھوں نے اپنے لئے وہ پختہ سڑک تیار کی تھی جس پر لغزش کا خوف نہیں، مضمون آفرینی کے میدان میں بھی وہ اپنے معاصرین سے کم نہیں رہے۔ لیکن اُن کے اشعار میں پیچیدگی کو دخل نہیں۔ سیدھے سادے خیالات، بندھے ٹکے محاورے مستند الفاظ، چست بندش اور

اُستادانہ ترکیبیں اُن کی شاعری کی جان ہیں۔ اپنے اسکول کے خلاف وہ تصنّع اور آورد کے رنگ سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ اور یہ صفت ان کے کلام میں ابتدا سے انتہا تک صاف نظر آتی ہے۔ اُن کی شاعری میں ایک اور مابہ الامتیاز ہے۔ اور وہ ان کا اخلاق صحیح ہے۔ عاشقانہ رنگ میں وہ اُس حد تک نہیں جاتے تھے۔ کہ فحش ہو جائے۔ بلکہ اُس مذاق کو بھی جو اُس وقت کی سوسائٹی میں نہایت مقبول تھا۔ جلال نے ایک لطیف پیرائے میں نظم کیا ہے۔ مثلاً

"کنگھی، چوٹی، مسّی کا جل، زیب و زینت، نازکی — کس نے کس نے اُن کو رو کا میرے گھر آتے ہوئے
ناز سے چلئے ذرا اپنی کمر پر رکھ کے ہاتھ — ہم بھی دیکھیں نازکی کو پاؤں پھیلاتے ہوئے"

ایک دوسرے صاحب نے زمانہ کانپور سنہ ۱۹۱۰ء میں لکھا ہے۔ کہ "جلال کے دیوان میں عرفی و نظیری کے مذاق کے اکثر شعر موجود ہیں۔ صرف زبان کا فرق ہے۔ رنگِ تغزّل میں جلال کو جو دستگاہ ہے۔ اس کو سخن سنج حضرات سمجھ سکتے ہیں۔ عاشقانہ رنگ میں جلال نے شاید ہی کوئی مضمون چھوڑا ہے۔ اُن کے دیوان غزل گو شعرا کے لئے سبق آموز ہیں۔ اس لئے کہ غزل گوئی سہل کام نہیں ہے۔ لیاقتِ علمی اور مدت العمر کی مشق درکار ہے۔ جلال شاعرِ یکرنگ ہیں۔ اور ان کی طبیعت عاشقانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مرحوم کے دیوان میں محض شاعرانہ مبالغہ، غلو اور فحش مضامین نہیں ہیں اور ہیں بھی بہت کم ہے۔ اکثر اشعار میں آمد ہے۔ اور مصرع تو ایسا چست لگاتے ہیں کہ باید و شاید۔"

افسوس ہے کہ ہم کو ان دونوں صاحبوں کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ جہاں تک صفائی اور روزمرہ کا تعلق ہے۔ اُس سے شاید ہم بھی اختلاف نہ کریں۔ لیکن مضمون آفرینی اور مذاقِ صحیح کا پتہ اُن کے کلام میں نہیں ملتا۔ اگر کہیں اتفاق سے کوئی مضمون ہاتھ آگیا ہے۔ تو آپ نے اُس کی ایسی مٹی خراب کی ہے کہ کم از کم بیس جگہ اُسی مضمون کو باندھا ہے۔ مثلاً ذیل کے شعر میں ایک اچھا مضمون بندھ گیا تھا۔

دیتا وہ تسلّی جو ہمیں اور تڑپتے — اُس شوخ کو بیتاب بھی کرنا نہیں آتا

اب آپ نے اسی مضمون کو حسبِ ذیل اشعار میں دُہرایا ہے۔ ع

آپ سے کوئی پوچھے ہم سے کیا مزا پایا؟

یک بارگی اُٹھائے گا سینہ سے نہ ہاتھ — ایسا نہ ہو تڑپ مرے دل کی دوچند ہو
رکھ کے دل پر اُٹھائے لیتے ہو ہاتھ — اور اُسے بیقرار کرتے ہو
کیوں دل کی تڑپ یاں ہے شبِ وصل ترقی — ہاتھ اُس کا کوئی میرے جگر پر تو نہیں ہے

پھر آئیں گے یہ کہہ نہ جانے وہ کاش ۔۔۔ تسلّی ہمیں اور تڑپا گئی
چلے ہیں مجھ کو وہ جھوٹی تسلیاں دیکر ۔۔۔ تڑپ مرے دلِ بیتاب کی گواہ ہے
دونی ہو جاتی ہے تسلّی سے ۔۔۔ کیا یہ دل کی تڑپ پر آفت ہے
تڑپ کے وقت ہے کچھ دباؤ دل پر بھی ۔۔۔ جہاں ہے ہاتھ وہاں صبر کا ہو پتھر بھی
اب اُن کی یاد تڑپانا بھی بھولی ۔۔۔ تسلّی دینے کی عادت کبھی تھی
کچھ تسلّی جب ہمیں تم دے گئے ۔۔۔ کم تڑپتے تھے بہت تڑپا گئے

صاف ظاہر ہے کہ ایک مضمون جو اتفاق سے ہاتھ آگیا تھا۔ اُس سے جابجا کام لیا جاتا ہے۔ کیا اسی کا نام مضمون آفرینی ہے اور تنگ خیالی نہیں ہے؟ مذاق صحیح کے یہ معنی تھے کہ قافیہ پیمائی کو ترک کر کے خیال آفرینی سے کام لیتے لیکن شروع سے لے کر آخر تک آپ کے دیوان "نظم نگارین" میں بمشکل تمام بہتر اشعار ایسے دستیاب ہوئے۔ جن کو اپنے انتخاب میں شامل کرنا گوارا کیا زیادہ تر کلام بیحد پھیکا۔ اور بے لطف معلوم ہوا۔ ہرگز کوئی حظ آپ کے اشعار سے حاصل نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے باوجود ناسخ کے سلسلہ سے منسلک ہوتے ہوئے ناسخیت کو اپنے کلام میں زیادہ جگہ نہیں دی۔ یعنی تشبیہات اور استعارہ در استعارہ کو زیادہ کام میں نہیں لائے اگرچہ کنگھی، چوٹی وغیرہ سے آپ نے بالکل گریز نہیں کیا تاہم اس قسم کے مضامین دیوان میں خال خال ہیں۔ البتہ رعایت لفظی سے بیحد شاد و مسرور معلوم ہوتے ہیں۔ کہ اُس کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے اور اُس کے استعمال کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

رعایت لفظی کی مثالیں :-

ہم سے وہ گیسوؤں کو اپنے بنا کر بگڑ دیں ۔۔۔ کیا گلہ اُن کا مقدر ہی ہے برہم اپنا
یوں کاٹ کہ اُڑ جائے مری حسرت پرواز ۔۔۔ صیاد تجھے پر بھی کترنا نہیں آتا
محبت ہیں دے کر تجھے جان شیریں ۔۔۔ بہت یاد اسے تلخ کامی کریں گے
لاکھ پڑھواتے ہیں اے دل کلمہ اُس بت کا ۔۔۔ ایک کافر تھا کبھی تو نہ مسلماں ہوتا
بال بال اپنا گنہگار ہے ہر چند جلال ۔۔۔ اُس کی رحمت سے نہیں خوف سر مو دل میں
رکھتے ہی پاؤں بہک سے ہیں شیخ تھا جواں ۔۔۔ پھر کبھی قدم نہ پیر خرابات کے لئے

رکیک اشعار بھی آپ کے یہاں بہت ہیں۔ مثلاً

وصل کی رات تو کچھ دست تمنا ہو دراز ۔۔۔ دل ادھجائے کوئی او کھڑی ہوئی محرم اپنا

گالیاں ہی سُنے جاتا تھا تجھے اس کی جلال — کاش کمبخت پھر اک بوسہ کا خواہاں ہوتا
میری بیتاب پسندی سے جو بڑے بہت سے کھل پڑے — چوٹیاں کتنی مرے غم میں پریشاں ہو گئیں
بہی محرم کے زرا بند کسے رکھتے تم — اُبھرے جوبن کو جوانی کے نہ ڈھلنے دیتے
وہ اک بوسہ مجھے دیتے ہیں میں کہتا ہوں دو لونگا — اسی پہ مجھ سے اُن سے رات بھر تکرار رہتی ہے
عجب لذتِ وصل کے ہیں کرشمے — زباں منہ میں دیدیتے ہیں بے دہن بھی

زرا باتوں میں اپنے ڈال لو تم پہونچیاں بھاری
لچک بھی دیکھو ہیں نازک کلائی دیکھنے والے

اگرچہ ہم کو جلالؔ کے صاحبِ علم و فضیلت ہونے میں شبہ نہیں لیکن بمصداق الانسان مرکب الخطا والنسیان آپ نے حسب ذیل شعر میں جیب و گریبان جو ہم معنی الفاظ ہیں ساتھ ساتھ باندھ دئے ہیں

جلالؔ جیب و گریباں پھٹے جب آیا دھیان — ادا سے یار کے دامن اُٹھا کے چلنے کا

اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جیب اور گریبان علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اسی طرح آپنے ایک نیا لفظ منتظری بجائے انتظار گھڑا ہے۔ ع

یوں مری رات تری منتظری میں گزری

منتظری قطعی غلط ہے۔

بعض فارسی تراکیب ایسی استعمال کی ہیں جو ناگوارِ طبع ہوتی ہیں مثلاً ع

جان کیسا عشق میں دے دی ہے بسہل

یا

بدلبری کوئی پرسانِ حال ہے دمِ نزع

آپ کی ان فارسی ترکیبوں کے استعمال سے پہلے اور دوسرے دور کے شعراء یاد آجاتے ہیں۔ رنگِ ناسخ میں صرف ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔ حقیقتاً آپ کے یہاں یہ رنگ اشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے۔

بجلی اسے آہ کسی رات گرا تاروں پہ — لوٹتے برق کو دیکھیں کبھی انگاروں پر

آپ کے کلام میں مترو کات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:۔ نہیں ملنے کا بجائے نہیں ملے گا۔ ع
میں بھی تجھ کو نہیں ملنے کا اگر تو نہ ملا" — کاہے کو بجائے کس لئے ع

"لگائے کوئی سینے سے تو یوں کاہے کو ہم تڑپیں" "ارے بالکل متروک ہے" :- ع

ارے شریر اگر تو نے کوئی شر نہ کیا

نہیں سنتے کے بجائے نہیں سنیں گے - کیوں جی بجائے کیوں وغیرہ - لیکن بعض فارسی تراکیب نہایت عمدہ اور قابل داد بھی ہیں - مثلاً وحشت اثر بالکل مومن خانی ترکیب ہے - محشر خرامی، تفرقہ انداز، جویائے سفر، چشم انتظار، ستم کش، جنون خیز، غارت گر شکیب، از خود رفتہ، حسن حیرت افزا، دلکش ادا، غم نصیب وغیرہ وغیرہ -

آپ کا کلام پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے - کہ آپ نے داغ اور مومن کی تقلید کی ہے - صفائی زبان اور شستگی کا خیال داغ کے کلام نے پیدا کیا چنانچہ فرماتے ہیں :-

پھر ہم اُن کے روٹھ جانے پر فدا ہونے لگے پھر ہمیں پیار آگیا جب وہ خفا ہونے لگے

فارسی تراکیب کا استعمال اور کہیں کہیں مضمون آفرینی مومن سے سیکھی - لیکن اس خوف سے کہ آپ کو لوگ داغ کا متبع نہ کہیں پورے طور پر اس پیروی کو نباہنے کی کوشش نہیں کی - جس کا نتیجہ یہ ہوا - کہ کلام میں نہ داغ کی سی سلاست پیدا ہوئی - اور نہ مومن جیسی نازک خیالی ہاتھ آئی - نہ لکھنؤ کا رنگ رہا نہ دہلی کا :- ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

ہاں اپنا ایک رنگ بنا لیا جس میں سب کچھ موجود ہے - اور جس میں درحقیقت ہر ایک رنگ کی بگڑی ہوئی صورت پائی جاتی ہے - کمال کا درجہ حاصل نہ ہوا - متوسط الخیال شعراء میں شمار کئے گئے -

ذیل میں آپ کا منتخب کلام ہدیہ ناظرین ہے :-

اُس کے جلوے کا اگر دیکھنے والا ہوتا حشر پر دید کے وعدے کو نہ ٹالا ہوتا

کیا محبت کا مری وحشت اثر افسانہ تھا اور عالم ہو گیا جس نے سنا دیوانہ تھا

کل جو میرے گھر وہ آئے تھے بتا اے بیخودی کون تھا دونوں میں مہماں کون صاحب خانہ تھا

رہ گئی شرم کہ اُس شوخ کی فریاد نہ کی ورنہ کیا حشر میں ظالم سے پشیماں ہوتا

کچھ سوچ میں ہیں کھوئے ہوئے سے ہیں آپ ہم قاصد کو دے کے کوچۂ دلدار کا پتا

کھو دیتی ہے دنیا سے از خود رفتگی عشق اس راہ میں گم ہو کے پھر انساں نہیں ملتا

اے بادِ صبا راہ نما تو ہی ہو اپنی چھوٹے ہیں قفس سے تو گلستاں نہیں ملتا

کیا دل میں خون آرزوئے وصل کا ہوا — آتا ہے آنسوؤں میں لہو کچھ ملا ہوا

کلیجا کوئی تھام کر رہ گیا ہے — اُدھر جانے والے اِدھر دیکھ لیتا

خود سے تو اُدھر نہ جائیں گے ہم — آئندہ جو قصد بیخودی کا

خبر کیا تھی کہ خاموشی ہی رازِ عشق کہہ دیگی — وہی غمّاز ہوگا جو ہمارا راز داں ہوگا

کیوں کسی کی جستجو کو دل گیا — کھوئے جانے کے سوا کیا مل گیا

دل کو نالہ بھی کر نہیں آتا — ابھی منہ کو جگر نہیں آتا

کسی کا اک جھلک دکھلا کے برقِ طور ہو جانا — کسی کے ہوش کا گم ہو کے کوسوں دور ہو جانا

ہماری کامیابی وصل میں بھی غیر ممکن ہے — وہ پوچھیں بھی تو اظہارِ تمنا ہو نہیں سکتا

ہاں کا پہلو رکھتی ہے اُن کی نہیں — لطف ہے انکار میں اقرار کا

عشق کے کھوئے مزے دردِ جگر نے اٹھ کر — چھپکے چھپکے ہمیں اک لطف اٹھانے نہ دیا

تغافل کے گلے سُن کے چھپا لیں تم نے کیوں آنکھیں — مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بیباک ہوتا تھا

چھوٹ جاتے ہیں عدم کی راہ میں ہمدرد بھی — ہو گیا رخصت جگر کا پہلی ہی منزل میں درد

دیکھئے روزِ جزا بھی وہ ملے یا نہ ملے — جس کے ملنے کی چلا ہوں میں تمنا لے کر

نصب کر دی ہے تصور نے مرے — یار کی تصویر ہر دیوار پر

کہتا ہے کہ ترکِ مدعا کر — اے عشقِ صنم خدا خدا کر

بھیجا تھا کسی کی جستجو کو — پھر آئی صبا بھی خاک اڑا کر

رہتے ہیں بیخود جو تیرے عشق میں — وہ بہت ہشیار ہیں غافل نہیں

ستم کو بھی غنیمت جانتے ہیں — یہی تیری عنایت جانتے ہیں

خودی میری رکھتی ہے دور اس سے مجھ کو — یہ سب تفرقے اس کے ڈالے ہوئے ہیں

وہ امیدیں جو بر آتی نہیں خود قطع کرتا ہوں — بڑے کام اس مری ناکامیٔ دل سے نکلتے ہیں

پوچھئے طور کے جلوے کی حقیقت کس سے — چند بے ہوش سرِ طور نظر آتے ہیں

کھلی ہیں بند ہو کر جلوہ گاہِ یار میں آنکھیں — حواسِ رفتہ ہی کچھ ہوش میں مرنے کو لائے ہیں

اے شیخ کیوں نہ سجدے کریں ان بتوں کو ہم — بت ہی نہیں ہیں مظہرِ شانِ خدا بھی ہیں

نہ پوچھو ہم تمہیں کیا جانتے کیا سمجھتے ہیں — صنم کو عشق کے بندے خدا سمجھتے ہیں

محو بیخود اس قدر اس شوخ کی الفت میں ہوں — کچھ نہیں معلوم ایذا میں ہوں یا راحت میں ہوں

میں دیتا تھا دل جب کسی نے نہ روکا — نہ دو جان اب لوگ سمجھا رہے ہیں

کیسے قصور و حور کہاں خلد تو کجا — زاہد یہ سب خیال ترے واہیات ہیں

مٹاتا ہی رہا جس کو مقدر — وہ میری آرزو ہے اور میں ہوں

گلستانِ جہاں ہے قابلِ سیر — طلسم رنگ و بو ہے اور میں ہوں

دوست تجھ کو ہے اجل دشمنِ انساں لاکھ ہوں — ہم سدا مست ہیں تو اک جان کے خواہاں لاکھ ہوں

کہتا ہے وصلِ یار زندگی میں حیات ہوں — لیکن کچھ اعتبار نہیں بے ثبات ہوں

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا راز — آنکھ کمبخت سے پہچان گئے تم مجھ کو

آیا تو ہے یہاں مگر از خود گزشتہ ہے — میرا پتا امیر ابھی شاید وہیں نہ ہو

وعدہ کیوں بار بار کرتے ہو — خود کو بے اعتبار کرتے ہو

خدا جانے پری ہو حور ہو انساں ہو کیا تم ہو — مگر کچھ شک نہیں اس میں صنم شانِ خدا تم ہو

یاد آکے تری ہجر میں سمجھائے گی کس کو — دل ہی نہیں پہلو میں تو بہلائے گی کس کو

جفا کی اس سے شکایت ذرا نہیں آتی — وہ یاد ہی نہیں شکر خدا نہیں آتی

چٹکی بھی دل میں ہے نہیں لیتا کوئی جلال — کمبخت کی زبان سے کیوں اف نکل گئی

یار کی ایک جفا کے ہیں دل میں سو داغ — سو وفائیں مری اور اک جفا سے یاد ہے

نگہِ یاس لڑ کے قاتل سے — ذبح بھی ہونے دے گی مشکل سے

جفا نے دوست کا شکوا ہی کیا ہے — یہ ہوتی آئی ہے بیجا ہی کیا ہے

کیوں وصل میں بھی آنکھ ملائی نہیں جاتی — وہ فرق دلوں کا وہ جدائی نہیں جاتی

یہ کہہ کر کروٹیں شب کو ترے ناکام لیتے تھے — وہ دل کیا ہو گیا رہ رہ کے جس کو تھام لیتے تھے

اس سے کچھ میرا بھی ذکر ہے دل ناشاد رہے — وقت پر بھول نہ جانا یہ ذرا یاد رہے

آج آپ کی فرقت کی بسر رات نہ ہو گی — دل لیجئے پھر ہم سے ملاقات نہ ہو گی

شغل گر ڈھونڈتے ہو جی کے بہلنے کیلئے — دل میں آ بیٹھو کلیجہ مرا ملنے کے لئے

شکوہ ہے برقِ تجلی سے کرا دتا انصاف — ہم ہوں منہ دیکھنے کو طور ہو جلنے کے لئے

دل مرا آنکھ تری دونوں ہیں بیمار مگر — ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

پیش آئیے کبھی تو محبت کی راہ سے — شکوے کرے نگاہ ہی مل کر نگاہ سے

آنسو رکے تو کیا نہیں چھپنے کا رازِ عشق — حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

کسی طرح نہیں سنتے تم التجا میری
بتو خدا سے ڈرو سن نہ لے خدا میری

بیقراری کہیں شاید لئے جاتی ہے اسے
رہتی ہے دل سے لپٹ کر تری حسرت کیسی

شرارت یہ اس بت میں کچھ آ گئی
کہ شوخی بھی واللہ شرما گئی

جلوہ کسی کا دیکھ کے آنکھیں سی کھل گئیں
پردے جو غفلتوں کے پڑے تھے الٹ گئے

لو امتحان تم مرے نالوں کا شوق سے
کیوں ڈر کے آسمان کے نیچے سے ہٹ گئے

کوئے جاناں نے قدم پکڑے ہیں اے وحشت دل
پاؤں خود آگے یہاں سے نہیں چلنے دیتے

گو دل دکھا گئے، دیں نہ اجازت وہ آہ کی
ہم پا کریں گے حشر پہ جیب داد خواہ کی

بتوں کے عشق کا تا زندگی نباہ رہے
یہ عہد ہم نے کیا ہے خدا گواہ رہے

نہ دینا ایک جواب انفعال کہنا ہے
ہزار روز جزا پرسش گناہ رہے

دل کو ہر دم پرسش جرم تمنا ہم سے ہے
خون دلبر نے کیا ہے اور دعوا ہم سے ہے

جفا کر کے یوں اس ستمگر کا کہنا
مٹا دیں گی تم کو وفائیں تمہاری

ہم کہتے ہیں بدنام کیا تم کو جفا نے
قول ان کا ہے چرچا کیا تیری وفا نے

تیری سلامتی جو امید وصال ہے
مرنا فراق دوست میں اپنا محال ہے

اے تلاش مدعا دونوں کو تو نے کھو دیا
آہ خود بھی ہو گئی گم آہ کی تاثیر بھی

جس روز وہ امتحان لیں گے
سوچے ہوئے ہوں کہ جان لیں گے

آپ کا اصلی نام احمد حسین تھا۔ مگر امیر اللہ کے نام سے مشہور ہوئے تسلیم تخلص کرتے تھے مولوی عبدالصمد انصاری کے بیٹے تھے۔ نواح فیض آباد میں ایک گاؤں ہے جس کا نام منگلسی ہے۔ وہاں ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ والد لکھنؤ میں ملازم تھے۔ اس لئے نشوونما بھی وہیں ہوا۔ اپنے باپ اور مولوی عبداللطیف سے فارسی عربی کی کتابیں پڑھیں۔ اور خطاطی میں کمال پیدا کیا۔

شعر و سخن سے مناسبت خدا داد تھی۔ جب مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی لکھنؤ چلے گئے۔ تو آپ نے اُن سے مشق سخن کرنے کے بعد اپنی راہ اہل لکھنؤ سے الگ نکالی۔

آپ کے والد محمد علی شاہ کے زمانہ میں کسی عہدہ پر پلٹن میں ملازم تھے۔ وہ کبر سنی کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ تو آپ اپنے باپ کی جگہ مقرر کئے گئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد تخفیف میں آگئے۔ آپ نے واجد علی شاہ کو ایک منظوم عرضداشت بھیجی جس پہ بادشاہ نے حسب ذیل حکم نظم میں لکھوایا:۔

بشنو اے خوش نویس و اے خوشخو   ہر دو فن تو کنی و ہر دو نکو
اسم تو مندرج بہ دفتر شد   بست و دو روپیہ مقرر شد

۱۸۵۶ء میں جب اودھ کی سلطنت کا الحاق برطانوی ہند کے ساتھ ہوگیا۔ اور واجد علی شاہ کو معزول کر دیا گیا۔ تو آپ رامپور چلے گئے۔ وہاں نواب کلب علی خاں کی بدولت چندے آرام سے گزری تیس روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ عید بقر عید کے موقع پر قصائد پیش کرنے کے صلہ میں دو سو روپیہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی نواب صاحب فیاضانہ سلوک کرتے رہتے تھے۔ آپ نے چورانوے برس کی عمر میں ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی۔

غدر سے پہلے ایک دیوان مرتب کیا تھا۔ لیکن وہ اس ہنگامہ میں ضائع ہوگیا۔ اس کے بعد نظم ارجمند کے نام سے ایک دیوان شائع کیا۔ جس میں چند قصیدے اور دو مثنویاں ہیں۔ رامپور میں

نظم دل افروز کے نام سے ایک اور دیوان چھاپا۔ جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ چوتھا دیوان دفترِ خیال کے نام سے شائع ہوا۔ پانچواں دیوان ترتیب نہیں پا سکا۔ لیکن سنا ہے کہ آپ کے شاگردانِ رامپور کے پاس ہے۔

آپ کی مثنویات، نالۂ تسلیم، شامِ غریباں، صبحِ خنداں، دل و جاں، نغمۂ بلبل، شوکتِ شاہجہانی گوہرِ انتخاب، اور تاریخ بدیع یعنی تاریخ رامپور جو وقتاً فوقتاً لکھی گئیں۔ کافی مشہور ہیں۔ سفرنامہ نوابِ رامپور جس میں پچیس ہزار سے کم اشعار نہ ہوں گے، رامپور کے سرکاری کتب خانہ میں قلمی موجود ہے۔

کلام پر تبصرہ

تسلیم کی غزلیں اپنے زمانہ کے لحاظ سے خوب ہیں۔ جس طرح آپ کے ہمعصر شعراء غزل گوئی کے مردِ میدان تھے، آپ بھی اس فن میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ شعرائے ماسبق نے جو خیالات اور مضامین غزل کے مقرر کر دئے تھے۔ انہیں پر آپ کاربند رہے۔ کسی قسم کی جدت نہیں پائی جاتی البتہ اہلِ لکھنؤ سے آپ کی راہ الگ ہے۔ چوٹی کنگھی کے مضامین اگرچہ آپ کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن خال خال ہیں۔ رعایتِ لفظی بھی ہے۔ لیکن کم تشبیہات و استعارات بھی ہیں۔ مگر اعتدال کیساتھ مومن خاں اور ان کے سلسلہ میں فارسی تراکیب کو برجستگی کے ساتھ ادا کرنے کی ایک صفتِ خاص ہے۔ چنانچہ آپ میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ اور آپ کی غزلوں میں فارسی تراکیب کی چاشنی خوب مزا دیتی ہے۔

آپکے کلام میں قصائد اور مثنویات بھی داخل ہیں۔ اول الذکر معمولی ہیں۔ اور آخر الذکر قابلِ تعریف ہیں۔ مثنویات میں پختگی اور شستگی دونوں موجود ہیں۔ قطعات اور تاریخیں بھی دلچسپ ہیں۔ آپ کا دیوان جو نظم دل افروز کے نام سے موسوم ہے۔ صرف غزل کے سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ مخمسات قطعات اور رباعیات علیحدہ ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے میر تقی میر سے کچھ کم اشعار نہیں کہے پُرگوئی کے عیوب میں کلام کا رطب و یابس سے پُر ہونا داخل ہے۔ چنانچہ آپ کے یہاں بھی بھرتی کے اشعار بکثرت ہیں۔ بہت کم اشعار مرغوبِ طبع کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن شستگی اور تراکیب کی برجستگی بھرتی کے اشعار کو زیادہ بدنما یا ناگوارِ طبع نہیں ہونے دیتی۔

غزل کے جو چند مضامین ہیں وہی آپ کی جولان گاہ ہیں۔ الفاظ مختلف ہیں۔ لیکن ہیر پھیر کر وہی بات کہتے چلے جاتے ہیں۔ چونکہ غزل میں خیالات اور مضامین ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ اس لئے

صرف یہی نہیں۔ کہ ایک مضمون کئی کئی مرتبہ خود اپنے یہاں بندھ جاتا ہے۔ بلکہ دوسرے شعراء کے مضامین بھی نادانستہ طور پر بندھ جاتے ہیں۔ اس کو آپ توارد کہیں یا جو چاہے کہیں لیکن اس قسم کی مثالیں کلام تسلیم میں موجود ہیں۔

غالب کا شعر ہے:۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے　　اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

تسلیم کہتے ہیں:۔

پرواز اولیں میں اسیری ہوئی نصیب　　گویا قفس میں تھے جو اُڑے آشیاں سے ہم

انشا کا شعر ہے:۔

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے　　زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

تسلیم فرماتے ہیں:۔

شراب کیوں نہ پیوں فصل گل میں اے ساقی　　نہ متقی ہوں نہ زاہد نہ پارسا ہوں میں

صبا کا شعر ہے:۔

دُنیا سی بد نہاد کا سودا ہے سر کے ساتھ　　انجام ہو بخیر کہ شر ہے بشر کے ساتھ

آپ فرماتے ہیں:۔

دنیائے بد نہاد کا سودا ہے سر کے ساتھ　　انجام ہو بخیر کہ شر ہے بشر کے ساتھ

نہیں معلوم صبا کے دیوان میں کتابت کی غلطی سے دُنیا سی بد نہاد چھپ گیا ہے۔ یا تسلیم نے دنیائے بد نہاد کہہ کر اصلاح دی ہے۔ اور اپنے دیوان میں شامل کر لیا ہے۔ داغ کا شعر ہے:۔

خوش نوائی نے ہمیں رکھا اسیر صیاد　　ہم سے اچھے رہے صدقے میں اُترنے والے

تسلیم کا ارشاد ہے:۔

اگر ہے شوق آزادی حذر کر نغمہ سنجی سے　　قفس میں ہم نے دیکھا عمر بھر مرغ خوش الحاں کو

آپ کے یہاں مبالغہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مثلاً:۔

ذرہ ذرہ پس کے جسم ناتواں ہو جائے گا　　کاہ کا سایہ مجھے کوہ گراں ہو جائے گا

مجھ ناتواں کی گور پہ کیوں گل فشاں ہیں دوست　　کوہ گراں سے کم نہیں پتی گلاب کی

یکایک اشعار کہتے ہیں بھی آپ کوئی تامل نہیں کرتے، فرماتے ہیں:۔

کھینچا جو شب کنار تصور میں شوق نے　　لاکھوں جگہ سے پیرہن اُن کا مسک گیا۔

محروم اضطراب نے رکھا وصال سے   تیور وہ میرے دیکھ کے دل میں کھٹک گیا

جب دباتی ہے زمینِ گور میری لاش کو   یاد آجاتا ہے وہ تیرا لپٹنا اختلاط

جو اک بوسہ لیا میں نے لئے دو اُس نے ہنس ہنس کر   سمجھ لیا یار نے مجھ کو مری تقصیر کے قابل

رعایت لفظی کی مثالیں ذیل میں درج ہیں:-

اُس گل کی جب سے دیکھی ہیں رنگیں ادائیاں   نظروں میں میری خار ہے حسنِ بہار آج

کون پھر حسن آتا ہے لبِ جو سیر کو   دیکھتی ہے اٹھ کے بیتابانہ سو سو بار موج

عاشق تھا چل کے فاتحہ پڑھئے مزار پر   اب کیا ہے خاک ڈالئے دل کے غبار پر

وصل کی شب بھی میں ناکام تمنا ہی رہا   نہ گوارا ہوئی اُس مہ کو شبِ قمر کی تکلیف

گرمجوشی کے عوض ہے سرد مہری ترش و شیب   ان بتوں کے کیا نہیں ہوتی ہے آبِ گل میں آگ

دل لیا جاتا ہے حسنِ گندمی کو دیکھ کر   مدت کا پیغام ہے میرے لئے یہ عام رنگ

آتا ہے پئے سیرِ گل پردہ نشیں آج   اے بادِ صبا چل چمنستاں سے ہوا ہو

حسب ذیل شعر میں مجمع کی عین الف پڑھی جاتی ہے:-

زوالِ حسن میں کوئی کبھی بھولوں نہ پوچھے گا   نہ سارا مجمع اے تسلیم ہے دو دن کے جوبن تک

اور حسب ذیل شعروں واو عطف کا استعمال ناجائز ہے:-

تسلیم روسیاہ کو یا رب تو بخش دے   بہرِ حسینؑ و احمدِ مختار کے لئے

اگرچہ تسلیم کے آخر زمانہ میں زبان بہت صاف ہو گئی تھی تاہم چند متروک الفاظ آپ کے یہاں پائے جاتے ہیں مثلاً بچھا بجائے بجھا۔ ع

ہر چمن میں جال ہے بچھا ہوا صیاد کا

اُف ری بجائے آہ۔ ع

اُف ری ناکامی قسمت کہ شبِ وعدہ بھی

رفتگاں، اس قسم کی فارسی جمع بغیر اضافت آجکل متروک ہے ۔

مرقدوں کا آج تک باقی ہے ماتم دشت میں   خاک اڑاتے ہیں بگولے رفتگاں کے واسطے

کہیں کہیں آپ نے ٹھیٹھ ہندی الفاظ خوب استعمال کئے ہیں۔ مثلاً

پہلے وہ میرے پاس سے جب وہ سرک گیا   مجھ کو ہوا یقین کہ پھر دل میں شک گیا

اے رونقِ چمن ترے دو دن کے ہجر میں   سنسنا گیا گلوں کا شجر جھک گیا

کس درجہ تھی مہیب شبِ تیرۂ فراق　　　آنکھیں چرا کے نورِ نظر بھی کھسک گیا
اہلِ دانش کی نظر میں بے ہنر جچتے نہیں　　　جوہری کیا خاک دیکھے نورتنِ تصویر کا
آسماں ٹوٹے الٰہی ہو بُرا صیاد کا　　　فصلِ گل میں گھر اُجاڑا بلبلِ ناشاد کا

اب فارسی تراکیب کے نمونے ملاحظہ ہوں:-

غمِ غلطی:- کی توبہ مے سے غمِ غلطی کا مزا گیا　　　اپنے تو دم پہ بن گئی ناصح کا کیا گیا

آشوب گہِ حشر، وحشت زدۂ عشق، اربابِ سکوت، حسنِ حیرت خیز، ناخن زن، تابِ طپش سوزِ الم
خمیازہ کش، صفتِ گرد پریدہ، فروغِ زیست، پامالِ جفا، فرشِ پا انداز، ہوش بر جا سے

ہوش برجا ہوں تو کچھ دل کی لگی دم بھر کہوں　　　پہلے دے تھوڑی مجھے اے داورِ محشر شراب

راضی برضا، بیگانہ خو:

جب اُسی بیگانہ خو سے آشنائی کی تو پھر　　　فکرِ عقبیٰ ہیچ ہے غمخواریِ دنیا عبث

دوشا دوش:-

آئے وہ گھر پہ ہیں دوشا دوش پہنچا گور تک　　　بیٹھے ہیں بالیں پہ تنہا لاش اُٹھ جانے کے بعد

شکستِ رنگ، نشتر زن

رو دیتے ہیں وہ سُن کے قلق نامۂ فراق　　　نشتر زنِ جگر ہے مری داستاں ہنوز

بلاکش ستمِ روزگار، بتِ زود آشنا، ادب آموز وغیرہ وغیرہ۔

ذیل میں آپ کے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں:-

لذتیں درد کی کوئی مرے دل سے پوچھے　　　کہ رفو دردِ جگر نے کبھی کرنے نہ دیا
مقتل میں ایک کو بھی شکایت نہیں رہی　　　سب کو گلے سے خنجرِ قاتل لگا گیا
ماتم رہا لحد پہ کہ بزمِ طرب رہی　　　مجھ کو خبر نہیں ہے پسِ دیوار کیا ہوا
عمر بھر روئے مگر دیدۂ گوہر کی طرح　　　سرِ مژگاں بھی نہ اشکوں سے ہوا تر اپنا
ہم ہیں وہ خاک لئے پھرتی ہے جس کو صرصر　　　نہ زمیں پر ہے ٹھکانا نہ فلک پر اپنا
آپ میں رہنا بہار آتے ہی دوبھر ہو گیا　　　بوئے گل کی طرح میں جامہ سے باہر ہو گیا
وحشت مجھے اُس دشت میں لائی ہے جہاں آہ!　　　سر پھوڑنے کو ایک بھی پتھر نہیں ملتا
ہوئے جوان وہ جب، ربط میں فتور آیا　　　شباب ساتھ لئے حسن کا غرور آیا
ہوگا کہیں آوارہ و برباد و پریشاں　　　کیا پوچھتے ہو مجھ سے ٹھکانا مرے دل کا

باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر کی طرح
ہنسنے کا عمر بھر مجھے ارمان ہی رہا

اُس کے آنے کی خبر لائی صبا جب باغ میں
ہوشِ بلبل بن کے رنگِ گل ہوا ہونے لگا

آسماں نیچا دکھاتا ہے حسینوں کو ضرور
چاہ میں یوسف بھی دو دن آ کے مہماں رہ گیا

آنکھ ملتے ہی مرا دل مجھ سے بدظن ہو گیا
ایک دم میں مدتوں کا دوست دشمن ہو گیا

وطن میں تازہ وارد ہوں طبیعت گھر میں کیا بہلے
ابھی پھرتا ہے آنکھوں میں مری نقشہ بیاباں کا

آج آنکھیں تک نہیں ملتی ہیں کل بیٹھے تھے پاس
دو ہی دن میں اس قدر پاسِ وفا جاتا رہا

باغِ دُنیا ہو کہ فردوس برابر ہے مجھے
یہ چمن زار ہے کس کا وہ گلستاں کس کا

کچھ کہہ دو جھوٹ سچ کہ توقع بندھی رہے
توڑو نہ آسرا دلِ اُمیدوار کا

رنگیں مزاج پاک ہیں ایذا سے دہر کے
اُلجھا نہ خار سے کبھی دامن بہار کا

دی نہیں مرگ نے دو گز بھی زمیں بہرِ مزار
بس ترا حوصلہ اے وسعتِ صحرا دیکھا

سنتے سُنتے وہ حالِ دل بولے
یہ تو قصہ ہوا گلا نہ ہوا

چپ دیکھ کے سب کہتے ہیں کچھ کہئے تو آخر
وہ کونسا غم ہے جو بیاں ہو نہیں سکتا

وہ ہوا خواہِ اسیری تھے کہ آزادی کے بعد
رو دئے ہم دیکھ کر خالی قفس صیاد کا

لاتی ہے فرق رسمِ محبت میں دل لگی
چھیڑا صبا نے پیار سے غنچہ چٹک گیا

اپنے سے بڑھ کے غیر کو پایا شریکِ درد
پھاہا ہمارے زخمِ جگر سے چپک گیا

ایک گل میں بھی نہ پائی آج تک بوئے وفا
کچھ عجب عالم ہے اے دل گلشنِ ایجاد کا

برابر صانعِ قدرت کو ہستی و نیستی عالم ہے
نہ شادی کچھ بنانے کی نہ کوئی غم مٹانے کا

کہ گئی کچھ تو حیا آ کے مری جانب سے
ورنہ یوں تجھ سے تھا آنکھ چرانا کیسا؟

ہر شب اگر یہی ہیں بیتابیاں جگر کی
اک روز ہجر ہی میں اپنا وصال ہو گا

یاس کے ناز مجھے روز اُٹھانے پڑتے
شکر ہے زخمِ جگر قابلِ درماں نہ ہوا

لب دہن بھریں ساقی شرابِ ناب میں کیا
ہجومِ مستیٔ غفلت ہے کم شباب میں کیا

سمجھے تھے مر کے ہستی و عدم سے ملی نجات
واعظ نے اور حشر کا جھگڑا لگا دیا

اللہ ری انتہائے تمنائے وصلِ دوست
دشمن بھی آ گیا تو گلے سے لگا لیا

ایک تیرے سوا مرا ظالم
نہ کوئی دوست تھا، نہ دشمن تھا

اپنے بیگانے ہو گئے شاید
دشمنی نام ہے محبت کا

بے سبب رنجش بجا تمہیں اچھی ہوتی
یارب کبھی مٹیں گے گلے شکوے ظلم کے
صورت بھی بھولی بھولی ہے باتیں بھی خوب ہیں
کر ہوں وہ گوش جو نہ سنیں ماجرائے درد
گردش سے آسمان کی چکرا رہے ہیں ہم
جنت مقام رشک ہے کیا خاک دل ہو شاد
بہکی ہوئی زبان ہے واعظ نے پی نہ ہو
غم نہ ہونا عشق میں اے جان غم یہ بھی تو ہے
کیا جلد بام عرش سے خیر البشر پھرے
گل ہوں تو جگر چاک ہوں بو ہوں تو پریشاں
قیامت ہے قفس میں دیکھ کر باز و کو رہ جانا
فقط آواز سن سن کر دعا دیتے ہیں [illegible]

آؤ غصہ نہ کرو بہر خدا جانے دو
یا میں نہ ہوں جہاں میں یا آسماں نہ ہو
پھر بھی یہ ڈر ہے دل کو کہ بیداد گر نہ ہو
وہ چشم کور ہو جو حقیقت نگر نہ ہو
کشتی عمر گھوم رہی ہے بھنور کے ساتھ
ہونگے ہزاروں طالب دیدار اور بھی
معلوم مجھ کو خوب ہے عادت جناب کی
تم ستم سے باز آؤ ایک ستم یہ بھی تو ہے
جس طرح منتہائے نظر سے نظر پھرے
ہر رنگ میں اک آفت غم دل سے لگی ہے
بلا سے صبر آجاتا اگر بے بال و پر ہوتے
خدا معلوم کیا ہوتا جو نالے بے اثر ہوتے

نہ شامیانہ، نہ شمع تربت، نہ موج سبزہ، نہ چادر گل
بلا نصیبوں میں ہم قفس کے کیا کیا اعزاز ہے بیکسی کی
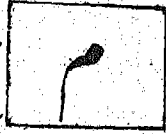
آزاد

محمد حسین نام اور آزاد تخلص ہے ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے جو اُن کا آبائی وطن ہے۔ آپ کے والد مولوی محمد باقر تھے۔ جو شیخ محمد ابراہیم ذوق کے دلی دوست تھے۔ آزاد نے ذوق کے سایۂ عاطفت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اور نکات عروض و فنِ سخن انہیں کے فیض سے حاصل کئے۔ بعد ازاں دہلی کالج میں داخل ہو گئے۔ اور آپ اس کالج کے مشہور طلباء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ نے علوم مروجہ میں اسی درس گاہ سے اچھی استعداد حاصل کی تھی۔ ہنگامۂ غدر میں آزاد اپنے وطنِ مالوف کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے۔ وہاں کے مشاہیر سے ملے جلے اور ایک عرصہ تک اطراف و جوانب میں سفر کرتے پھرے ۱۸۶۴ء میں آزاد لاہور پہنچے اور سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک آپ انجمنِ پنجاب کے اسسٹنٹ سکریٹری رہے۔ اور یونیورسٹی کالج کے صیغۂ علومِ مشرقی میں بعہدۂ پروفیسری مدتوں کام کیا۔ اسی اثنا میں تعلیمی کاموں کے علاوہ ملکی خدمات بھی وقتاً فوقتاً کمال لیاقت کے ساتھ انجام دیتے رہے ۱۸۶۵ء میں بکار سرکار کلکتہ کا سفر کیا۔ بعد ازاں پنڈت من پھول کے ہمراہ کابل و بخارا گئے ۱۸۸۳ء میں دوبارہ ایران گئے گورنمنٹ سے صرف ماہوار پنشن ملتی تھی۔ لیکن آپ نے اپنی تصانیف اور کفایت شعاری سے خاصا سرمایہ جمع کر لیا تھا۔ آزاد کی تصانیف و تالیفات حسبِ ذیل ہیں:۔

آبِ حیات، نیرنگِ خیال (دو حصہ)، سخندانِ فارس، نگارستانِ فارسی، دربارِ اکبری، جانورستان، مجموعۂ نظمِ اردو، قصصِ ہند کا دوسرا حصہ۔ ابتدائی درسی کتب اردو۔ نصیحت کا کرن پھول، قندِ پارسی، فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب، جامع القواعد فارسی، قواعد اردو، ترتیب دیوانِ ذوق اور جنوں کے زمانہ کی سپاک و نمناک۔

جنابِ آزاد کی صحت عرصہ سے خراب ہو گئی تھی۔ اپنی صاحبزادی کے انتقال کا صدمہ جس کو انہوں نے ایسی اعلیٰ تعلیم دی تھی۔ کہ وہ اُن کی تصانیف کی نظرِ ثانی کیا کرتی تھی۔ ان کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس حادثۂ جانکاہ کے بعد پھر اُن کی طبیعت کبھی بحال نہ ہوئی۔ اگست ۱۸۸۹ء سے جنون کے

آثار پیدا ہوگئے۔ رفتہ رفتہ یہ مرض پختہ ہوگیا۔ اور آخر دم تک اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آخر اسی حالت بیخودی میں بعمر ۸۰ سال ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۹ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ کو حضرت آزاد اس قید ہستی سے آزاد ہوگئے۔ اور لاہور میں دفن ہوئے۔

کلام پر تبصرہ

اگرچہ آپ کو شاعری کا دعویٰ نہیں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

شعر گوئی کا تو دعویٰ نہیں رکھتا آزاد
ہاں پر استاد کی خدمت میں ہے بیٹھا اُٹھا

لیکن آپ نے مغربی طرز پر نظمیں لکھنا شروع کیں۔ اور آپ اس کے موجد شمار کئے گئے۔ اس لئے آپ کا ذکر خیر کیا گیا۔ ورنہ غزل گوئی میں تو آپ صفر کے برابر ہیں۔ یہ نہیں کہ آپ نے تغزل کو مرہون منت نہیں کیا۔ نہیں نہیں آپ نے خوب طبع آزمائی فرمائی ہے۔ قصائد بھی لکھے ہیں۔ اور تقریباً پندرہ سو اشعار ان دونوں اصناف میں کہے ہیں۔ ہمارے نزدیک موجودہ زمانہ کے تیسرے درجہ کے شعراء حضرت آزاد سے بہتر غزل کے اشعار کہہ سکتے ہیں۔ ہم کو آپ کی غزلیات میں دس بیس اشعار کا تو کیا ذکر دو چار اشعار بھی اچھے نہیں ملے۔ ہاں آپ کی نظموں کا درجہ اگرچہ اعلیٰ نہیں ہے تاہم ابتدائی دور کی یادگار ہونے کی وجہ سے دوسرے درجہ کی شمار کی جاسکتی ہیں۔

نظم کے اشعار تقریباً ڈھائی ہزار ہیں۔ اور اچھے خاصے ہیں۔ نثر کی طرح آپ نے نظم میں بھی استعارات اور تشبیہات کو کھپایا ہے۔ لیکن حسن بیان ایسا نہیں ہے۔ جو دلوں میں جگہ کرلے۔ آپ کی نظموں کو ایک آدھ کے سوا مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ غزل میں متروکات استعمال کرنے میں باک نہیں کرتے بندش سست ہوتی ہے مضمون سے خالی کچھ الفاظ جمع کر دیتے ہیں۔ نظم میں بندش کسی قدر چست ہوتی ہے۔ اور اگرچہ ادائے مضمون کا طریقہ طویل اور جی اکتانے والا ہوتا ہے تاہم کچھ بات پیدا کر دیتے ہیں۔ قصے کہانیاں نظموں میں بھی بیان کرنے کے عادی ہیں۔ اور اپنے نزدیک اسی کو غالباً جوہر کلام سمجھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ کلام میں دلآویزی نہیں ہے تعقید بھی ہے اور حشو و زوائد بہت ہیں۔ آزاد فقط نثر اردو کے استاد ہیں اور آپ کی نثر نے قلمرو ہند پر حکمرانی کی ہے۔ آزاد کی جو عظمت نثر نویسی کی وجہ سے دلوں میں ہے۔ اس کے اعتبار سے ان کی نظم اس قابل نہیں ہے۔ کہ آزاد کے نام سے منسوب ہونا گوارا کیا جائے۔

ذیل میں حضرتِ آزاد کی ایک نظم موسوم بہ نو طرزِ مرصّع درج کی جاتی ہے۔ اور چند اشعار دیگر نظموں سے اور ایک آدھ شعر غزل کا بطور نمونہ لکھا جائے گا۔

نو طرزِ مرصّع

اقبال اک برس جو مرا تاجِ سر ہوا — شملہ پہ مجھ کو موسمِ سرما بسر ہوا
جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے — اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے
دامانِ کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر — دبکا لحافِ ابر میں منہ کو لپیٹ کر
دیکھو جو گھر تو سب در و دیوار تھے سپید — باہر چلو تو دامنِ کہسار تھے سپید
پتے بھی آ کے جاڑے نے سب دور کر دئے — اور تھے درخت برف نے بلور کر دئیے
اک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آ گیا — گھر سے نکل کے آگے ٹہلتا چلا گیا
دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اک تازہ نوجواں — ہمت کے ہاتھ میں ہے اٹھائے سپہ نشاں
ہے اُس پہ روشنی سے لکھا ہاں بڑھے چلو

ہمت کی اس کا حال میں لکھ کر سناؤں کیا — کاغذ کے کوزے میں کہو دریا کو لاؤں کیسا
جاتا تھا نوجوان عجب آن بان سے — پیدا شکوہ و شان تھی اُس کے نشان سے
چلتا قدم اٹھائے تھا اور سر جھکائے تھا — گویا خروش و جوش کو دل میں دبائے تھا
کیا جانے فکرمند تھا یا کیا ملال تھا — تیور بگڑ رہے تھے کچھ ایسا خیال تھا
سینہ میں نعرہ بند تھا منہ میں نہ تھی صدا — لیکن خموشی اُس کی با وازِ کرّنا
دیتی تھی ہر قدم پہ صدا ہاں بڑھے چلو

وہ آگے آگے جاتا تھا میں ساتھ ساتھ تھا — دامن تھا اس کے شوق کا اور میرا ہاتھ تھا
جو آ کے خود سیاہیِ شب راہ پر پڑی — آبادی ایک شہر کی ہم کو نظر پڑی
خوشحال گھر اور اُن میں خوشی بولتی ہوئی — باتیں کہ غم سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی
گھر گھر اجالے تھے سرِ دیوار سامنے — دروازوں سے چراغ نمودار سامنے
تھے ہر طرف سے جاڑے کے سامان پکارتے — تارے بھی اک کنارے سے تھے آنکھ مارتے
آرام کہہ رہا تھا کہ آگے نہ جا نہ جا — اور میں بھی کہہ رہا تھا کہ سچ سچ بجا بجا
سمجھانے والے سب یونہیں سمجھا کے رہ گئے — اتنا بھی وہ نہ سمجھا کہ ہیں کیا یہ کہہ رہے

له تھے یہاں بالکل زائد ہے۔ تنہا۔ له گرہ کھولتی ہوئی کے بجائے گرہ کھولتی ہوئیں جمع ہونا چاہیے۔ کیونکہ فاعل باتیں ہیں کہ بات۔ تنہا۔

چپکے سے گر کہا تو کہا ہاں بڑھے چلو

پھیرا تھا مُنہ ابھی نہ شبِ تیرہ فام نے　　اک پیر مردِ تجربہ کار آیا سامنے
پیری کی برف نے تھا اُسے تن بدن دیا　　موئے سفید نے نمدی پیرہن دیا
بولا کہ اے جوان عجب کالی رات ہے　　اور وقت وہ کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے
سنسان جنگل اور یہ درختوں کی سائیں سائیں　　چاروں طرف پہاڑ ہیں ہیں دوڑتی بلائیں
طوفانِ برف سر پہ کھڑا ہے تُلا ہُوا　　ہے یہ وہ درہ کہ موت کا منہ ہے کھُلا ہُوا
مانا کہ لطفِ عیش و طرب پہ نظر نہیں　　جاتا کہاں ہے موت کا بھی کچھ کو ڈر نہیں
یہ سُن کے نکلا شعلۂ دلِ نوجوان سے　　گویا ستارہ ٹوٹ پڑا آسمان سے
اور اُس نے دی کڑک کے صدا ہاں بڑھے چلو

تھی رات رنگ ابھی رُخِ عالم پہ پھیرتی　　گہ مشک اُڑاتی تھی گہے عنبر بکھیرتی
کیا جانے ہم نکل کے کدھر سے کدھر گئے　　دیکھا کہ جاڑے زور سے اپنے اُتر گئے
موسم بھی معتدل ہے، ہوا ہے لہک گئی　　خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
اور جانور ہیں رات کے آوازیں دے رہے　　مل جُل کے ساتھ جیسے ہوں دم ساز دے رہے
پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آ رہیں　　جو زیر و بم کے دور سے ہیں سُر ملا رہیں
ناگاہ آئی ایک پری زاد سامنے　　کی رمز گُل سے بلبلِ رنگیں کلام نے
جاتے ہو ایسے وقت میں کس کام کے لئے　　آرام کیجے رات ہے آرام کے لئے
دیکھا پری کو اُس نے مگر چشمِ ناز سے　　اور پاس ہو کے نکلا عجب سوز و ساز سے
پھر اِنتا مُسکرا کے کہا ہاں بڑھے چلو

ناگہ فلک پہ دامنِ شب چاک ہو گیا　　لبریز نور سے طبقِ خاک ہو گیا
منہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا　　گلگونہ لے کے سامنے رنگِ شفق ہوا
روئے سحر پہ شام تھی نور و ظہور کی　　چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گُلِ تر کی لالیاں　　اور اوس سے بھری ہوئیں پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا　　اور جھوم جھوم کر وہ رُخِ گُل کا چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی　　شبنم بھی آ کے رات کو موتی لُٹا گئی
پانی وہ صاف صاف جو بل کھاتے جاتے تھے　　پارے کے سانپ گھاس پہ لہراتے جاتے تھے

سورج نے سر نکالا یکایک پہاڑ پر — بولا جوان شیر کی صورت دہاڑ کر
آرام کی نہیں ہے یہ جا ہاں چلے چلو

تبدیل جبکہ دھوپ سے رنگِ سحر ہوا — اک مدرسے کے آگے سے اس کا گزر ہوا
تھا پاس اک خزانۂ مسجد پڑا ہوا — مُلّا تھا اُس میں برسرِ منبر چڑھا ہوا
تھا ہر طرف کو دامنِ تقریر کھینچتا — اور دوزخ و بہشت کی تصویر کھینچتا
حور و قصور پہ تھا دلوں کو لبھا رہا — دوزخ دکھا کے خلقِ خدا کو ڈرا رہا
تھے لوگ اس کی باتوں پہ مدہوش ہو رہے — اور معتقد تھے سب ہمہ تن گوش ہو رہے
دیکھا جو نوجوان کو اُس مردِ پیر نے — اپنی لکیر پیٹی پرانے فقیر نے
یعنی کہ آؤ خلد کا نقشہ دکھائیں ہم — بیٹھو کہ تم کو عرش کے اوپر اڑائیں ہم
بولا جواں کہ اب وہ زمانے گزر گئے — وہ رات ہو چکی وہ فسانے گزر گئے
اور سب سے پھر اشارہ کیا ہاں بڑھے چلو

ملکِ فنا اگرچہ بہت بے ثبات ہے — بے پاؤں بے مدار ہے جو اِس کی بات ہے
لیکن بجا کہا جو کسی نے کہا ہے یہ — ہمت کے مرکبوں کیلئے خوب جا ہے یہ
پر دیکھتا جو ہوں تو یہاں طرفہ حال ہے — مطلق ادھر نہیں کوئی کرتا خیال ہے
دن رات ہے امیروں کو آرام سے غرض — ساقی سے مدعا ہے و یا جام سے غرض
باقی فلک زدوں کا تو پھر کیا ٹھکانا ہے — افلاس اُن کے واسطے پہلا بہانہ ہے
اور جو کہ رکھتے ہمت و غیرت سے کام ہیں — محنت سے پیٹ پال رہے صبح شام ہیں
لڑکے وظیفوں پر ہیں سبق یاد کر رہے — تنخواہوں پر ہیں محنتیں اُستاد کر رہے
پھرتے فقیر مانگتے در در ہیں صُبح و شام — کہتے ہیں بار بار کہ دے جا خدا کے نام
آزاد کی یہی ہے صدا ہاں بڑھے چلو

خسروِ امن کا دربار

مَیں کہ آشوبِ جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت — امن کو سمجھا غنیمت دلِ غم دیدہ بہت
شوقِ دل لے کے غرض قصر میں آیا مجھ کو — پر عجب عالمِ نیرنگ دکھایا مجھ کو
خسروِ امن تھا واں جلوہ فزائے دربار — دیتی فرحت تھی دل و جاں کو ہوائے دربار
اُس کے آگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا — آپ تھا پھولوں کے جھولوں میں پڑا جھول رہا

نیند کا جھوکا تھا جھولے کو جھلاتا جاتا   سورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا
گلِ خورشید تھا واں ہر گلِ شاداب سدا   دھوپ کی جا تھی مگر چادرِ مہتاب سدا
صبح دن رات کھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں   نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں
ہاتھ باندھے تھیں مرادیں وہاں ہر دم آگے   آرزوئیں تھیں کھڑی ناچتیں چھم چھم آگے
دولت و عیش و طرب تھے امرائے دربار   کرتے تھے نظم و نسق جملہ برائے دربار
دل میں افکار پریشاں کا نہ تھا نام وہاں   ہاتھ جمعیتِ خاطر کے تھے سب کام وہاں
مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب چھائے ہوئے   دامنِ امن وہاں خلق پہ پھیلائے ہوئے

شغل میں اپنے ہر اک شخص تھا مشغول وہاں
چنتا تھا راحت و آرام کے پھل پھول وہاں

غزلیات

چمن میں جا کے کبھی خوش اپنا جی نہیں ہوتا   یہ غنچہ وہ ہے کہ جو گل کبھی نہیں ہوتا
سُنے گا دیکھنا درد کی آواز اک جہاں میری   تمہارے عشق کی ہے داستاں اور ہے زباں میری

محمد شبلی نام اور شبلی تخلّص تھا۔ اور اسی وجہ سے عام طور پر مولانا شبلی مشہور تھے ۱۸۵۷ء میں بندول نامی ایک گاؤں میں جو اعظم گڑھ کے ضلع میں واقع ہے پیدا ہوئے۔ اوّل فارسی نصاب کی تکمیل کی بعدہٗ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی سے نصابِ عربی کی متوسطات سے انتہا تک تعلیم حاصل کی۔ اُنیس برس کی عمر میں سفرِ حجاز کیا۔ اور حج کرکے واپس آئے۔ مولانا فطری شاعر تھے اُردو فارسی میں شعر موزوں فرماتے تھے۔ پیامِ یار اور اودھ پنچ کا عنوانِ شباب تھا۔ پیامِ یار کی غزلیں اور اودھ پنچ کی نظمیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اور زبان کے مزے لیتے تھے۔ وکالت کا امتحان دے کر وکالت شروع کی لیکن طبیعت اس طرف مائل نہ تھی۔ وکالت چھوڑ کر امین دیوانی ہو گئے بعدہٗ علی گڑھ کالج میں پروفیسر ہوئے۔ چنانچہ آپ نے کئی چھوٹے چھوٹے تاریخی رسالے لکھے۔ اور ایک مثنوی صبحِ اُمید کہی پھر المامون اور دیگر کتب تصنیف فرمائیں۔ ۱۸۹۸ء میں کالج کی پروفیسری سے سولہ سال کی خدمت کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ چندے حیدرآباد میں قیام کیا۔ اور علوم و فنون کی نظامت اپنے ہاتھوں میں لی ۱۹۱۴ء میں انتقال فرمایا۔

کلام پر تبصرہ

مولانا زیادہ تر مصنّف کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ فارسی کی غزلیں بہت اچھی ہیں زبان شیریں اور مضامین عالی ہیں لیکن ہم کو آپ کے اُردو کلام سے بحث ہے۔ مثنوی صبحِ اُمید جو ۱۸۸۶ء کی چھپی ہوئی ہے۔ ہماری نظر سے گزری۔ اس مثنوی میں مولانا شبلی نے گلزارِ نسیم کی بحر اختیار کی ہے۔ اور صنائع و بدائع بھی اُسی کے تتبع میں داخلِ شعر کئے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام؟   جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جانِ تھی جہاں کی   جو تاج تھی فرقِ آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال   کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال

گل کر دئے تھے چراغ جس نے ۔۔۔ قیصر کو دئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر ۔۔۔ ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اُڑا دئے تھے ۔۔۔ اٹلی کو کنوئیں جھنکا دئے تھے
با ایں ہمہ جاہ و شوکت و فر ۔۔۔ اقلیمِ ہنر بھی تھا مسخر
ہیئت میں بلند پایہ اُس کا ۔۔۔ تھا فلسفہ زیرِ سایہ اُس کا
منطق میں ہوا جو گرم جولاں ۔۔۔ تھامے تھے رکاب مصر و یوناں
میدانِ سخن جو روبرو تھا ۔۔۔ فارس کی زباں پہ طرّ تو اتھا
جو فلسفیانِ ہند و چیں تھے ۔۔۔ خرمن سے اُسی کے خوشہ چیں تھے
یہ قوم کہ تاجِ آسماں تھی ۔۔۔ اب کوئی گھڑی کی میہماں تھی

الغرض یہ مثنوی "قومیات" کے متعلق ہے۔ مولانا حالی کی طرح پہلے اپنی قوم کی فضیلت و علمیت ظاہر کی ہے۔ اور بعد میں اُس کی نکبت اور جہالت کا رونا رویا ہے۔ آخر میں سر سید اور اُن کے کالج کی تعریف میں رطب اللسانی کو کام میں لائے ہیں۔ اور مسلمانانِ ہند کو سر سید کا ہاتھ بٹانے کی طرف توجہ دلائی ہے

اس مثنوی میں زبان کی صفائی پائی جاتی ہے۔ اور تشبیہات و استعارات بکثرت ہیں۔ رعایتِ لفظی کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ تاہم مضامین خوب پیدا کئے ہیں۔ چند اشعار جستہ جستہ مقامات سے یہاں نقل کرتا ہوں:۔

دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں " ۔۔۔ آیا نظر ایک پیرِ دیریں "
وہ ملک پہ جان دینے والا ۔۔۔ وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
وہ کشتۂ قوم وہ فدائی ۔۔۔ اُٹھا لئے کاسۂ گدائی
اک اک سے عرضِ حال کرتا ۔۔۔ در در وہ پھرا سوال کرتا
خود قوم کو ہو گئی تھی یہ کد ۔۔۔ زندیق کہا کسی نے مرتد
وہ مسندِ عدالت و داد ۔۔۔ یعنی وہ نبیرۂ مصطفیٰ باد
وہ صاحبِ سیرتِ رضیہ ۔۔۔ دستورِ کبیرِ آصفیہ
قائم ہوًا یادگارِ ایّام ۔۔۔ وہ مدرسۃ العلوم اسلام
ناطے شدہ منزلِ طلب ہے ۔۔۔ اُمید ہنوز تشنہ لب ہے

سیّد سے اگر ہے بُغضِ للّٰہ　　وہ خادمِ قوم اگر ہے گمراہ
کچھ آپ ہی انتظام کرتے　　اسلام کو نیک نام کرتے
اے مدعیانِ حُبِّ اسلام　　حجروں میں تو اب کرو نہ آرام
دعوے ہیں، تو کچھ ہنر دکھاؤ　　ہمّت کے قدم ذرا بڑھاؤ
گو خوار ہیں طرز و خو وہی ہے　　مُرجھا گئے پھول، بُو وہی ہے
تھا لارڈ لٹن جو صدرِ محفل　　فرزانہ، ہوشمند و عاقل
بنیاد کے سنگِ اوّلیں کو　　رکھّا تو کہا کہ "اے عزیزو!
گو سرورِ انجمن ہے یورپ　　سرچشمۂ علم و فن ہے یورپ
با ایں ہمہ جاہ و شوکت وفر　　ہے اہلِ عرب کا سایہ پرور
سیکھے ہیں اصولِ فن انہیں سے　　لی ہے روشِ سخن انہیں سے
ہوں آج جو میں شریکِ محضر　　رکھتا ہوں جو اس بنا کا پتھر
مقصود یہ ہے، یہ چاہتا ہوں　　اُس حق سے کسی قدر ادا ہوں
خالق سے دُعا ہے اب کہ جاوید　　روشن رہے یہ چراغِ اُمید
ذرّہ ہے تو مہرِ آسماں ہو!　　قطرہ ہے تو بحرِ بیکراں ہو!"

یہ مثنوی تقریباً چار سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اور پڑھنے کے لائق ہے۔

مثنوی کے علاوہ مولانا شبلی نے بعض تاریخی اور سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں جن کی دلکشی مسلّم ہے اگرچہ مولانا نے بہت کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے۔ بہت خوب لکھا ہے۔ صفائی زبان کے علاوہ الفاظ کا انتخاب بھی نفاست کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جذبات کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔ واقعی درد بھرے دل سے جو کچھ نکلتا ہے۔ وہ تاثیر پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا آپ کی نظموں میں جاذبیت اور رعنائی خیال دونوں باتیں ہیں۔

ہمارا طرزِ حکومت

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر　　مگر وہ حکمرانی جس کا سکّہ جان و دل پر تھا
قرابت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہی　　کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرماں وہ جے پور نے نسبت کی خواہش کی　　اگرچہ آپ بھی وہ صاحبِ دیہیم و افسر تھا
ولی عہدِ حکومت اور خود شاہنشہِ اکبر　　گئے امبیر تک جو تخت گاہِ ملک و کشور تھا

اُدھر راجہ کی نورِ دیدہ گھر میں جلوہ آرا تھی — اِدھر شہزادہ پہ چترِ عروسی سایہ گستر تھا
دُلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے — کہ کوسوں تک زمیں پر فرشِ دیبا سے مشجر تھا
دُلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پہ جو لائے تھے — وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابنِ اکبر تھا
یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطرِ محبت کی — کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کُش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

شہر آشوب اسلام

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک — چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے — فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے — اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے — یہ سیر ان کو دکھائے گا شہیدِ نیم جاں کب تک

یہ ہیں وہ نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی تھی
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیمِ ناتواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے اُستادو — یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ جوشِ انگیزیِ طوفانِ بیداد و بلا تا کے — یہ لطف اندوزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے — ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی — تو ہم تم کو دکھائیں زخمہائے خوں چکاں کب تک
یہ مانا گرمیِ محفل کے ساماں چاہییں تم کو — دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے — سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا — ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک
عروسِ بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں — ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زر فشاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہم ہیں
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرعِ ملت ہے — عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے — تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے — تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگِ اذاں کب تک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی — چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک
کہیں اڑ کر یہ دامانِ حرم کو بھی نہ چھو آئے — غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہیں اب کیا کہ دامنگیر ہے ہندوستاں کب تک

عدلِ جہانگیری

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر — ایک دن نورجہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہگیر ادھر آ نکلا — گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرتِ حسن سے بیگم نے طمنچہ مارا — خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہِ جہانگیر کو پہنچی جو خبر — غیظ میں آ گئے ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی — جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوتِ حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا — میری جانب سے کرو عرض بآئینِ حسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں — مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن
اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک — کشورِ حسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن

مفتیِ دیں سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا — کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن
مفتیِ دیں نے یہ بے خوف و خطر صاف کہا — شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اٹھے — پر جہانگیر کی ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن

نوکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر　　پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن

پھر اسی طرح اُسے کھینچ کے باہر لائیں　　اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن

یہ وہی نورجہاں ہے کہ حقیقت میں یہی　　تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن

اُس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ　　جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

اب نہ وہ نورجہاں ہے نہ وہ اندازِ غرور　　نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن

ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع　　ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام　　خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن

مفتیٔ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا　　بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ و زن

وارثوں کو جو دئے لاکھ درم بیگم نے　　سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہِ زمن

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص　　قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ہو چکا جبکہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں　　کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن

اُٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم　　تھی جہاں نورجہاں معتکفِ بیت الحزن

دفعۃً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا　　تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

قطعہ

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی　　مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم　　خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اسمٰعیل

مولوی محمد اسمٰعیل نام اور وطن میرٹھ ہے۔ آبا و اجداد لاہور کے رہنے والے تھے جنہوں نے ترکِ سکونت کر کے میرٹھ میں توطن اختیار کیا۔ تاریخ پیدائش ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء ہے۔ عربی کی معمولی لیکن فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ ابھی سولہ سال ہی کی عمر تھی کہ سررشتۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ پہلے دفتر میں کام کیا۔ بعد ازاں مولوی کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اول سہارنپور پھر میرٹھ میں مدت تک رہ کر ۱۸۶۷ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہو گئے۔ چنانچہ اردو ریڈروں کی تصنیف قیام آگرہ کے زمانے میں ۱۸۹۳ء کے درمیان کی۔ تقریباً بارہ سال آگرہ میں مدرس فارسی کے عہدہ پر مامور رہ کر ۱۸۹۹ء میں پنشن پائی۔ اور اپنے وطن مالوف میرٹھ میں واپس آ کر قیام اختیار کیا۔

آپ کو تصوف کا بھی ذوق تھا۔ اور حضرت غوث علی شاہ پانی پتی قدس سرہ العزیز کے مریدانِ خاص میں تھے۔ ایک ترجیع بند فراقِ شیخ میں خوب لکھا ہے۔

مرحوم کا یہ بھی ارادہ تھا کہ لغاتِ اردو کی ترتیب اور قواعد اردو کی تکمیل جدید طرز پر اپنی حیات میں کر جائیں۔ چنانچہ ان کے مسودات ان کے ورثا کے پاس محفوظ ہیں۔ لیکن اب کوئی ان کا ایسا جانشین نہیں ہے جو اس ناتمام کام کو تکمیل کر دے۔

آخیر عمر میں آپ کی علمی خدمت یہ تھی کہ نواب محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم آنریری سیکرٹری ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کی فرمائش پر حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی تنقید اور ان کی سوانح عمری نہایت مدلل مستند کتب و تواریخ سے مرتب کر رہے تھے۔ تا تنقید مثنوی قران السعدین کامل ہو چکی تھی کہ پیامِ اجل آ پہنچا۔ چنانچہ چھہتر سال کی عمر میں یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو اپنے وطن میں رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے اور بیرون باجیت دروازہ مدفون ہوئے۔

راقم خاکسار کو اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف ہوتا رہتا تھا۔ اور اکثر اردو ادب کے متعلق گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ آپ کی وفات سے ایک دو سال قبل میں میرٹھ سے باہر چلا گیا تھا اتفاقاً آنا ہوا۔ اس وقت آپ کی حالت بہت نازک تھی۔ لیکن مرحوم کو جب یہ علم ہوا کہ میں

حاضرِ خدمت ہوں تو بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اور میری حاضری پر اظہارِ مسرت کیا۔ آہ!

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

کلام پر تبصرہ

آپ کا کلام کلیاتِ اسمٰعیل کے نام سے ۱۹۱۰ء میں نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا تھا جملہ اصنافِ سخن میں آپ نے طبع آزمائی فرمائی ہے اور حق یہ ہے کہ زبان کی سادگی، شیرینی اور خیالات کی عمدگی کے لحاظ سے آپ کا کلام بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ اکثر نظمیں تو وہی ہیں جن کو بچے مدارس میں اپنی درسی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اور حفظ یاد کر لیتے تھے۔ اُن بے شمار بچوں میں سے ایک بچہ میں بھی ہوں جس کو مولانا کے اکثر اشعار زبانی یاد تھے اور لے کے ساتھ پڑھتا تھا۔ زمانہ کی نیرنگی دیکھئے کہ آج مجھے مرحوم کے کلام کی تنقید سپرد ہوتی ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ اِدھر بارش ختم ہوئی۔ اُدھر بے ساختہ میری زبان سے یہ شعر نکلے۔

گھٹا آن کر مینہ جو برسا گئی | تو بے جان مٹی میں جان آگئی
یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا | کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا
جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا | وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا
ہزاروں پھدکنے لگے جانور | نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر

دوسرا وقت وہ آیا کہ مصنف کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا اور گھنٹوں صحبت رہا کرتی تھی۔ الفاظ کی تحقیق کا سلسلہ نا متناہی تھا۔ ایک مرتبہ میں نے واشنگٹن ارونگ کا مضمون "فن کتاب نویسی" اردو میں ترجمہ کیا۔ مولانا کو سنایا، بہت محظوظ ہوتے۔ فرمایا کہ اسے کسی رسالہ میں چھپوا دو گے۔ میں نے عرض کیا کہ ادیب الہ آباد کا تقاضا ہے۔ اس کو بھیجوں گا۔ کہنے لگے کہ اس سے کم از کم بیس روپیہ اس کا معاوضہ لینا۔ میں نے عرض کیا کہ اردو کے رسالے اور معاوضہ! افسوس کے ساتھ فرمایا کہ واقعی ہمارے علم و ادب کی نہایت بے قدری ہے کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔

گل رعنا میں آپ کے کلام کی نسبت یہ الفاظ درج ہیں "اردو زبان کی نظم و نثر میں خواہ وہ عاشقانہ رنگ میں ہو یا تمدنی و اخلاقی و سیاسی ہو۔ قدیم و جدید ہر ایک طرز میں بلند پایہ رکھتے تھے"

جہاں تک قدیم رنگِ تغزل کا تعلق ہے میری ناچیز رائے میں مولانا کسی خاص درجہ کے مستحق نہیں

لہ یہ مضمون مع دیگر مضامین "خیالاتِ ارونگ" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ تنہا

ہیں۔ یہ امر ضرور قابلِ تعریف ہے۔ کہ انہوں نے داغ کا رنگِ تغزّل اختیار نہیں کیا۔ بلکہ غالب و مومن کی تقلید کی۔ معیار بلند رکھا۔ رکاکت و سخافت سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں کیا۔ بعض بعض اشعار بہت اچھے ہیں لیکن عام طور پر کوئی ایسی وجہِ امتیاز نہیں کہ آپ کا شمار اول درجہ کے شعراء میں کیا جائے۔

آپ مثنوی خوب لکھتے ہیں۔ بچوں کی نظمیں لکھنے میں یدِطولیٰ حاصل ہے جس صنفِ کلام پر قلم اُٹھایا ہے اُس کو خوب نبھایا ہے۔ کلام میں پختگی ہے۔ خیالات سیدھے سادے اور صاف ہیں۔ آپ کسی خاص طرز کے مالک نہیں ہیں۔ زیادہ تر حالی کے رنگ میں نظمیں لکھی ہیں۔ بہرحال جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے نتائج بھی اخذ کئے ہیں۔ بے ٹھکانے کوئی بات نہیں کہی۔ ایک مثمن قلعۂ اکبرآباد کی کیفیت میں "آثارِ سلف" کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے۔ آپ نے جہاں اسلاف کی تعریف میں رطب اللسانی کی ہے۔ وہاں یہ بھی ارشاد ہوا ہے۔

وہ کعبۂ مقصود تھے یا قبلۂ حاجات — کس منہ سے بزرگوں پہ کریں فخر و مباہات
سر اپنے گریباں میں ذرا ڈالئے ہیہات — اوصافِ اضافی سے نہیں کچھ شرفِ ذات
تلوار میں جب کوئی اصالت کی نہ ہو بات — گاہک تو نہ پوچھے گا کہ کس کان کی ہے دھات

بندوق دمِ صید گر اچھی نہ چلی ہو
مردود ہے گو لندن و پیرس میں ڈھلی ہو

اور یہ نصیحت بھی کی ہے:—

بلخار کردہ علم کے میدان میں عزیزو — آخر تو ہو تم قومِ مسلماں میں عزیزو

آپ کے کلام میں صنفِ مثنوی کو نسبتاً زیادہ جگہ مل گئی ہے۔ اور انصاف یہ ہے۔ کہ آپ مثنوی خوب کہتے ہیں۔ رواں اور دلکش بحور انتخاب کی ہیں۔ مضامین بلند ہیں۔ وہ نظمیں غیر مقفّیٰ بھی لکھی ہیں۔ جو قبولیت کے تاج سے مزین ہیں۔ لیکن ان میں بعض کھٹکے ایسے ہیں۔ جو ناگوار طبع ہوتے ہیں۔ مثلاً

جو ہیں آفتابِ تاباں نے چھپایا اپنا چہرہ

یہاں "نقطہ" نے۔ پہلے مصرع میں آتا تو بھلا معلوم ہوتا۔ اور پہلے مصرع کی ترکیب بدل دینی چاہئے تھی۔

اسی طرح:—

"انہیں ہوسناک موجوں" "سے مقابلہ ہے کرنا"

دوسرے مصرع کا سے پہلے مصرع میں آنا چاہئے۔ اس سے شاعر کا عجز ظاہر ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ کلام پہ کافی قدرت حاصل نہیں ہے۔ جب نظم بے قافیہ لکھی جاتی ہے تو ایک بہت بڑی پابندی سے آزادی مل جاتی ہے۔ اس پر بھی اگر مصرعے ادھورے ہوں اور ایک مطلب کو جیسا کہ چاہئے ادا نہ کر سکتے ہوں۔ تو نظم بے قافیہ کہ ہاتھ نہ لگانا چاہئے۔ تاہم اردو میں سب سے پہلے آپ نے یہ نظمیں لکھی ہیں۔ اور ایک دو جگہ کو چھوڑ کر باقی کل نظم اچھی ہے۔ اس لئے یہ نظمیں قابلِ تعریف اور مستحقِ داد ہیں

ایک جگہ آپ نے زیادہ کو تزادہ باندھ دیا ہے

نقابِ جور میں روپوشں اک لطفِ نہاں نکلا   وہ میرے حال پہ مجھ سے بھی زادہ مہرباں نکلا

حسبِ ذیل اور کا اس طرح استعمال بھی آجکل متروک ہے:۔

کیا فکر آپ دناں اک غم کہہ رہا ہے اب   موجود ہوں ضیافتِ دل اور جگر کو میں

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ میں دل اور جگر کی ضیافت کے لئے موجود ہوں۔ ایسی ترکیب اضافی کہ جہاں صرف واؤ جائز ہو سکتی تھی۔ ہرگز اور کو نہیں لا سکتے یعنی ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ضیافتِ دل و جگر کو میں موجود ہوں۔ یہاں دل اور جگر کہنا سراسر غلط ہے۔

نمونۂ کلام کے لئے کلیاتِ اسمٰعیل سے حسبِ ذیل اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

شمعِ ہستی

اے شمعِ ہستی! اے زندگانی   بھاتی ہے دل کو تیری کہانی
ہے کوچ تیرا ہر لحظہ جاری   جاتی ہے بگٹٹ تیری سواری
بجلی سے بڑھ کر بے تاب ہے تو   یا واہمہ ہے یا خواب ہے تو
کیوں چھپ چھپاتی ہر دم رواں ہے؟   آتی کہاں سے جاتی کہاں ہے
ظاہر ہیں یوں تو سب پر ترے گن   لیکن نہ پایا تیرا سرِ بن
گزرا نہ کوئی اس ہفت خواں سے   جاہل ہیں تیرے سرِ نہاں سے
فی الجملہ ہمت سب ہار بیٹھے   ہیں سر بزانو ناچار بیٹھے
اے زندگانی! اے شمعِ ہستی   سونی پڑی تھی تجھ بن یہ بستی
چاروں طرف تھی چھائی اندھیری   ناگاہ اٹھی اک ڈیک تیری
وہ ڈیک تھی بس نورٌ علیٰ نور   کا ہے کو رہتی پردہ میں مستور

پھولوں میں جھلکی تاروں میں چمکی "
ہوتا نہ یاں جو تیرا ٹھکانا
کیا پھونک ماری دنیا کے تن میں
بزم جہاں میں رونق ہے تجھ سے
ہے تیرے دم سے اسے عالم آرا!
سرگرم ہے تو جادوگری میں
مٹی کا جوبن تو نے نکھارا
ہے جس کو بخشا احساس تو نے
تھی بھولی بھالی بھونڈی بھنگم
زینت سے تیرے سانچے میں ڈھل کر
ٹھکرا کے تو نے جب کہہ دیا "قم"
پھولی ہے اپنی اوقات پھسلی
باقی ہے خلقت جب تیری آہٹ
بجتا ہے پھر تو ادھم غضب کا
کہتی ہے دنیا تو ہے تو کیا غم
جیتے ہیں جب تک مرتے ہیں تجھ پر
کیا مال ہے جو تیرے سوا ہے
اے سب کی پیاری، سب کی چہیتی
قدرت کے گھر کی ہیں لاڈلی ہوں
تقویم احسن میرا لگن تھا
حور و ملک کی آبادیاں تھیں
چلتی تھی ہر دم باد بہاری
میری ادا پہ مرتے تھے قدسی
تکریم میری ہوتی تھی از حد
پھر بس چھوٹا گذری سو جھیلی

بخشی جہاں کو رونق ارم کی
چوپٹ ہی رہتا یہ کارخانہ
گویا لگا دی دوں خشک بن میں
اس میکدہ میں ہو، حق ہے تجھ سے
بزم عروسی آفاق سارا
ہیں تیرے عشوے خشکی تری میں
دستہ دے کے چھینٹے اُس کو ابھارا
دی مشتِ گِل کو بو باس تو نے
تو نے سکھایا اُس کو خم و چم
کندن سی ہلکی رنگت بدل کر
اٹھ بیٹھی فوراً کرتی تبسم
پھرتی ہے خوش خوش کیا البلی گہلی
ہوتی ہے پیدا اک گدگداہٹ
بجتا ہے ڈنکا عیش و طرب کا
تو آئے نت نت تو آئے چھم چھم
سب کچھ تصدق کرتے ہیں تجھ پر
تو ہی نہ ہو تو سب پردھنا ہے
کہہ منہ زبانی کچھ آپ بیتی
ناز و نعم سے برسوں پلی ہوں
فردوس اعلیٰ میرا وطن تھا
بے فکریاں تھیں آزادیاں تھیں
شیر و عسل کی نہریں تھیں جاری
سجادہ پہ سجدہ کرتے تھے قدسی
ہیں داستانیں جس کی زباں زد
پردیسیوں کا اللہ بیلی

پل مارنے کا ہے یاں بسیرا　　حبِّ وطن ہے ایمان میرا
آب و ہوا میں دشت و جبل میں　　میری رسائی ہے ہر محل میں
لیکن یہاں میں خلوت نشیں ہوں　　ہوں اس طرح پر گویا نہیں ہوں
خوابِ گراں کی حالت ہے طاری　　مستی میں گم ہے سب ہوشیاری
جب آتے آتے سبزہ میں آئی　　کروٹ بدل کر میں لہلہائی
انگڑائیاں لیں منہ کھول ڈالا　　پر آنکھ سے کچھ دیکھا نہ بھالا
داخل ہوئی جب حیواں کے تن میں　　اک شور اُٹھا اس انجمن میں
انساں کا جامہ جب میں نے پہنا　　اللہ رے میں کیسا میرا کہنا
کس کس جتن سے میں نے بنایا　　رتبہ بہ رتبہ پایہ بہ پایہ
جامد کو نامی، نامی کو حیواں　　حیواں کو وحشی، وحشی کو انساں
پھیلایا میں نے کیسا بکھیڑا　　شادی و غم کے ارگن کو چھیڑا
نیکی بدی کے میلے جمائے　　جھوٹ اور سچ کے سکے چلائے
جو ناچ میں نے جس کو سکھایا　　وہ ناچتے ہی اس کو بن آیا
القصہ ہوں میں وہ اسمِ اعظم　　ہے جس کے بس میں تسخیرِ عالم
کچھ کچھ کھلے ہیں انداز میرے　　دیکھے ہیں کس نے اعجاز میرے
مجھ کو نہ سمجھو تم آج کل کی　　ہوں موجِ مضطر بحرِ ازل کی
رکھوں گی جاری یونہی سفر میں　　قعرِ ابد کی لوں گی خبر میں
ہے میری ہستی اک طرفہ مضموں　　کچھ بھی نہیں ہوں پر میں ہی میں ہوں
سنتے رہو گے میری کہانی　　جب تک ہے باقی دنیائے فانی

غزلیات

جرم بھی اور خیرگی! یہ سیرتِ ابلیس ہے　　ابنِ آدم کو ہے شایاں عذر ہی تقصیر کا
میرے سوا حریفِ ستم کوئی بھی نہ تھا　　اب مہرباں ہو گئے یہ کیا غضب ہوا
کھولا ہے مجھ پہ سرِ حقیقت مجاز نے　　یہ پختگی صلہ ہے خیالاتِ خام کا

یا آنکھ اٹھا کے چشمِ فسوں ساز کو نہ دیکھ
یا عمر بھر مصائبِ دورِ زماں اٹھا

آغازِ عشق عمر کا انجام ہو گیا
ناکامیوں کے غم میں مرا کام ہو گیا

خبر بھی ہے آدم سے جنت چھٹی کیوں
خلافِ جبلت تھا بیکار رہنا

حجابِ شاہدِ مطلق نہ اٹھا ہے نہ اٹھے گا
جسے ہم لامکاں سمجھے تھے وہ بھی اک مکاں نکلا

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو تم سے کوئی کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

جہاں تیغِ ہمت قلم دیکھتے ہیں "
محالات کا سرِ تسلیم دیکھتے ہیں

اتنا تو جانتے ہیں کہ بندے خدا کے ہیں
آگے تو اس کے ہم خردِ نارسا کے ہیں

دوستی اور کسی غرض کے لئے
وہ تجارت ہے دوستی ہی نہیں

دولت دیکھی اس کی جن قوموں نے وہ کافر بنیں
رخ نظر آیا جنہیں وہ سب مسلماں ہو گئیں

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں
ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں

فکرِ افشائے راز کیوں نہ کروں
کیا عیاں تیز ہے نظر دیکھو

بلبل کے دل میں داغِ وداعِ بہار ہے
یارب کوئی فریفتۂ رنگ و بو نہ ہو

گاہک ہی نہ ہو کوئی تو ہے عرضِ ہنر ہیچ
اے وائے گلِ تازہ جو صحرا میں کھلا ہو

پھر کچھ کچھ ان کے وعدہ پہ اب اعتبار ہے
مایوس مر گیا پھر دلِ امیدوار ہے

ابنائے روزگار میں ایسا بھی کوئی ہے
جس نے حقوقِ صحبتِ یاراں ادا کئے

محسن

محمد محسن نام اور محسن تخلص تھا۔ قصبہ کاکوری نواح لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ نسباً سید علوی ہیں۔ ہمارے دوست مولوی ظفر الملک علوی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور غالباً کسی رشتہ سے کچھ ان کے بزرگ ہوں گے۔ حضرت محسن ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر سے اپنے جدِ بزرگوار مولوی حسین بخش شہید کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی۔ نو سال کی عمر تھی۔ شب کو اپنے جدِ امجد کے پہلو میں سوتے تھے۔ خواب میں زیارتِ جمال مبارک حضرت محبوب خدا سے مشرف ہوئے۔ عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ بہم پہنچائی۔ ابتدا میں مولوی ہادی علی اشک کو اپنا کلام دکھایا۔ ان کی وفات کے بعد پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ مین پوری میں چند روز عہدۂ نظارت پر کام کیا۔ پھر وکالت ہائیکورٹ کا امتحان پاس کرکے صدر دیوانی عدالت آگرہ میں کام شروع کردیا۔ ایک مرتبہ صدر دیوانی کے حکام نے بلا استمزاج مستقر آگرہ کا منصف مقرر کردیا لیکن وکالت کی دن دونی رات چوگنی ترقی نے اس عہدہ کو منظور نہ کرنے دیا۔ اور اس کو آزادی میں خلل انداز سمجھا۔ ۲۴ر اپریل ۱۹۰۵ء مطابق ۱۸ر صفر ۱۳۲۳ھ بعارضہ اسہال کبدی انتقال فرمایا۔ اکیاسی سال کی عمر پائی۔ مولوی حکیم الدین نائب وزیر ریاست بھوپال نے بےمثل مادۂ تاریخ لکھا۔ "ادخلہ الملک فی الفردوس"، اور منشی زین العابدین فرجاد میرٹھی نے آیتِ قرآن شریف سے مادہ تاریخ نکالا "انہ فی الآخرۃ لمن الصالحین"۔ بمقام مین پوری دفن ہوئے۔ اطاعتِ والدین میں بے نظیر تھے۔ ہر شخص سے بکشادہ پیشانی ملتے تھے۔ بلا تفریق مذہب و ملت ہر شخص کے درد و دکھ میں شریک ہوتے تھے۔ انکسار اور عیب پوشی اُن کا خاص جوہر تھا۔ پرانی وضع پر قائم تھے۔ احباب و اعزہ بلکہ غائبانہ دوستوں کی اعانت قرض دے کر کرتے تھے۔ اور اس کو مخفی رکھتے تھے۔

کلام پر تبصرہ

حضرت محسن نعت گو مشہور ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انہوں نے نعت کے سوا کچھ اور

لکھا بھی نہیں۔ اگر کچھ اور لکھا ہے۔ تو وہ بھی نہ لکھنے ہی کی برابر ہے۔ پہلے ہم اُن کے فرزند رشید مولوی نور الحسن صاحب نور اللغات کی رائے پیش کرتے ہیں :-

"وہ مضمون نکالتے تھے۔ قرآن پاک اور حدیث شریف سے اور اُس کو مذاقِ شاعرانہ میں اس خوش اسلوبی سے کھپاتے تھے۔ کہ سامعین ادب سے سنتے اور درود کے نعرے بلند کرتے ہیں اُن کے قادر الکلام ہونے کا بین ثبوت اور قوی دلیل یہ ہے۔ کہ بیانِ حکایت میں شاعرانہ شوخی حدودِ تہذیب و متانت سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتی ہے۔ اور مبالغے کے استعارات صلاحیت کا جوہر اپنے ساتھ لئے رہتے ہیں۔ جہاں کوئی امر مناسب موقع ہے۔ اور حدیث شریف میں اس کی تصریح نہیں ہے۔ تو اس انداز سے لکھتے ہیں۔ کہ پڑھنے والے کو صاف تمیز ہو جاتی ہے۔ کہ اس قدر مضمون جزوِ حدیث نہیں ہے۔ بلکہ کلام بزبانِ حال ہے۔ اُن کی سدا بہار طبیعت حسرت و یاس کے مضامین سے الگ رہتی ہے شگفتگی طبع اور زندہ دلی کی بدولت روشنی ہر بیان میں اپنی چمک دکھاتی ہے۔ مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کی شان و شکوہ۔ بندش کی چستی اُن کا خاصۂ طبیعت ہے۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ مثنوی تجلی و چراغ کعبہ میں بھی قصائد کا لطف پایا جاتا ہے تشبیب و گریز لکھنا اُن کا حصہ تھا۔ خاتمہ و مناجات میں وہ طرزِ خاص کے موجد تھے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ بوجہ دقتِ مضامین و بلندیٔ خیالات و تلمیحات نقد طلب ان کا کلام کم استعداد حضرات کی سمجھ سے باہر ہے۔ لیکن بندشِ الفاظ کا اثر سمجھو یا قبولیتِ عام کا نتیجہ کہ سخن فہم و نافہم دونوں لطف حاصل کرتے ہیں اور داد دیتے ہیں۔"

نعت میں جناب شہیدی کا قصیدہ مقبولِ خاص و عام ہے۔ ہم اُن کے ذکر خیر کے تحت میں چند اشعار لکھ چکے ہیں۔ اور ہمارا یہ خیال تھا کہ اُن کے بعد اس بحر میں کوئی کیا قصیدہ کہے گا۔ لیکن نہیں حضرتِ محسن نے اِسی بحر میں قصیدہ لکھا اور خوب لکھا۔ حضرتِ محسن کے کلام میں صنائع و بدائع لفظی و معنوی بکثرت ہیں۔ یہ شاید اُس زمانہ کا اثر ہے۔ ورنہ ہمارے نزدیک شعر و سخن کی دوشیزہ اِس زیورِ صنعت کے بغیر خود اپنے ذاتی حسن کی وجہ سے سادہ لباس میں زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اِس عروسِ سخن کو سادگی سے آراستہ کرنا ہر مشاطۂ سخن کا کام نہیں ہے۔ یہ بات بڑی جگر کاوی اور عرق ریزی سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ سادگی ایسے کلام میں پیدا ہوتی ہے۔ جو سہل ممتنع ہو اولاً تو نہ ہو۔ لیکن معانی کی جان ہو۔

محسن کاکوروی فرماتے ہیں :-

مٹانا لوحِ دل سے نقشِ ناموسِ ابِ جد کا
دبستانِ محبت میں سبق تھا مجھ کو ابجد کا

لکھے رو رو کے مضموں بیکسی کے دشتِ غربت میں
زمینِ شعر پہ عالم ہوا دریا یہ آمد کا

جلائے کُن فکاں، روشن کیا آئینۂ عالم
سعادت ہے، شرف ہے، نیّرِ نورِ مجرد کا

سریرِ جاہ پہ فخر اُس کو دیہیمِ توکل سے
حریمِ ناز میں تکیہ خدا پہ اُس کی مسند کا

کھنچی ہے رحمتِ یزداں کی گویا شکلِ مستقبل[1]
تعالیٰ اللہ رنگِ عارضِ اُس نورِ مجرد کا

ق

سرِ تاکید منظورِ خدا ہے لامِ کاکل سے
ہوا اظہار دو ابرو سے اِک نونِ مشدّد کا

آخری دو شعروں کے مطلب کو شاید امیر مینائی کی تضمین واضح کر دے۔ لہٰذا ہم اُن کی تضمین بر قصیدۂ محسن سے صرف دو بند ذیل میں نقل کرتے ہیں :-

چمک میں ہے رُخِ روشن کہیں خورشید سے افضل
یہ نقشہ نقشِ ثانی اور نقشِ یوسفی اوّل
شبیہِ مصطفیٰ ہو کیوں نہ ہر مخلوق سے اکمل
کھنچی ہے رحمتِ یزداں کی گویا شکلِ مستقبل
تعالیٰ اللہ رنگِ عارضِ اُس نورِ مجرّد کا

نہیں گو کام عینِ عامِ رحمت کو تغافل سے
خصوصیت کی صاد آنکھیں ہیں گر دیکھو تامل سے
نہ دیکھیں کیوں گنہگاروں کو وہ چشمِ تفضل سے
سرِ تاکید منظورِ خدا ہے لامِ کاکل سے
ہوا اظہار دو ابرو سے اِک نونِ مشدّد کا

جنابِ محسن کے اِسی قصیدہ کے دو چار اشعار اور درج کرتا ہوں تاکہ اہلِ ذوق تشنہ نہ رہ جائیں :-

فلک اب کوکبِ دیدار کی جھاڑو اُٹھا رکھے
ملائک ڈھونڈتے پھرتے ہیں سُرمہ خاکِ مرقد کا

محمد مصطفیٰ پتلا ہے تو نورِ مجرّد کا
ہوا خورشیدِ اقلیمِ عدم سایہ ترے قد کا

کیا شیراز کو پامال اُردوئے معلّٰی نے
گیا مانِ اصفہاں لوہا مری تیغِ مہنّد کا

پڑا ہے طور کی چوٹی میں موبافِ زری بن کر
لکھا جو شعر وصفِ رشتۂ تابانِ محمد کا

زمینِ شعر پہ نازل ہے قرآنِ سخن مجھ سے
کتابِ آسماں اک نسخہ ہے لوحِ زبرجد کا

ستائش کے لئے تو واسطے تیرے ستائش ہے
کہ ہے مذکور قرآں میں ترے اوصافِ بےحد کا

فرشتے دیکھ کر مجھ کو کہیں دیوانِ محشر میں
جگہ خالی کرو مدّاح آتا ہے محمد کا

---

[1] پوری تصویر۔ علمِ معما کی رُو سے اِن اشعار سے لفظ لیرحمٰن ظاہر ہوتا ہے۔ پہلے شعر میں رحمت سے مستقبل (مضارع) کا صیغہ یرحم ہوتا ہے۔ دوسرے شعر میں یرحم کے شروع میں لام اضافہ کرکے نونِ مشدّد آخر میں پڑھا یا مطلب یہ ہوا کہ عارضِ انور سے لیرحمٰن ہویدا ہے۔ چنانچہ رسولِ مقبول صلعم کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے۔

آپ کی مثنوی صبحِ تجلی و چراغِ کعبہ دونوں مشہور و مقبول ہیں۔ آپ کے یہاں لکھنوی رنگ زیادہ ہے یعنی شعر کے ظاہری محاسن موجود ہیں۔ لیکن اُن کا مطلب عقیدتمندوں کے سوا دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتا۔ مگر حضرتِ حالی کی نعت دیکھئے جس سے غیر مسلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فرماتے ہیں:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا ۔ مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا ۔ وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا ۔ بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا ۔ قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا ۔ کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا ۔ پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

شاید یہ کہا جائے کہ یہ کوئی شاعری ہے۔ اس سادگی کے ساتھ ہر شخص لکھ سکتا ہے۔ لیکن
"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے"
جب لکھیں گے تو کلیجہ منہ کو آجائے گا۔ اور اس سے بہتر سادگی کے ساتھ اشعار سرانجام نہ ہو سکیں گے
ذیل میں حضرتِ محسن کے ایک مشہور قصیدہ کے بہتر اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:-

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل ۔ برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل ۔ جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی ۔ کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی ۔ ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
جانبِ قبلہ ہوئی ہے یورشِ ابرِ سیاہ ۔ کہیں پھر کعبہ میں قبضہ نہ کریں لات و ہبل
دہر کا ترسا بچہ برق لئے جل میں آگ ۔ ابر چوٹی کا برہمن ہے لئے آگ میں جل

ابرِ پنجاب تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم / برق، بنگالۂ ظلمت میں گورنر جنرل

نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی / پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل

دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن / سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل

راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں / تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

اب کے میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا / نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل

ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے / نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

تہ و بالا کیے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے / بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل

کبھی ڈوبی کبھی اچھلی مہِ نو کی کشتی / بحرِ اخضر سے تلاطم میں پڑی ہے ہلچل

قمریاں کہتی ہیں طوبیٰ سے مزاج عالی / لالۂ باغ سے ہنستے ہیں فلک کھیم و کنول

شب دیجور اندھیرے میں ہے ظلمت کے نہاں / لیلیٰ محمل میں ہے ڈالے ہوئے منہ پر آنچل

شاہدِ کفر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ / چشمِ کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل

جوگیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبھوت / یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل

شب کو مہتاب نظر آئے نہ دن کو خورشید / ہے یہ اندھیر چھپائے ہوئے تا بہ زحل

وہ دھواں دھار گھٹا ہے کہ نظر آئے نہ شمع / گرچہ پروانہ بھی ڈھونڈھے اسے لے کر مشعل

نور کی تیلی ہوئی پردۂ ظلمت میں نہاں / چشمِ خورشید جہاں بیں میں ہیں آثارِ سبل

آتشِ گل کا دھواں بامِ فلک تک پہنچا / جم گیا منزلِ خورشید کی چھت میں کاجل

ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے / برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل

جس طرف سے گئی بجلی پھر ادھر آ نہ سکی / قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل

جنبشِ ترغیبِ ہوا نے یہ دکھائی تاثیر / زہرِ مقتول ہے اخگر تو کھرل ہے منقل

آبِ آئینہ تموج سے بہا جاتا ہے / کہئے تصویر سے گرنا نہ کہیں دیکھ سنبھل

آج یہ نشو و نما کا ہے ستارہ چمکا / شاخ میں کاہکشاں کے نکل آئی کونپل

دیکھتے دیکھتے بڑھ جاتی ہے گلشن کی بہار / دیدۂ نرگسِ شہلا کو نہ سمجھو احول

خضر فرماتے ہیں سنبل سے کہ تقدیر دراز / پھول سے کہتے ہیں پھلتا رہے گلزار امل

جلوہ افشاں ہے شبیہِ گلِ نسرین و سمن / تجلیٔ وادیٔ موسیٰ سے ٹپکتا ہے عسل

لہریں لیتا ہے جو بجلی کے مقابل سبزہ / چرخ پہ بادلا پھیلا ہے زمیں پر مخمل

جگنو پھرتے ہیں جو گلبن میں تو آتی ہے نظر　　مصحفِ گل کے حواشی پہ طلائی جدول
ہم زباں وصفِ چمن میں ہوئے سب اہلِ چمن　　طوطیوں کی جو ہے تضمین تو بلبل کی غزل
تختِ طاؤسی گلشن پہ ہے سایہ کئے ابر　　چتر کھولے ہوئے فرقِ شہِ گل پہ سنبھل
جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں　　لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کو نسل
شاخ پر پھول ہیں جنبش میں زمیں پہ سنبل　　سب ہوا کھاتے ہیں گلشن میں سوار و پیدل
پھول ٹوٹے ہوئے پھرتے روشوں پہ ہیں نسیم　　یا سڑک پر ہیں ٹہلتے ہوئے گلگوں کو تل
آہ قمری میں مزا اور مزے میں تاثیر　　سرو میں دیکھئے پھول آنے لگے پھول میں پھل
ساتھ ساتھ آتے ہیں نالوں کے جگر کے ٹکڑے　　شجرِ آہِ رسا میں نکل آتی کونپل
سرِ پیرِ مغاں کے نکل آئیں شاخیں　　حرمتِ دخترِ رز میں نظر آتا ہے خلل
سبزۂ خط سے ہوا ہونے لگی سرخیِ لب　　چمنِ حسن سے لال اڑ گئے بن کر ہریل
صاف آمادہ پرواز ہے شاماں کی طرح　　پر لگائے ہوئے مژگانِ صنم سے کاجل
خندہ ہائے گلِ تالیں سے ہوا شور نشور　　کیا عجب ہے جو پریشان ہے خوابِ مخمل
طرفہ گردش میں گرفتار نجیب پھیری ہے　　سرمہ ہے نیند مری، دیدۂ بیدار کھرل
شاخِ شمشاد پہ قمری نے کہو چھیڑے ملار　　نو نہالانِ گلستاں کو سنائے یہ غزل

غزل

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل　　تیرتا ہے کبھی گنگا کبھی جمنا بادل
سمتِ کاشی سے گیا جانبِ متھرا بادل　　برج میں آج سری کشن ہے کالا بادل
خوب چھایا ہے سرِ گوکل و متھرا بادل　　رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل
شاہدِ گل کا لئے ساتھ ہے ڈولا بادل　　برق کہتی ہے مبارک تجھے سہرا بادل
سطحِ افلاک نظر آتی ہے گنگا جمنی　　روپ بجلی کا سنہرا ہے روپہلا بادل
چرخ پہ بجلی کی چل پھر سے نظر آتا ہے　　سبزہ چمکائے، بلاتا ہوا برچھا بادل
جب تلک برج میں جمتا ہے یہ کھلنے کا نہیں　　ہے قسم کھائے اٹھاتے ہوئے گنگا بادل
بجلی دو چار قدم چل کے پلٹ جاتی ہے نکیول　　وہ اندھیرا ہے کہ پھرتا ہے بھٹکتا بادل
چشمۂ مہر ہے عکسِ نہرِ گل سے دریا　　پہلو برق سے سونے کا ہے بجرا بادل
میری آنکھوں میں سماتا نہیں یہ جوشِ دقرق　　کیسی بیدر دکھ دکھلاتے کرشما بادل

دلِ بیتاب کی ادنیٰ سی چمک ہے بجلی   چشمِ پُرآب کا ہے ایک کرشما بادل

طپشِ دل کا اُڑایا ہوا نقشہ بجلی   چشمِ پُرآب کا دھویا ہوا خاکا بادل

اپنی کم ظرفیوں سے لاکھ فلک پر چڑھ جائے   میری آنکھوں کا ہے اُترا ہوا صدقا بادل

کچھ ہنسی کھیل نہیں جوششِ گریہ کا ضبط   یہ مرا دل ہے یہ میرا ہے کلیجا بادل

جامِ پیرِ فلکِ پیر ہوا ہے لبریز   لئے آتا ہے جنازہ، دے کے کاندھا بادل

راجہ اندر ہے پری خانے کا پانی   نغمۂ نے کا سری کشن کنہیا بادل

جوش پر رحمتِ باری ہے چڑھاؤ خم ہے   چشمکِ برق سے کرتا ہے اشارا بادل

دیکھتا گر کہیں محسن کی فغان و زاری   نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

پھر چلا خامہ قصیدے کی طرف بعد غزل   کہ ہے چلکے ہیں سخن گو کا دماغِ تحمل

باغ میں ابرِ سیہ مست چڑھا کر آیا   جامِ خورشید مع میکدۂ برجِ حمل

چشمِ میکش میں گلابی ہے کہ پھولا ہے گلاب   پھول پھوٹے کا کھلا ہے کہ کھلی ہے بوتل

جام لے بادہ سے کہتے ہیں کہ رندوں کو نہ چھیڑ   دستِ بے جام سے کہتے ہیں کلیجوں کو نہ مل

گوہرِ دل کو بڑی سنگ دلی سے پیسا   کشتیٔ مے کو بنایا ہے ساقی نے کھرل

کیسی افسردگی کیا بات ہے مرجھانے کی   غنچہ کہتا ہے بجا لو سے کہ گلشن سے نکل

سیر میں وحشت سے مصروف ہے جو پاؤں ہے لنگ   شغل میں چاک گریباں کے ہے جو ہاتھ ہے شل

مصر والوں کو یہ ڈر ہے کہ زلیخا کے لئے   سرِ بازار نہ بکنے لگے سودے کا خلل

ہے گُلِ رنگ ہے کیا شمعِ شبِ فکر کا پھول   چلتے چلتے جو قلم ہاتھ سے جاتا ہے نکل

بیان

ی ۔ بزرگ میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ محلہ چمار دروازہ میں ان کا مکان تھا
ان کا نام سید محمد تقی ہے۔ اور تخلص بیان ہے۔ فارسی میں یزدانی تخلص
کرتے تھے۔ باپ کا نام میر گوہر علی ہے۔ ان کا کلام فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہے
شاگرد بھی بکثرت تھے لیکن اپنی زندگی میں کلام نہ چھپوایا۔ مرنے کے بعد کچھ دنوں تک ان کے کلام
کو شائع کرنے کا خیال شاگردان رشید کو رہا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ جذبہ کم ہوتا گیا۔ سنا گیا ہے کہ حضرت
بیان کا تمام کلام اُن کے شاگرد مولوی سید محمود علی متخلص بہ گرامی سابق اسسٹنٹ پروفیسر
میرٹھ کالج کے قبضہ میں ہے۔ اور وہ ایک عرصہ سے اُس کی تدوین میں مصروف ہیں۔ کم از کم تیس
برس تو مجھے بھی یہ سنتے سنتے ہو گئے لیکن حضرت بیان کا کلام آج تک پردۂ خفا سے باہر نہیں آیا
اب حضرت گرامی کی بھی پیرانہ سالی ہے۔ اور معلوم نہیں کہ یہ حیات مستعار کب ختم ہو جائے۔ جب اتنی
مدت میں حضرت گرامی کلام بیان کی تدوین نہیں کر چکے۔ تو آیندہ بھی ایک امید موہوم ہی ہے۔ کہ اس
کام کو حضرت گرامی انجام دے سکیں گے۔ افسوس اور صد افسوس کہ بیان کی تمام عمر کی کمائی ناقدردانی
کی وجہ سے اس بری طرح سے ضائع ہو گئی۔ ہم کو جو مختصر کلام متفرق طور پر کہیں کہیں ملا۔ اُس سے ہم نے
کچھ اشعار منتخب کر لئے ہیں۔ اور اس خیال سے کہ ایک اچھے شاعر کا نام بھی اُس کے کلام کی طرح گم نہ ہو
جائے۔ بیان کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔

ہمارے پاس حضرت بیان کے رسالہ لسان الملک ۱۸۸۷ء و ۱۸۸۸ء کے چار پرچے ہیں۔ معلوم
ہوتا ہے۔ کہ آپ یہ رسالہ ۱۶ صفحہ کا نکالتے تھے۔ جس میں ایک آدھ غزل اپنی ہوتی تھی۔ اور زیادہ تر اپنے
شاگردوں اور دوسرے شاعروں کی غزلیں چھپتی تھیں۔ متفرق طور پر آپ نے ایک نہایت مختصر رسالہ نحو فولاد
اور دوسرا پانچ ہند بھی چھپوایا تھا۔ غالباً جب لسان الملک بند ہو گیا۔ اور دوستوں اور شاگردوں کا
اصرار ہوا۔ یا اپنی شاعری کی دھاک بٹھانی منظور ہوئی۔ تو متفرق طور پر سولہ صفحے کے رسالے نکال دئے
لیکن ان رسالوں میں بھی وہی لسان الملک کا رویہ بدستور قائم ہے۔ یعنی صرف اپنا ہی نہیں۔ بلکہ

دوسروں کا کلام اپنے سے زیادہ چھاپا ہے۔

یہ بزرگ عربی اور فارسی میں کافی مہارت اور استعداد رکھتے تھے لیکن کسی قدر وہمی تھے۔ ہمیشہ اندھیری کوٹھری میں پڑے رہتے تھے۔ صفائی کا مطلق خیال نہ تھا۔ ایک لحاف اوڑھے رہتے تھے خواہ کوئی موسم ہو گردن پر کچھ بوجھ رکھا رہتا تھا۔ باہر کبھی آتے جاتے نہ تھے۔ پلنگ ہی پر کبھی کبھی نہا لیا کرتے تھے۔ محض شاعر تھے۔ اور کسی کام کے نہ تھے۔ زیادہ تر اسی مشغلہ میں عمر گزاری۔ بقول بعض اصحاب "گودڑی کے لعل" تھے۔

اودھ پنچ لکھنؤ سے بڑے بڑے مقابلے رہے۔ سید احمد حسن شوکت میرٹھی (بقول خود مجدد السنۂ مشرقیہ) بھی مدِ مقابل رہے۔ لیکن شوکت مرحوم بلحاظ شاعری ان کے درجہ کو نہیں پہنچے۔ آخر مارچ ۱۹۰۰ء میں انتقال فرمایا۔ اور ۵۴ برس کی عمر ہوئی۔ اس لحاظ سے تاریخ ولادت ۱۸۴۶ء ہوتی ہے۔

کلام پر تبصرہ

آپ کا کلام زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔ زمانہ کی رفتار سے متاثر ہو کر یا یہ کہ مولانا حالی کا جواب لکھنا ضروری سمجھ کر آپ نے پانچ ہند در جواب شکوۂ ہند تحریر فرمایا۔ ۱۸۹۹ء میں یہ دوبارہ چھاپا گیا۔ اس کے دیباچہ سے چند سطور نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ بیان تحریر فرماتے ہیں:-

بازارِ جہاں میں ناروا چیز ہوں میں — مٹی سے بنا ہوا ہوں کیا چیز ہوں میں
اعجازِ بیاں کجا کجا سحرِ کلام — ناکارہ و نارسا و ناچیز ہوں میں

حمد و ثنا کے بعد مٹی کا مٹا ہوا پتلا جس کی حقیقت فانی ہے اور شہرت بزدانی ہے۔ بیان کرتا ہے کہ پانچ ہند کی تحریر سے حیثیت کمال کی زیادہ تر نشو و نما اور آوازۂ کلام کی بیشتر نمود و نمو مقصود نہ تھی بلکہ آگندہ گوش قوم کو سود مند پند سنانے کے لئے ملا کر دو آوازوں کا بند کرنا مدِ نظر تھا۔ ہائے کیا اچھا کہا ہے ؎

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

البتہ نصیحت کا پیرایہ بدل دیا گیا۔ صاحبِ شکوہ نے ہند کو بہشتِ شامت بنایا گویا ایک پر الزام رکھ کر دوسرے کو نصیحت کا دکھڑا سنایا۔ ہم کو یہ بیرایہ پسند نہ آیا۔ کیونکہ جان بچانے کو کاہل وجودوں کے

لئے اتنی سی آڑ بھی بہر قرار کافی تھی۔ ہم نے تہدید اور تنبیہ کے لشکر کا گھونگٹ توڑا۔ اور غفلت کی میٹھی نیند سونے والوں پر فائدہ رساں نصیحت کا چھاپا مارا۔ . . . .

اعجازِ بشر ہے عجز کوشی کے لئے　　یہ جنس نہیں ہے خود فروشی کے لئے
بے وجہ نہیں یہ سات پردے غافل　　ہے خانۂ چشم عیب پوشی کے لئے

ہماری ناقص رائے میں مولانا حالی کا پیرایۂ بیان نہایت دلکش ہے بےشک ہندوستان کو ہدفِ ملامت بنا کر مسلمانانِ ہند کو اُن کی کھوئی ہوئی عظمت، اُن کے گم شدہ علم و ہنر، دولت، اخلاق غرض ہر عمدہ صفت کی یاد دلائی ہے۔ اور یہی طریقہ گفت و شنود کا بہترین ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

بیانِ مرحوم نے اِس طرح اظہارِ خیالات کیا۔ کہ ہند کو مظلوم قرار دیا ہے۔ اور براہِ راست مسلمانوں کو اُن کے بُرے اعمال کی بنا پر زجر و توبیخ کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

رات سر تکیہ پہ رکھ کر سو گیا میں ناگہاں　　آگیا ناطاقتی سے سر تہِ خوابِ گراں
عالمِ رؤیا میں سنتا ہوں کہ مشرق کی طرف　　دھیمی دھیمی آرہی ہے اک صدائے ناتواں
رونگٹے بھی ہو گئے یکسر کھڑے کانوں کے ساتھ　　کھُل گئی آنکھ اور ہوا میں اُس طرف اُٹھ کر رواں
دیکھتا کیا ہوں کہ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی　　لوٹتی ہے مرغِ بسمل کی طرح اک نیم جاں
کر رہی ہے دمبدم فریاد وہ آفت زدی　　جل رہی ہے دل میں آگ اور منہ سے اُٹھتا ہے دھواں
تن بدن سارا ہے تیغ و تیر سے سکا نٹا ہوا　　ہر بُنِ مُو سے ٹپکتی ہیں لہو کی بوندیاں
پارہ پارہ ہے بدن اور ٹکڑے ٹکڑے پیرہن　　پیرتی ہے زخم میں ڈوبی ہوئی نوکِ سناں
دست و دل بیچارہ ہیں چھُریاں کسی بیدرد نے　　چھد رہا ہے تن بدن ٹوٹا ہوا ہے تارِ جاں
ڈھل گیا ہے اُس کا وہ اُمکا ہوا جوبن تمام　　گریہ کرتی ہیں جراحت پہ نمک افشانیاں
کوستے ہیں تیغ زن کو زخم منہ کھولے ہوئے　　بد دُعا دیتے ہیں قاتل کو جراحات اللساں

کوئی دارو کوئی درماں نفع کرنے کا نہیں
ضربتِ تیغِ زباں کا زخم بھرنے کا نہیں

اس نظم میں جا بجا اُمکا ہوا جوبن، چھپے تختیاں وغیرہ سوقیانہ الفاظ کے استعمال سے بھی پرہیز نہیں کیا گیا۔ بہر حال نظم بُری نہیں ہے۔ آخر کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:-

ہم سے حالی کے موالی کیوں مکدر ہو گئے　　کیا نہ تھے یہ پرست ہیں، سخن کے جوہری

خواہ اعجازِ بیاں ہو خواہ حالی کا فسوں   وہ عمل کیجے کہ جس میں قوم کی ہو بہتری
چاہیئے آئینہ میں جوہر کو دیکھے دیدہ ور   جلوہ گر ہوتا کمالِ حکمتِ اسکندری
تھی نزاعِ مصلحت آمیز پر رنجش فضول
اِنّما الاعمال بالنیّات ہے قولِ رسولؐ

بیاں کا جو تھوڑا بہت کلام دیکھنے میں آیا۔ اُس سے ہم پر یہ اثر پڑا کہ وہ مبالغہ، رعایتِ لفظی تشبیہات اور شکوہِ الفاظ کو شاعری سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں شاعری کا داخلی پہلو ندارد ہے۔ اور اندرونی کیفیات بہت کم بلکہ ناپید ہیں۔ مشکل سے غزل میں کوئی شعر ایسا ملے گا۔ جس میں سوز و گداز ہو یا اس امر کا پتہ دے۔ کہ شاعر حقیقتاً اندرونی جذبۂ دل کے ماتحت شعر کہہ رہا ہے۔ یا یہ کہ جو اس پر گزرتی ہے۔ اس کو بیان کر رہا ہے۔ البتہ یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ تیغ زبان آبدار ہے۔ اور جو چیز سامنے آتی ہے۔ اُسے کاٹ تراش کر پھینک دیتی ہے۔ یعنی قوتِ بیان موجود ہے۔ لیکن بیجا تخیلات میں محبوس ہے۔ الفاظ کا ذخیرہ کافی سے زیادہ ہے۔ لیکن عمدہ خیالات کے اظہار میں صرف نہیں کیا جاتا۔

مبالغہ کی مثالیں لیجیے :۔

پئے خورشیدِ صبحِ حشر یہاں کا فور کا پھاہا   قیامت کی حرارت ہے مرے داغِ محبت میں
میں ہوں موجود یا معدوم یا موہوم کیا ہوں میں   کُرے نے اُس کی ڈالا ہے مری ہستی کو دقت میں
عصائے نیزہ لے کر مہر نکلا ہے قیامت میں   کہیں اندھا نہ ہو میرے سیہ نامہ کی ظلمت میں

رعایتِ لفظی دیکھئے :۔

اسی اکسیر سے سونا ملا خوردل کی خلوت میں   گِلِ حکمت کیا تھا عشق کے کشتہ کو تربت میں
اسیرِ زلف اُلجھے رہ گئے، دل چھپ گیا یا رب   کھلیں گے اُن کے عقدے کیا کہیں اگلی قیامت میں

تشبیہات بھی ملاحظہ ہوں :۔

نشانِ نورِ پنہاں پر گرے وحدت کے پروانے   چراغِ طور کی بتی ہے انگشتِ شہادت میں
نہ کی لغزش، رہا گردش میں گو پرکار کی صورت   مرا اک پاؤں تھا آرام میں، اک پاؤں حرکت میں

آپ نے ایک مجموعۂ نعت چھاپا تھا جب میں طالب علم تھا۔ اس کو ایک نظر دیکھا تھا خیال یہ ہے۔ کہ وہ ایک اچھا مجموعہ تھا۔ لیکن آج کہیں نہیں ملتا۔ مشہور یہی ہے۔ کہ حضرت بیان نعت خوب کہتے تھے۔ چنانچہ میں ایک نعتیہ غزل سے چند اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔

محمد روح تھا جانِ جہاں تھا بلکہ جاناں تھا — تعالیٰ شانہٗ یہ جلوہ کب در خورد انساں تھا
لہو گلگونۂ رخسارۂ شاہِ شہیداں تھا — نہ تھا خوں، سرخیِ عنوانِ دینِ پاکِ یزداں تھا
ہوائے مصطفیٰ میں میرا مجموعہ پریشاں تھا — بہ رنگِ مصحف اک اک پارۂ تن جزوِ ایماں تھا
جلا خیمہ، کٹا حلقومِ شہ، کیا عشقِ جاناں تھا — نہ ابراہیم سوزاں تھا نہ اسمٰعیل قرباں تھا

(یہ شعر سلام کا سمجھنا چاہیئے۔ اس کو نعت کا شعر نہیں کہہ سکتے)

سکندر نے نہ پایا بارِ ایوانِ رسالت میں — مگر دارا ترے دروازۂ دولت پہ درباں تھا
قدم جب غار میں رکھا ترے سرو چراغاں نے — زمیں کا تارہ چمکا تو زمیں خورشیدِ تاباں تھا
تجھے دیکھا تو پہنچے اہلِ معنیٰ ذاتِ واحد کو — ترا ملفوظ احمدؐ تھا ترا مفہوم یزداں تھا
بیاںؔ کے نامہ پر روح القدس الحمد کرتا ہے — ثنا خوانِ رسول اللہ تھا تلمیذِ رحماں تھا

زمانہ کی رفتار سے متاثر ہو کر آپ نے جدید شاعری کی طرف بھی توجہ کی۔ آپ کی بعض نظمیں اچھی ہیں۔ جاڑے کی نظم ہم نے انتخابِ اشعار میں تمام و کمال نقل کر دی ہے۔ پانچ ہند کے متعلق آپ شروع میں ہمارے خیالات دیکھ چکے ہیں۔ آپ نے ایک نظم ایشیائی شاعری کی الوداع پہ لکھی ہے۔ اس کا سراپا بیان کیا ہے۔ چشم کے متعلق پانچ بند ہیں۔ صرف آخری بند لکھتا ہوں۔ جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت بیاںؔ کو زبان پر کس قدر قدرت حاصل تھی۔ فرماتے ہیں:۔

نہ چھوری نہ نیلی نہ بھیسلی وہ آنکھیں — طرحدار نازک سجیلی وہ آنکھیں
رنگیلی رسیلی نشیلی وہ آنکھیں — کٹیلی چھبیلی نکیلی وہ آنکھیں
کسی سے وہ سیدھی کسی سے وہ ترچھی
نگاہوں میں تیر اور کن انکھیوں میں برچھی

دیکھئے آنکھوں کی صفت کے لئے کیا کیا الفاظ لائے ہیں۔ اور دامنِ زبان و شاعری ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

ایک مرتبہ جلسۂ عام نوچندی میں سر سید احمد خاں کو دعوت دی گئی تھی۔ جس میں بڑے بڑے اکابرِ قوم اور بعض صاحبانِ انگریز بھی شریک تھے۔ حضرت بیاںؔ کی طرف سے ایک نظم اس جلسہ میں پڑھی گئی تھی۔ چند اشعار عرض کرتا ہوں:۔

تا کجا اے دوستو خوابِ گراں — آن پہنچا پیشوائے کارواں
چاہیئے آنکھیں بچھائیں زیرِ پا — شانِ حق آپ اور ہمارے میہماں

آپ کی تقریر کے اعجاز نے — ڈال دی ہر ہمتِ مُردہ میں جاں
زیرِ گردوں پھر وہ گلشن ہو ہرا — آگئی ہے جس کے گوشوں میں خزاں
افتخارِ ہند سید کے قدوم — پھر بھی دکھلاتے خدا وندِ جہاں

پھر اُٹھے مجلس سے گلبانگِ چیرس
آنے پھر کاغذ سے آوازِ بیاں

اس نظم میں کل ۳۹ شعر ہیں۔ ہم نے بخوفِ طوالت صرف چھ شعر درج کر دیے ہیں تاکہ حضرت بیان کے کلام کا نمونہ پیشِ نظر ہو جائے۔ ذیل میں ہم اُس کلام سے جو ہمیں حاصل ہو سکا بہترین اشعار نقل کرتے ہیں:-

جاڑا

دھوم مچاتی سردی آئی — دانت بجاتی سردی آئی
دھنیوں کے بھاگوں جاڑا آیا — تانت بجی اور راگ بھی پایا
ڈھک گئے منہ اور چھپ گئے ہاتھ — جاء البرد مع الحیات
دانت کی ڈونڈی گھر کا اکھاڑا — روئی کے بیچ نے سب کو پچھاڑا
کھیت کیار کے پڑ گئے لالے — پالے کے سب پڑ گئے پالے
گھر گھر بانٹی دولت اس نے — سب کو دیا ہے خلعت اس نے
کسی کا شالی مول میں بھاری — کسی کی کملی تول میں بھاری
جیت گیا گر پالا پالے — کھیت رہے تمباکو والے
غل بل کرتے پھرتے ہیں کل — کابلیوں کا ٹوٹا پل
میوہ تولنے والے آئے — پشتو بولنے والے آئے
نکلے چیتے جھاڑی سے — اُترے ریچھ پہاڑی سے
جوتوں میں کپڑے تو بھرے ہیں — روڑوں میں کیا انگور بھرے ہیں
سکھ سے بیٹھی ہے اک اک جوں — کابل جائے گی جوں کی توں
پیسا ڈے اپنگ میوہ بدوشم — کابلیم انگور فروشم
ہو گیا سب کا کلیجا ٹھنڈا — کھوپری ٹھنڈی بھیجا ٹھنڈا
بن کے سہاگن بیٹھی ہے رنڈی — کوکھ بھی ٹھنڈی مانگ بھی ٹھنڈی

ٹھٹھریوں کے بھی ہوش ہیں گم سے
کام پہ دھر ہاتھ اب یہی دھن ہے
بادل روئی کے آ گئے سر پر
رعد بنے لڑ لڑ کے دانت
آگ سے ریچ ریچ لاگ ہے سب کو
گود میں لی چھاتی سے لگا لی
شب کو انگیٹھی سب کے قریں ہے
اک اک عضو ہوا ہے ٹھنڈا
ٹھٹھرے ہوئے ہیں لوگ جہاں کے

ڈھنے لگے سر روئی کے بدلے
کام کے بدلے ہاتھ میں سن ہے
باندھ کے دل سب چھا گئے سر پہ
دل بادل میں کڑکے دانت
آس اولاد کی آگ ہے سب کو
آجکل آگ ہے ننھی بالی
کوئلوں پہ اب مہر نہیں ہے
چار مہینے بند ہے ٹھنڈا
گرم فقط مضمون ہیں بیاں کے

غزلیات

جیسے سب نوح کے فرزند کہتے ہیں کہ طوفان تھا — کسی جانزادۂ خاموش کا اندوہ پنہاں تھا
سرِ شوریدہ، پائے دشت پیما شامِ ہجراں تھا — کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا
مری ہستی کی محشر میں کوئی تعبیر کیا کرتا — کسی زلفِ پریشاں کا میں اک خوابِ پریشاں تھا
قیامت تک پسِ از مردن رہی اک ٹیس سی دل میں — وہ کہتے ہیں کہ پیکاں تھا میں کہتا ہوں کہ ارماں تھا
بلا سے چور کر دو چور کر دو شیشۂ دل کو — اسی میں قید حسرت تھی اسی میں بند ارماں تھا
اکیلے اسے بتو ہم بھی نہ سوئے کنجِ مدفن میں — گر اس پہلو میں حسرت تھی تو اس پہلو میں ارماں تھا
نہ کھولی آنکھ وقتِ نزع بیمارِ محبت نے — کسی کا پردہ رکھنا تھا کوئی آنکھوں میں پنہاں تھا
حضورِ بلبلِ کلکِ بیاں کس طرح کھلتے منہ — کہ بوئے غنچہ ساں محجوب نطقِ ہر سخنداں تھا
اُن کا منجملۂ اربابِ وفا ہو جاتا — میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا
ہر کام میرا کشمکشِ خیر و شر میں ہے — چشمک تری نگہ سے تضادِ قدر میں ہے
اختر نہیں، درہم ہیں یہ کس کا حرایف تھا؟ — خوں کا صلہ سپہرِ کہن کی سپر میں ہے
تم سے چھٹا تو اہلِ وفا کو غرض نہیں — جب تک کہ چٹکیوں میں ہے ناوک جگر میں ہے
اے جنوں ہاتھ کے چلتے ہی مچل جاؤں گا — میں گریبان سے پہلے ہی نکل جاؤں گا
مرہم، سوختہ میں شیشۂ آتش ہے رقیب — اس پہ ڈالو گے تجلی تو میں جل جاؤں گا
کارِ امروز بہ فردا نگذار اے واعظ — آج اس کوچہ میں ہوں خلد میں کل جاؤں گا

اے بیاں سنئے ذرا ناصحِ ناداں کی زٹل — مَیں بھلا آپ کی باتوں سے بہل جاؤں گا
کیا تشہیرِ تعذیرِ تصوّرِ شامِ فرقت میں — کہ سرِ خورشید کا نیزہ پہ لائے ہیں قیامت میں
کوئی بسمل تڑپتا رہ گیا شوقِ شہادت میں — کہ ہر جا خون کے دھبے ہیں دامانِ قیامت میں
جہاں پر شور ہے اے دل پڑا رہ کنجِ عزلت میں — کہیں مارا نہ جائے جنگِ ہفتاد و دو ملّت میں
ستم ڈھاتے تھے کوتاہی نے اُس کی شامِ فرقت میں — بجا ہے دیں اگر خورشید کو سولی قیامت میں
شرار آسا جہاں سے اُٹھ کے دے تعظیم او کاہل — خدا کی شان وہ خورشید رو اِس کنجِ ظلمت میں
مجھے بھی نقدِ آمرزش کی محشر میں ضرورت ہے — شہنشاہا کمی کیا ہے تری سرکارِ رحمت میں
بیاں ہر شعرِ تر بحرِ سخن کا دُرِّ یکتا ہے — نزاکت میں لطافت میں فصاحت میں بلاغت میں
اُچھل کر بھی نہ پائی تیرے قامت کی سرافرازی — تماشا ہے کہ ہر فتنہ معلّق ہے قیامت میں
تعصّب سینہ سوزِ شیخ ہے پانی چھڑک ساقی — پھنکا جاتا ہے زہدِ خشک مذہب کی حرارت میں
بیاں ایسی غزل لکھی ہے انعامِ الٰہی سے — ہے جس کی دھوم اک دلّی میں کیا ساتوں ولایت میں

کیوں نہ ہو بلغ و بہارِ دین و دنیا باغ باغ — پھول ہے تو یا محمد تجھ سے پھولا باغ باغ
ہے رُخِ گلگوں، قدِ موزوں کا چرچا باغ باغ — گا رہے ہیں خوش گلو تیرا سراپا باغ باغ
جلوہ فرماتا ہے گُل آتا ہے وہ دُرِّ یتیم — بحر میں لہرا رہی ہے اور ہے صحرا باغ باغ
پشتِ ابراہیم میں تھا وہ گُلِ معجز نما — اِس مسرت سے ہوا ایک ایک شعلہ باغ باغ
کس خوشی سے وہ گُلِ خوبی ہوا زیبِ بُراق — جیسے ہو آغوش میں دُلہن کے دُولہا باغ باغ
گُل محمد گُل علی گُل فاطمہ گُل نورِ عین — ہو بہارِ پنجتن سے کیوں نہ دنیا باغ باغ
تیرے گُل سے، برگِ گُل سے، بوئے گُل سے، گُل سے ہے — باغ باغ اے باغبانِ دینِ بیضا باغ باغ
گُل ہے تو گلبن ہے تو زینت دہ گلشن ہے تو — تجھ سے رنگیں پتی پتی تجھ سے زیبا باغ باغ
قاریانِ باغ لیتے ہیں تیرا خطبہ میں نام — ہے زبرِ گُل پہ ترے کلمہ کا سکّہ باغ باغ
کس گُلِ تر کے ترانے تھے کہ حوریں اے بیاں — لے گئیں لکھ کر سرِ اوراقِ طوبیٰ باغ باغ

از پارنج ہستہ

بچ کے رہتے گر مرے سایہ کے سایہ سے قدم — سایۂ یزداں ہیں رہتے زیرِ دیوارِ حرم
پرتوا تھا آپ کا، تھیں آپ کی پرچھائیاں — تیرہ بختی سے ہوا سایہ مرا کیوں متّہم
اختلاف آپس میں تھا، ملتے نہ تھے دل کھول کر — کیا ملا، گر مل گئے روم و عرب ترک و عجم

ایک مذہب دوسرے کی قطع کرتا تھا بنا
مختلف تھیں ملتیں کیسا ملتیں ہوتیں بہم

گو اخوت صبغۃ اللّٰہی سے تھی رنگی ہوئی
پر ہوائے جاہ و ثروت نے اڑا دی یک قلم

گر نہ اٹھ جاتا تفاوت چین و دیلم کی طرح
دور سے پکڑے ہوئے آتے نہ سالارِ اکرم

طبقۂ اعلیٰ کے قصوں کا گر ادنیٰ ہو بیان
اس فصاحت کے ملمع کا کھلے سارا بھرم

دور میں کس کل جگ کے اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے
محترم اسلام کو رکھتے تو رہتے محترم

کیا ہوا کیوں اس اخوت کی گئی کایا پلٹ
لٹتے ہیں ہندوستانی مارے جاتے ہیں عجم

اب وہ دسترخوان خوارزمی و تاتاری کہاں
ہاتھ پر کھاتے ہیں روٹی رکھ کے اربابِ کرم

انجمن برہم ہوئی وہ ٹھاٹھ وہ آئیں کہاں
گھر سے مسند اٹھ گئی پھر صدر اور پائیں کہاں

نسیم

(بھرت پوری)

شبّر حسین نام نسیم تخلص تھا۔ ریاست بھرت پور کے رہنے والے تھے۔ سادات عظام میں سے تھے۔ داغ دہلوی کے شاگرد رشید تھے حیدرآباد کے اکثر معرکوں میں استاد کی طلبی پر شرکت کرتے تھے۔ اکثر غزلیں معرکتہ الآرا طرحوں میں لکھی ہیں۔ مرزا داغ آپ کی شاگردی پر ناز کرتے تھے۔ افسوس کچھ زیادہ عمر نہ پائی۔ زندگی ہی میں استاد کو داغ مفارقت دے گئے۔ ریاست بھرت پور میں ملازم تھے۔ اور غالباً محکمۂ پولیس سے آپ کا تعلق تھا۔ ابتدائی سنین صدی موجودہ میں انتقال فرمایا۔

کلام پر تبصرہ

جن شعرا کا پورا دیوان دستیاب نہیں ہوا۔ اور انتخاب حسرت موہانی پر قناعت کی گئی ان کے متعلق بسیط تبصرہ نہیں کیا جا سکا۔ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں آپ کا مکمل دیوان دیکھا تھا۔ اُس وقت کوئی تذکرہ لکھنے کا خیال نہ تھا۔ اور نہ اس نظر سے آپ کا کلام پڑھا گیا۔ کہ آئندہ اُس پر رائے زنی کی جائے گی۔ بے شک اُس زمانہ میں دیوان دیکھ کر میری یہ رائے ضرور ہو گئی تھی کہ آپ اچھے شاعر ہیں۔ اور یہی خیال اب تک قائم ہے۔ اس لئے میں نے آپ کو اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔

اس وقت انتخاب کلام دیکھ کر میں یہ ضرور عرض کروں گا۔ کہ آپ کی غزلوں میں وہی داغ کا رنگ ہے۔ زبان بہت صاف اور شستہ ہے۔ جس طرح استاد کے یہاں عام طور پر مضمون آفرینی کم ہوتی ہے۔ اسی طرح آپ کے یہاں بھی خیال بندی کم ہے۔ البتہ شعر کیا ہیں باتیں ہیں۔ کہیں کہیں بات میں سے بات پیدا کرتے ہیں۔ رکیک اشعار کہنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

رنگ داغ کی مثالیں:۔

تو نے حاصل نسیم کچھ نہ کیا کچھ بھی تجھ کو نہ میرے یار آیا

زبان کی صفائی:-

آپ وہ سب کی جان لیتے ہیں ۔۔۔ موت کو مفت سان لیتے ہیں

دل بھلا عاشقوں کے پاس کہاں ۔۔۔ آپ ہی چھین چھان لیتے ہیں

اب تو یہ حال ہے نسیم ان کا ۔۔۔ جو میں کہتا ہوں مان لیتے ہیں

جو فسوں سازی میں خود مشتاق ہو ۔۔۔ اس پہ کیا جادو چلے منتر چلے

کیوں نہ واعظ کہے بتوں کو برا ۔۔۔ اپنے ویسوں کا واں گزر بھی ہے

آجائے نسیم اس کو ترحم تو عجب کیا ۔۔۔ چل ابے تو چلیں تجھ کو ترے یار کے آگے

شرم وصل غیر سے اٹھتی نہیں اونچی نظر ۔۔۔ در دسر کیسا یہ سب حیلہ بہانا ہم سے ہے

اپنے زمانہ کے رواج کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:-

قاصد سے جو بیمار بہت مجھ کو سنا تھا ۔۔۔ اخبار میں مرنے کی خبر دیکھ رہے ہیں

صفت تضاد ملاحظہ ہو:-

اکھڑ جاتے ہیں وہ سن کر مرا نام ۔۔۔ کسی کمبخت نے ایسی جڑی ہے

فارسی ترکیب بھی کہیں کہیں ہے۔ مثلاً:-

نہیں کامل ہنر بے ہنری میں بھی نسیم ۔۔۔ کچھ بھی تجھ کو نہ مرے یار لیاقت آئی

محاورات کی مثالیں لیجئے:-

مری تعریف کیوں ہوتی ہے اتنی ۔۔۔ عدو سے آج شاید ہو پڑی ہے

نہ پھرے کیوں نسیم آوارہ ۔۔۔ کہیں دنیا میں اس کا گھر بھی ہے

ہم ہیں آزادہ رو جہاں میں نسیم ۔۔۔ یاں ہوس کی ہوا نہیں آتی

آخر میں ایک رکیک شعر بھی سن لیجئے:-

بوسہ بھی مجھے دینا ہونٹوں میں بھی کچھ کہنا ۔۔۔ جینے کی دوا دینا مرنے کی دعا کرنا

ذیل میں آپ کے بہترین اشعار درج کئے جاتے ہیں:-

سب لطف ہے خاک زندگی کا ۔۔۔ ہو خانہ خراب عاشقی کا

ہر وقت کی ضد بری ہے دیکھو ۔۔۔ کہنا بھی کیا کرو کسی کا

یوں داد وہ دیتے ہیں وفا کی ۔۔۔ یہ کام نہیں ہے آدمی کا

دلکش نہ ہوں کیوں نسیم کے شعر ۔۔۔ شاگرد ہے داغ دہلوی کا

نالۂ دِل کمال کا نِکلا
اُن سے پہلو وصال کا نِکلا

دے گئے وہ جوابِ صاف مجھے
یہ نتیجہ سوال کا نِکلا

وہ خفا تھے یوں ہی کہ اے قاصد
کچھ سبب بھی ملال کا نِکلا

اُن کو منظور ہے ہر طرح اذیّت دینی
دِل دکھانے کو وہ سُنتے ہیں فسانہ دل کا

پندگو آپ نصیحت تجھے ہو جائے گی
کبھی اُس بُت کو اگر ایک نظر دیکھ لیا

ہجر میں جب خیالِ یار آیا
لب پہ نالۂ ہزار بار آیا

جہاں میں ابھی یوں تو کیا کیا نہ ہوگا
حسیں پر کوئی تم سا پیدا نہ ہوگا

مری بیقراری کو کیا دیکھتے ہو
کبھی برق کو تم نے دیکھا نہ ہوگا

نہ کھلتے زہر، شبِ غم تو اور کیا کرتے
کہ ایک دن ہمیں آخر یہ کام کرنا تھا

رئیس زادہ تھا یا وضع تھا مہذّب تھا
تمہیں نسیم سے کچھ تو کلام کرنا تھا

نسیم اور آپ کو رسوا کرے یہ غیر ممکن ہے
یہ فقرہ ہے کسی کا اُس سے ایسا ہو نہیں سکتا

رکھنا خم گیسو میں، یا دِل کو رہا کرنا
کچھ کہہ تو سہی ظالم، آخر تجھے کیا کرنا

کیا تم سے زیادہ ہے دُنیا میں حسیں کوئی
ایمان سے کہہ دینا انصاف ذرا کرنا

سہنی بھی جفا اُن کی کرنی بھی وفا اُن سے
اُن کی بھی خوشی کرنی دل کا بھی کہا کرنا

جاتے ہو جو گھر جاؤ پر وعدہ یہ کر جاؤ
یں یاد جب آجاؤں مرنے کی دُعا کرنا

بیداد کا اب شکوہ بیجا ہے نسیم اُن سے
تھا تم کو محبّت کا اظہار ہی کیا کرنا

میرے تڑپنے نے تماشا کیا
وہ نگہِ شوق سے دیکھا کیا

اشک نے کیں عشق کی غمّازیاں
رازِ درون آنکھ نے افشا کیا

جو نہ ہوا آپ سے بہتر ہُوا
جو نہ کیا آپ نے اچھا کیا

چھوڑو ملازمت کو بھرت پور کی نسیم
بگڑا ہوا ہے خیر سے سرکار کا مزاج

وہ دیں ابھی کرے جو کوئی خوبرو پسند
ہم کو نہیں پسند دل آرزو پسند

مانندِ اشک خاک میں آخر ملا دیا
آئی نہ آسماں کو مری آبرو پسند

اُس سے اے دل شکوۂ غم کیا کریں
سُن کے جو کہہ دے کہ پھر ہم کیا کریں

ہجر میں کیونکر کٹے گی زندگی"
یہ تو کہئے جانیے ہم کیا کریں

بہار آئی ہے پھر وحشت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
ہرے سینے میں داغوں کے گلستاں ہوتے جاتے ہیں

ہم یار کی غیروں پہ نظر دیکھ رہے ہیں
گو منہ پہ نہ لائیں گے مگر دیکھ رہے ہیں

منہ میری طرف ہے تو نظر غیر کی جانب
کرتے ہیں کدھر بات کدھر دیکھ رہے ہیں

یاروں میں بوئے مہر و محبت نہیں نسیم
کیا خاک اڑ رہی ہے جہاں خراب ہیں

تڑپ رہا ہے دلِ بیقرار پہلو میں
تیرے خدنگ کا ہے انتظار پہلو میں

لذتِ جور و ستم لینے دو
زیرِ شمشیر تو دم لینے دو

ذکرِ دشمن ہے ناگوار کسے
تم سناتے ہو بار بار کسے

مانگ لوں عمرِ خضر سے لیکن
تیرے وعدہ کا اعتبار کسے

گالیاں دے رہے ہیں ہونٹوں میں
اس ادا پہ نہ آئے پیار کسے

جب کسی کو خفا کرے کوئی
مر نہ جائے تو کیا کرے کوئی

کر رہا ہے علاجِ وحشتِ دل
چارہ گر کی دوا کرے کوئی

میں تو ناصح بتوں کا نام نہ لوں
دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی

نہ سنی اس نے ایک بھی دل کی "
دل ہی میں بات رہ گئی دل کی

وہ آئیں ان کو ایسی کیا پڑی ہے
یہ تو نے دل سے اے قاصد گھڑی ہے

تمہاری زلف دل خود مانگ لے گی
یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

آپ نے باندھی ہے کیوں تلوار آج
کیا مری حسرت نکالی جائے گی

ان پہ ظاہر ہو نہ اے دل شوقِ مرگ
تیغ گردن سے اٹھا لی جائے گی

تمنا یوں تو جیتے جی نہ میرے دل سے نکلے گی
گلے مل کر کسی دن خنجرِ قاتل سے نکلے گی

اور پھر کس سے کہوں حالِ پریشانئ دل
تم تو ہوتے ہو پریشان بڑی مشکل ہے

رازِ دل اس بتِ بدخو سے کہوں یا نہ کہوں
بات نازک ہے وہ ناداں بڑی مشکل ہے

دوستی سہل نہیں اس بتِ بدخو سے نسیم
ضد نہ کر دیکھ مری جان بڑی مشکل ہے

دل تجھ سے چھین لیں گے ضرورت اگر ہوئی
اچھی کہی یہ ایک ہی اے فتنہ گر ہوئی

جورِ پیہم کی انتہا بھی ہے
ایک کے بعد دوسرا بھی ہے

کہتے ہیں وہ جو پوچھتا ہوں مزاج
آپ سے کوئی بولتا بھی ہے

ہوں گے دل و جگر میں نشاں دیکھ لیجئے
تیرِ نظر پڑے ہیں کہاں دیکھ لیجئے

ترکِ الفت کا غم ادھر بھی ہے
کل سے چپ چپ وہ فتنہ گر بھی ہے

پوچھتی ہے فلک سے آہ مری — اِس جگہ پر کہیں اثر بھی ہے

تسلیاں بھی نہیں اُن کی چھیڑ سے خالی — رُلا کے چھوڑتے ہیں وہ ہنسا ہنسا کے مجھے

چراغِ شامِ غریبی بتھائیں زمانے میں — کسی نے آکے نہ ٹھنڈا کیا جلا کے مجھے

بولا تھا جو آغازِ محبت میں بڑا بول — آیا وہی آخر دلِ بیمار کے آگے

پیدا نہیں دُنیا میں دوا ئے مرضِ عشق — کیا لوگ نہ ہوتے تھے اِس آزار کے آگے

دیکھ اس غور سے نہ آئینہ دیکھ — تجھ کو تیری نظر نہ ہو جائے

کوئے قاتل میں اے دلِ ناداں — جان کا جس کو ڈر نہ ہو جائے

موت کی یاد ہے ضرور نسیم — اِس سے غافل بشر نہ ہو جائے

شبِ فرقت قضا نہیں آتی — لاکھ کہتا ہوں آ نہیں آتی

چپ ہیں وہ سُن کے شکوۂ اغیار — بات بھی تو بنا نہیں آتی

وہ تو وعدے پہ آچکے اے موت — تو بھی آتی ہے یا نہیں آتی

کس مرض کی دوا ہیں آپ اگر — دردِ دل کی دوا نہیں آتی

شیشۂ دل ہے کس قدر نازک — ٹوٹنے کی صدا نہیں آتی

ذکرِ ایفا کچھ نہیں وعدہ ہی وعدہ ہم سے ہے — رات دن شام و سحر امروز و فردا ہم سے ہے

کا تب آسکتا ہے یاں جس وقت آجاتی ہے یاد — آج تک وہ عالمِ وحشت مری آنکھوں میں ہے

دوسرا میری نظر میں کیا سمائے اے نسیم — ہر دم اُس کا جلوۂ قدرت مری آنکھوں میں ہے

نہ کچھ حسین کوئی ہم سا نہیں ہے — خدا کی خدائی میں کیا کیا نہیں ہے

بیتاب ہیں کسی کی نگاہیں نقاب میں — ہیں بجلیاں کہ کوندرہی ہیں سحاب میں

ریاض

ریاض احمد نام اور ریاض تخلص تھا۔ خیرآباد کے رہنے والے تھے اور وہیں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش اس حساب سے کہ پچانویں برس کی عمر میں ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ بوقت تین بجے شام انتقال کیا، ۱۲۵۸ھ نکلتی ہے اور اس حساب سے کہ ۸۱ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ تاریخ ولادت ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۳ء) ہوتی ہے۔ آپ کے والد ماجد منشی سیّد طفیل احمد صاحب سادات کرمانی سے تھے۔ حضرت ریاض نے اپنے پدر بزرگوار سے فارسی وغیرہ پڑھی۔ پھر خیرآباد کے قدیم مدرسے میں پڑھنا شروع کیا۔ عربی شرح جامی اور شرح وقایہ تک پڑھی تھی کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس وقت حضرت اسیر کا طوطی بول رہا تھا۔ آپ بھی خیرآباد کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے اور اسیر کے شاگرد ہو گئے۔ اُن کے انتقال کے بعد حضرت امیر مینائی کو کلام دکھانے لگے۔ جب امیر کے انتقال پر جانشینیٔ امیر کا سوال پیدا ہوا۔ تو سب لوگوں نے یہاں تک کہ حضرتِ داغ نے بھی ایک خط میں ریاض کو جانشینِ امیر تسلیم کیا۔ لیکن خود انہوں نے یہ عزت اور مرتبہ اس بنا پر اختیار نہیں کیا۔ کہ وہ دربار داری سے کوسوں بھاگتے تھے۔ اور انہوں نے خود حضرت جلیل کو یہ منصب دئے جانے پر اصرار کیا۔ لہذا جلیل جانشینِ امیر تسلیم کیے گئے۔

ریاض کے استغناء کا یہ حال تھا کہ مہاراجہ سر کشن پرشاد نے کئی بار طلب فرمایا۔ لیکن وہ حیدرآباد نہیں گئے۔ مہاراجہ محمود آباد نے جو قدر افزائی کی، اُسی کو کافی سمجھا۔ آپ کو علاوہ داد و دہش کے مبلغ چالیس روپیہ ماہوار آخر تک ریاستِ عالیہ سے ملتے رہے۔

۱۸۹۶ء میں ریاض الاخبار گورکھپور سے جاری کیا تھا۔ جو ایک مدت تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ صلح کل، فتنہ اور عطرِ فتنہ بھی آپ ذات سے نکلے۔ گل کدۂ ریاض اور گلچیں نے بھی خوب خوب خراجِ تحسین وصول کیا۔ حرم سرا ناول بھی آپ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ نا شاد اور نظارہ یہ دونوں ناول بھی آپ ہی کی تصنیف سے ہیں۔ عہدِ جوانی میں غالب کے رنگ میں ایک دیوان تصنیف کیا تھا۔ لیکن اُس کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس کا ایک شعر ذیل میں لکھا جاتا ہے:–

قصرِ امکاں لا یمکن کے تصدیقِ تصور سے — نگارِ کُن ہوا آئینہ خانہ بزمِ حیرت کا

ایک دیوان مکمل چوری ہوگیا۔ جس کا مرحوم کو آخرِ دم تک صدمہ رہا۔ دو دیوان مکمل یادگار چھوڑے لیکن اب تک شائع نہیں ہوئے۔ ایک دیوان میں صرف غزلیات ہیں اور دوسرے دیوان میں قصائد، قطعات، نظمیں اور سہرے ہیں[۱]

سر انتھونی میکڈانلڈ لفٹننٹ گورنر کے آنے پر ہندوستان میں پہلا وہ شہر جہاں مکمل ہڑتال ہوئی گورکھپور ہے اور ہندوستانی ہڑتال کا موجد ریاض ہے۔ حضرت ریاض غالباً مشرقی تہذیب کے آخری نمونہ تھے۔ ۳۰ ؍ جولائی ۱۹۳۴ء کو انتقال فرمایا۔ خدا مغفرت کرے۔ اگرچہ خمریات میں ریاض اپنا جواب نہیں رکھتے۔ لیکن آپ نے کبھی شراب کو چھوا تک نہیں۔ رسمی طور پر شراب کے مضامین نکالے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ کوئی شراب پینے والا شاعر بھی آپ سے بہتر مضامین نہیں پیدا کرسکتا۔

کلام پر تبصرہ

ریاض کا نام بچپن سے میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ اُن کے اشعار اکثر لوگوں سے سنتا رہا ہوں۔ شوخی اور ظرافت اُن کے کلام میں بہت پائی جاتی ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کے یہ بھی ایک نمائندہ ہیں کنگھی، چوٹی وغیرہ کا ذکر ضرور آجاتا ہے۔ رکیک اشعار کہنے میں بھی دریغ نہیں کرتے کلام میں صفائی اور روزمرہ بہت ہے۔ مضامین زیادہ بلند نہیں ہوتے۔ شاذ و نادر رفعتِ تخیل کی مثال بھی مل جاتی ہے۔ لیکن ایسی مثالیں اُن کی عام طرزِ شاعری سے بالکل علیحدہ ہیں۔ اور اُن کے رنگ سے بالکل جُدا ہیں۔ ان کا عام رنگ تو زبان کی سلاست ہے یا خمریات ہے یا پھر شوخی و ظرافت۔ اِس کے سوا اُن کے کلام میں اور کوئی بات نہیں ہے۔ پختگی اور کہنہ مشقی پائی جاتی ہے۔ چونکہ آپ کا کوئی دیوان نہیں چھپا لہٰذا جو کلام وقتاً فوقتاً رسائل میں نظر سے گزرا۔ اس کی بنا پر یہ رائے قائم کی گئی ہے۔ اگر پورا دیوان ہماری نظر کے سامنے ہوتا۔ تو ممکن ہے کہ ہم اچھی یا بری بہرحال اس سے بہتر رائے قائم کرتے۔ ہمارے نزدیک ریاض دوسرے درجہ کے شاعروں

---

[۱] ریاض رضواں کے نام سے آپ کا دیوان چھپ گیا ہے لیکن مضمون ہٰذا کئی سال پہلے لکھا جا چکا تھا۔ اب کسی اور ترمیم کی ضرورت نہ تھی۔ تنہا

میں شمار کئے جا سکتے ہیں بعض اوقات تو آپ کی زبان ایسی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ کہ داغ کے کلام کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ کچھ بھی ہو۔ کلام میں لطف ضرور ہے۔ ناسخ یا اسیر کی طرح بے مزہ نہیں سننے

اچھی پی لی خراب پی لی　　جیسی پائی شراب پی لی
میرا یہی خیال ہے گو میں نے پی نہیں　　کوئی ہمیں پلائے تو یہ شے بری نہیں
ہے ریاض اک جوانِ مست خرام　　نہ پیئے اور جھومتا جائے

لیکن آپ پُر گو شاعر ہیں۔ رطب و یابس سب کچھ آپ کے یہاں موجود ہے۔ بیسویں صدی میں اس قسم کی شاعری کے لئے کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے۔ یا یوں کہئے۔ کہ اب طبیعتیں یہی راگ الاپتے الاپتے اکتا گئی ہیں۔ زبان کی سادگی اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔ اور اگر کلام میں شوخی ہو۔ تو سبحان اللہ۔ لیکن اب لوگ کچھ تو تغزل سے بدگمان ہو گئے ہیں۔ اور کچھ حالات و واقعاتِ دہر بھی ایسے ہیں۔ کہ اس طرف توجہ برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔ فی الحال کسی شاعر کے لئے تغزل بیکار ہے۔ تاوقتیکہ وہ اپنے کسی خاص رنگ میں شہرت نہ حاصل کر لے۔ البتہ آجکل نظم کی مانگ ہے۔ اگر نظم اعلیٰ درجہ کی ہو۔ تو کیا کہنا ہمارے ادب میں عمدہ نظموں کی اب تک کمی چلی جا رہی ہے۔ اور یہ میدان وسیع ہے۔ ہر فطری شاعر کے لئے دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر وہ چاہے۔ تو اس میدان میں یکتائے سخن ہو سکتا ہے۔

شوخیٔ طبع کی مثالیں:۔

یہ یورش ابر پر جاتے ہیں خم کے خم کہاں ساقی　　بتا دے آج شورِ قلقلِ مینا کہاں ہوگا

کہ ہائے ابر کو خم سے اور بادلوں کی گرج کو قلقلِ مینا سے تشبیہہ دیکر مضمونِ شعر میں شوخی پیدا کر دی ہے۔ اور کہاں کا لفظ عجیب لطف دے رہا ہے۔

شکایت جو کی میں نے جو بن پہ بولا　　ارے یار ہم بھی نکالے ہوئے ہیں
وہ آ رہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ　　بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ ملے
فرشتے عرصہ گاہِ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں　　ہمیں بھی آج لطفِ لغزشِ مستانہ آتا ہے
ملتی جلتی ایک شے تھی آبِ زمزم سے بہت　　ہم چرا کر لے گئے اہلِ حرم کے واسطے

صفائی اور روزمرہ:۔

ریاض اک چلبلا سا دل ہو ہم ہوں　　حسینوں کی بھری محفل ہو ہم ہوں
کبھی کی پی ہوئی کام آئی آج حشر کے دن　　خدا کے سامنے میخوار سرخرو آئے
تبسم اور شوخی اُس پہ اندازِ تبسم کی　　ترے لب پر جو یوں آیا کوئی رازِ نہاں ہوگا

کمر سیدھی کرتے ذرا میکدے میں — عصا ٹیکتے کیا ریاض آرہے ہیں
کبھی ہاتھ اُٹھاتے نہ ہم اِن بتوں سے — وہ ایمان ہوتا کہ ایمان جاتا
میں نے چھیڑا تو کس ادا سے کہا — کچھ سنو گے مری زبان سے آج

خمریات:۔

طاقِ حرم میں شیشۂ گلابی ہے پھول سی — اِس کام کا ملے گا تجھے پھل اُٹھا تو لا
مرے حلق سے اُتر کر مئے صاف اشک بنتی — ابھی میں گناہ کرتا ابھی اشکبار ہوتا
بڑی کیا تھی فاقہ مستی بڑے لطف سے گزرتی — لئے کچھ جو مے کی تلخی غمِ روزگار ہوتا

رعایتِ لفظی کی مثالیں:۔

خیالِ شبِ غم سے گھبرا رہے ہیں — ہمیں دن کو تارے نظر آرہے ہیں
او زلف والے حشر ہے کچھ دل لگی نہیں — عقدے کھلیں گے آج ترے بال بال کے
رنگ کیا کیا شام کو لائیں گے آنے کے لئے — صبح سے بیٹھے ہیں جو مہندی لگانے کے لئے

رکیک اشعار بھی ملاحظہ ہوں:۔

نہ بنے کام تو کس کام کی نازک شکلیں — نازک ایسے نہ حسینوں کی نزاکت اچھی
مری جان میں تیرے قربان جاتا — مری بات چپکے سے تو مان جاتا
یاد آتا ہے ریاض اُن سے وہ میرا کہنا — آج رہ جا ترے صدقے مرے گھر رات کی رات

ذیل میں آپ کے تشبیہ اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

مجھ کو آنکھوں نے دکھایا ہے پلک جھپکا کے — خشک ہو کر کبھی دریا کا بیاباں ہوتا
روز راتوں کو سنا کرتا ہوں یہ آوازیں — پھاڑ کے کھاتا ہے مجھے خالی بیاباں آجکل
تھا حسنِ اتفاق کہ پیہم شرر اُٹھے — وہ خوش ہوئے کہ شمع کو ہم نے ہنسا دیا
یہ میکدے سب ہیں اِس سے خالی — دل کو مرے بے خودی خدا دے
پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات — اللہ رے شغلِ زاہدِ شب زندہ دار کا
یہ ہوا ہے تاجداری یہ ہوا ہے خودسری — اے حباب اتنے بگڑتے ایک دم کیوں واسطے
چلے آتے ہیں خوش خوش اپنے گھر سے — وہ ہنستے کھیلتے بادِ سحر سے
نہ دن کو وضع پہ رکتی ہے نہ شب کو رک سکی — مرے گھر کا وہ عالم بیکسوں کی جیسے تربت ہو
کیا کیا مزے دئیے ہیں لحد کے فشار نے — اپنا بنا لیا مجھے ظالم کے پیار نے

پرسش کے، دور جاتی ہے آواز بات کی

اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں ایک آہ کی

کس کا غبار ہے یہ ہمارا غبار ہے

عالمِ ہو میں اک آواز سی آجاتی ہے

مے لو پہ فدا ہوتی، دل عرشِ خدا ہوتا

مری شراب کی کیا قدر جانے تو واعظ

سلامت میکدہ یارب سلامت پیرِ میخانہ

فرشتے اسکی چشمِ فیض سے انسان بنتے ہیں

ریاض اس میکدہ میں بھی شرف ہے کچھ سیادت کو

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی

یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش

میکدے میں یہ طلسم آنکھ سے دیکھا میں نے

میرے آگے دخترِ رز کو لائے ہیں پہلے پہل

ریاض ایسی مرے دل میں لگی ہے جامِ کوثر کی

مجھ کو بھی انتظار تھا ابر آئے تو پیوں

ساقی ہمارے سامنے رکھ دے تو بھر کے جام

وہ کہہ رہے ہیں اشک کو میرے لہو کی بوند

اے چشمِ مست تیرے اشارے سے کیا پلا

جیسے کسی نے پی ہی نہیں وہ حرام تھے

کتنی تمام عمر میں ہم نے شراب پی

کمبخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا

کام آئیگی ریاض کے مشقِ طوافِ خم

گل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے

اُگتے تھے جن میں نخلِ امیدِ وصال کے

سیری ہوئی نہ لذتِ عصیاں سے عمر بھر

بیٹھا ہے قیس نجد میں مجھ کو پکارنے

بے آس ہو کے اِس دلِ اُمیدوار نے

جس کا ہر ایک ذرہ دلِ بیقرار ہے

چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

تھوڑی سی جو پی لیتے کیا جانئے کیا ہوتا

چھپ کے میں پی کے دعا دوں وہ جنتی ہو جائے

جو ہم ہیں بھی مری آنکھوں میں ہے تصویرِ میخانہ

پلاتا ہے کچھ ایسی دور ہی سے پیرِ میخانہ

نہیں ہم پیرِ میخانہ مگر ہیں میرِ میخانہ

میکدے سے اب پرانی جائیگی

سُن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

حوضِ مے میں جو گرا وہ لبِ کوثر نکلا

یہ اچھوتی آج نذرِ پارسا ہو جائے گی

مے انگور اب اچھی نہیں معلوم ہوتی ہے

ساقی اگر یہ سچ ہے کہ یا دل اٹھا تو لا

لا دخترِ رز کو نور کے سانچے میں ڈھال کے

آنکھوں نے رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

ساغر پلا شراب پلا میکدا پلا

ہر رند میکدے میں ہمیں پارسا ملا

شاید بتا سکے ہمیں میزانِ حساب کی

واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی

کیسے کے گرد ہونگے جو سمجھی ثواب کی

شکلِ معشوق کی ہے ادا ہیں دیوانوں کے

کیا ہو گئے وہ باغ طلسمِ خیال کے

کیا کچھ کیا مگر نہ بھرا جی گناہ سے

میرے گھر شبِ تبرک کے یہ ساماں نکلا — آستیں قیس کی فرہاد کا داماں نکلا

یہ وہ پتھر ہے جگہ سے جو کبھی اُٹھ نہ سکا — سنگِ در سے بھی سوا آپ کا درباں نکلا

حشر کے دن ہمیں سوجھی یہ شرارت اچھی — لے گئے چھانٹ کے ہم خُلد میں صورت اچھی

قیامت کی خلش کیوں ہر گھڑی ہے — وہ تم سے قد میں کم سن میں بڑی ہے

چھلکا ہیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

اب مجرمانِ عشق سے باقی ہوں ایک میں — اے موت رہنے دے مجھے عبرت کے واسطے

مزے تو تو کلیم اب بن پڑی ہے — بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے

نکلے میرے جرم میرے علم سے باہر بہت — روزِ محشر دم بخود ہوں فردِ عصیاں دیکھ کر

کوئی جانے بھی ہیں ایک جلوا دیکھنے والے — پڑے سے وہ آئے موسیٰ جا کے تنہا دیکھنے والے

تازہ کہن افسانۂ موسیٰ جو ہوا آج — یہ کون ہوا شیخ تجلائے محمد

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی — پسلی پھڑک اُٹھی نظرِ انتخاب کی

حضرت موسیٰ لڑائیں آنکھ کوہِ طور سے — ہم ہیں اُن میں دیکھتے ہیں جو تماشا دور سے

نہ آیا ہمیں عشق کرنا نہ آیا — مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا

تمنا کو تم اپنی منع کر دو — ہماری جان کے پیچھے پڑی ہے

کیا پوچھتے ہو باتیں پیری میں جوانی کی — وہ اور زمانہ تھا یہ اور زمانہ ہے

بڑے ہیں پاک طینت بڑے صاف باطن — ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

ریاض ایک مردِ آخر ہیں ہو تم بھی — سمجھ کر عاقبت یہ یاد کرتا

حسا لگا کے پہنچتے ہیں گل رخوں میں ریاض — کچھ ان کی رنجشِ مبارک کا اعتبار نہیں

پینے آتے ہیں فرشتے خو ریاض — حور کے دامن میں چھانی جائے گی

وقت کے ساتھ گئیں وقت کی باتیں بھی ریاض — اب نہ وہ ہم نہ وہ دل ہے نہ زمانہ دل کا

یہ یاد تو ہے کہ ملے تھے ریاض سے — او آنے والے ہاتھ تو مجھ سے ذرا ملا

کوئی جا کر ریاض کو سمجھائے — کچھ خفا ہیں وہ اپنی جان سے آج

کانگرس کی بزم میں ہیں کام کی باتیں ریاض — جس میں دورِ جام رہتا ہو یہ وہ محفل نہیں

ریاض آتے ہیں شاید کہ غل ہے مسجد میں — تمام بادہ کشوں کا امام آتا ہے

شاعری ہے ریاض کے دم تک — پھر کہاں لوگ اس طبیعت کے

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاضؔ پر
کس نوک کا جوان ہے کس آن بان کا

وہی شباب کی چہلیں وہی شباب کا رنگ
تجھے ریاضؔ بڑھاپے میں بھی جواں دیکھا

افسردہ جان کر وہ ہمیں چھیڑ لیں ریاضؔ
آ جائے گا مزا جو طبیعت سنبھل گئی

ریاضؔ موت ہے اس شرط سے ہمیں منظور
زمیں ستائے نہ مرنے پہ آسماں کی طرح

روؤں کیا بیٹھ کے میں اپنے مصائب کو ریاضؔ
اب تو رونا بھی مرے دیدۂ تر بھول گئے

سُنتا ہے ریاضؔ اپنی داڑھی بڑھا کر
بڑھاپے میں اللہ والے ہوئے ہیں

ہندوستاں میں دھوم ہے کس کی زبان کی
وہ کون ہے ریاضؔ کو جو جانتا نہیں

یہی چراغِ لحد تھے یہی تھے قبر کے پھول
اب اُن کے نقشِ قدم بھی سرِ مزار نہیں

ریاضِ خضر صورت جب سوئے میخانہ آتے ہیں
تو فوراً سر بہر اک خم سے پیمانہ آتا ہے

نسخہ بیاضِ ساقیِ کوثر سے مل گیا
گھر بیٹھے اب تو بادۂ کوثر بنائیں گے

وہ تارِ نفس کہاں سے لاؤں
ٹوٹے ہوئے دل کی جو صدا دے

حرم و دیر میں ہوتی ہے پرستش اُس کی
میکشو یہ بھی کوئی نام ہیں میخانوں کے

دل سے نکال ڈالے سب ارمان وصال کے
اب پوچھتے ہیں سینے سے کیا دل نکال کے

سرور

م

منشی درگا سہائے نام اور سرور تخلص تھا۔ بماہ پوس سمبت ۱۹۲۹ مطابق ۱۸۷۳ء بمقام جہان آباد پیدا ہوئے۔ باپ کا نام حکیم پیارے لال تھا۔ جو قصبہ جہان آباد کے کائستھ رؤسا میں سے تھے۔ اردو کی تعلیم مدرسہ تحصیلی جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں پائی اور وہیں اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ امتحان پاس کرنے کے بعد مولوی سید کرامت حسین متخلص بہ بہار سے فارسی زبان حاصل کی اور اپنا بہت سا وقت شعر و سخن کی ترتیب اور شاعرانِ ماضی و حال کے کلام دیکھنے میں صرف کیا۔ کچھ انگریزی بھی منشی شیو سہائے پوسٹ ماسٹر سے حاصل کی۔ شاعری میں حضرت بیان و یزدانی میرٹھی کو اپنا رہبر سمجھتے تھے۔ ایک کتاب خونِ ناحق تصنیف کی تھی۔ آریہ سماجیوں نے اس کتاب کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا۔ اور آپ کو مطبع انیس ہند میرٹھ کا منیجر مقرر کیا اس زمانہ میں آپ کی نظمیں ملک کے اخبارات میں شائع ہوتی رہیں لیکن بیوی کے انتقال نے پژمردہ کر دیا۔ سال بھر کا بچہ چھوڑا۔ جس کو آپ سات سال تک بڑی توجہ سے پرورش کرتے رہے۔ بعد ازاں وہ بھی داغِ مفارقت دے گیا۔ اور اس کے صدمے نے آخر کار بہت مضمحل کر دیا۔ شاعری کا مشغلہ ہر حال میں دم کے ساتھ رہا۔ مخزن۔ اردوئے معلیٰ۔ اور زمانہ میں کثیر تعداد میں نظمیں چھپتی رہیں۔ ایک زمانہ میں آپ کی شہرت چار دانگ ہند میں پھیلی ہوئی تھی۔ ۳۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ شراب کثرت سے پیتے تھے۔ چنانچہ بخار اور دردِ سینہ پیدا ہو کر عارضۂ ذات الجنب پیدا ہو گیا۔ ۳۰ رنومبر ۱۹۱۰ء کو بیمار ہو کر ۳ ردسمبر ۱۹۱۰ء کو بوقت ۹ بجے بولتے چالتے راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

کلام پر تبصرہ

آپ کا کوئی مجموعۂ کلام ہمارے سامنے نہیں ہے۔ البتہ متفرق نظمیں جو رسالہ "زمانہ" کانپور اور ادیب الہ آباد میں چھپی تھیں۔ وہ ہمارے پاس ہیں۔ "زمانہ" اگست و ستمبر ۱۹۰۹ء میں ایک نظم

"معرکۂ عشق" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس نظم میں ایک تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جو راجہ جے چند کی دختر سنجوگتا کے سوئمبر کے متعلق ہے۔ اور جس میں دہلی کا راجہ پرتھی راج شریک نہیں ہوا تھا۔ جے چند نے اُس کی مورت بنوا کر اپنے محل کے دروازہ پر بطور دربان کے کھڑی کر دی تھی۔ جب سنجوگتا ہار لے کر آئی۔ تو سوئمبر میں بہت سے نوجوان اور خوبصورت راجہ موجود تھے۔ اس نے سب پہ نظر دوڑائی اور کسی کو اپنا شریکِ حیات بنانے کے قابل نہ سمجھا۔ غضب یہ کیا۔ کہ پرتھوی راج کی مورت کے گلے میں ہار ڈال دیا۔ اِس سے راجہ جے چند کو بہت رنج اور صدمہ ہوا۔ اور وہ سنجوگتا سے ناراض ہو گیا۔ یہ خبر ہوا کی طرح پرتھی راج تک پہنچی۔ اس نے اسی وقت جانبازوں کو ساتھ لے کر قنوج کا رُخ کیا۔ اور وہاں سے شب کے وقت سنجوگتا کو لے بھاگ کر آناً فاناً اپنے ساتھ لے آیا۔ اور اس طرح سنجوگتا اس کی رانی بن گئی۔

سرور نے اس واقعہ کو اپنی نظم میں صرف یہاں تک بیان کیا ہے۔ کہ راجہ جے چند نے ناراض ہو کر سنجوگتا کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ معلوم نہیں۔ کہ شاعر نے بقیہ قصۂ عشق کو کیوں نظم نہیں کیا بہر حال یہ نظم مسدس ہے۔ اور اِس کے آخری بند کی ٹیپ یہ ہے۔

بند زنجیروں میں بھی وہ مہ کامل کب تھی کہ خیالِ رُخِ دلدار سے غافل کب تھی

نظم کو دیکھ کر جہاں شاعر کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ وہاں یہ کہہ دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم میں خامیاں بھی ہیں۔ مثلاً

کوئی باپ اپنی بیٹی کو دختِ حسیں نہ کہے گا

مگر آپ راجہ جے چند کی زبان سے یہ شعر ادا کرتے ہیں:۔

دل میں سوچا کہ سیانی ہوئی اب دختِ حسیں کسی آغوش کے پالے کی ہے یہ ماہ جبیں

پھر ہندوستان کے ہندو حکمرانوں کے لئے شہزادی جاہ وغیرہ الفاظ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ ان کے لئے راجہ کا لفظ ہی اپنے صحیح معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی سلطان ترکی کو شاہ ترکی کہے تو بُرا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کے مسلمان بادشاہوں کو جو مغلوں سے پہلے ہوئے سلطان کہتے تھے لیکن مغلوں کو بادشاہ کہتے ہیں۔ اسے اگر اکبر یا جہانگیر کو سلطان کہیں تو ہرگز اکبر بادشاہ یا جہانگیر کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ قیاس کیا جائے گا کہ یہ کسی اور ملک کے حکمراں ہیں۔ اسی طرح سلطان علاؤالدین خلجی یا سلطان محمد تغلق کو اگر بادشاہ کے ساتھ پکاریں۔ تو کچھ اور اشخاص ذہن میں آجائیں گے۔

ایک بند میں راجہ جے چند اپنی لڑکی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :-

جمع ہیں بزم میں دلدادہ و شیدا اکثر ہیں ہوا خواہ ترے اے گُلِ رعنا اکثر

سر ہیں سودا زدۂ زلفِ چلیپا اکثر تیرے پروانے ہیں اے شمعِ دل آرا اکثر

کیا کوئی اور نہیں عقد و فا کے قابل

کتنے دل ہیں گرہِ زلفِ دوتا کے قابل

کیا کوئی باپ اپنی بیٹی سے ایسی گفتگو کر سکتا ہے؟ شعر کہہ لینا تو آسان ہے لیکن ان امور کا خیال نہ رکھنا اور خلاف موقع و محل محض اچھے الفاظ جمع کر دینا شاعری نہیں ہے۔

آپ کی شعر گوئی میں ایک بڑا نقص یہ بھی ہے۔ کہ آپ موقع بے موقع "آہ" کا لفظ بہت استعمال کرتے ہیں۔ میں چونکہ ایک مدت سے آپ کے کلام کو دیکھتا رہا ہوں۔ اس لئے میرا خیال ہو گیا تھا۔ کہ "آہ" کا لفظ آپ کا تکیہ کلام ہے۔ مجھے آپ کے کلام کو پڑھنے سے پہلے "آہ" کا خیال آجاتا ہے میں نے جو یہ نظم پڑھی تو دس بند تک "آہ" کا لفظ نہ آنے سے تعجب ہوا۔ اور میں یہ سمجھا کہ شاید سرور نے آخری نظموں میں "آہ" کو چھوڑ دیا ہے۔ لیکن فوراً ہی یہ شعر پڑھا۔

گیارھویں بند کا پہلا شعر

آہ اجے چند کو کب تھی یہ گوارا تحقیر ہوا برگشتہ ندامت سے مزاجِ دلگیر

اب فرمایئے کہ "آہ" کی یہاں کیا ضرورت تھی۔ بلکہ اس "آہ" نے شعر کو خراب کر دیا۔ کیونکہ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے۔ کہ شاعر اس بات پر افسوس کرتا ہے۔ کہ جے چندر کو یہ تحقیر گوارا نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس حقارت کو اسے پسند کر لینا چاہئے تھا۔ برخلاف اس کے واقعہ یہ ہے کہ شاعر بھی تحقیر کو تحقیر ہی سمجھتا ہے۔ اور اس پہ کوئی اظہارِ افسوس نہیں کرنا چاہتا۔

اسی مسدس کے آخری بند دیکھئے۔ اُن میں تین بند پے بہ پے "آہ" کے لفظ سے پُر ہیں۔ مثلاً

پہلا بند آپ کی آہ بجا لاؤں ہدایت کیونکر توڑوں میں رشتۂ پیمانِ محبت کیونکر

ہو گوارا کسی بیگانے سے نسبت کیونکر اب بنوں غیر کے آغوش کی زینت کیونکر

کسی گردن میں حمائل ہو یہ وہ ہار نہیں

آہ آرائشِ محفل ہو یہ وہ ہار نہیں

دوسرے بند کا شعر:-

نشہ کی چتون جو پھری آہ نصیبا ہو کر پا بہ زنجیر ہوئی شاہدِ رعنا ہو کر

تیسرے بند کا پہلا شعر:-

بیڑیاں آہ! پڑیں پاؤں میں چھاگل بن کر طوق گردن میں رہا حسن کی ہیکل بن کر

اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شاعر حشو و زوائد کا بہت شائق ہے۔ اور جہاں کہیں دیگر الفاظ سے مصرع پورا نہیں ہوتا، شاعر فوراً "آہ" سے اس کمی کو پورا کر دیتا ہے۔ بلا شبہ سرور فارسی الفاظ کا ذخیرہ رکھتا ہے۔ فارسی تراکیب بھی خوب استعمال کرتا ہے۔ نظم میں جوش بھی ہے اور اثر بھی بعض بعض اشعار اچھے ہوتے ہیں۔ مثلاً اسی نظم میں حسب ذیل تشبیہات خوب ہیں۔ اور ان کو حسن بیان کے ساتھ ادا کیا ہے

جمع اس غیرت یوسف کے خریدار ہوئے دولت حسن کے چرچے سر بازار ہوئے

بھونرے منڈلاتے ہوئے سوئے گل تر آئے اُڑ کے فانوس پہ پروانہ مضطر آئے

جلوہ افروز مگر راجہ دہلی نہ ہوا قیس آشفتہ پئے غیرت لیلی نہ ہوا

رُخ گل رنگ پہ گلگونۂ شادی کا وہ رنگ آ سپہ سونے میں سہاگہ تھی جوانی کی اُمنگ

محاورہ سونے پہ سہاگا ہے سونے میں سہاگا نہیں ہے۔ اگر سونے پہ کہا جائے تو پہلا لفظ اس پر ہے اور اس طرح پے پے کی تکرار ہوگی۔ لہذا ہمارے نزدیک یہ مصرع اس طرح پڑھا جائے۔ تو کچھ حرج نہیں ہے؟

"اور سونے پہ سہاگہ تھی جوانی کی اُمنگ"

نظر آیا نہ مگر عقد کے قابل کوئی کر سکا آہ! نہ صیاد کو بسمل کوئی

ایک نظم موسوم بہ پدمنی "مخزن" کے انتخاب میں پڑھی۔ اچھی نظم ہے۔ لیکن بے موقع "آہ" سے یہ بھی خالی نہیں۔ ایک بند میں فرماتے ہیں۔

آہ! اے عشوہ و انداز و ادا کی دیوی آہ! اے ہند کے ناموس و وفا کی دیوی

آہ! اے پرتو انوار صفا کی دیوی اے زیارت کدۂ شرم و حیا کی دیوی

تیری تقدیس کا قایل ہے زمانہ اب تک

تیری عفت کا زباں پر ہے فسانہ اب تک

اس نظم میں سرور نے اس امر کا خیال رکھا ہے۔ کہ اگر "عنوان" نہ بتایا جائے۔ تو پڑھنے والا خود سمجھ سکتا ہے۔ کہ "پدمنی" پر یہ نظم لکھی گئی ہے یعنی سرور نے وہ تمام باتیں بیان کر دی ہیں جو پدمنی سے مختص ہیں۔ بعض نظم لکھنے والے ایسے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ جو عام ہوتے ہیں۔ اور

عنوان کی خصوصیت کا اظہار اپنے شعروں میں نہیں کرتے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ اُن کی نظمیں الفاظ کا گورکھ دھندا ہوتی ہیں۔ طبیعت پر کوئی اثر یا احساس پیدا نہیں ہونے پاتا۔

ایک اور نظم موسوم بہ "مرغ و صیاد" بھی انتخاب مخزن میں دیکھی گئی۔ یہ نظم بھی خوب ہے لیکن بعض اشعار بلحاظ بندش سست ہیں مثلاً:۔

اِک گرفتار قفس نے ہے کہا تم کو سلام ۔۔۔ اور پوچھا ہے مزاج سرو و ریحان چمن

ہے کہا کا ٹکڑا تمام مصرع کو کمزور بنائے ہوئے ہے۔ شاعر کو یہ ٹکڑا بدل دینا چاہیے تھا

خاک اُڑا کر پہلے چپ ہو جائیو باد صبا ۔۔۔ حال پوچھیں کچھ جو میرا ہمصفیران چمن

چپ ہو جائیو فصاحت کے خلاف ہے۔ چپ ہو جانا فصیح ہے۔ حالانکہ یہ مصرع یوں ہو سکتا تھا:۔

"خاک اُڑا کر پہلے چپ ہو جانا اے بادِ صبا"

ایک شعر میں "آہ" پھر موجود ہے:۔

"لوٹتے تھے آہ! دن کو سبزہ زاروں کے مزے"

اگر یہاں بجائے "آہ" "خوب" کہہ دیتے۔ تو کیا بُرائی تھی؟ ۔ ایک مصرع ہے:۔

"سبزہ زاروں کی تھیں سیریں جوئباروں کے مزے"

سیریں جمع سیر استعمال کرنا خلافِ فصاحت ہے۔ اور عوام کا طریقہ ہے۔ یہ مصرع اِس طرح کہا جا سکتا تھا:۔

"سبزہ زاروں کی تھی سیر اور جوئباروں کے مزے"

المختصر کلام میں پختگی نہیں ہے۔ بندشیں سست ہیں۔ آپ دوسرے درجہ کے شاعر ہیں اور اس درجہ میں بھی معمولی مقام پر ہیں۔ کوئی وجہِ امتیاز حاصل نہیں ہے۔ البتہ سرور کی تعریف یہ ہے کہ اُس نے اُس زمانہ میں جب کہ تغزل کا دور تھا۔ اپنی طبیعت کو نظم کہنے پر مائل کیا اور اردو شاعری میں کچھ اضافہ کیا۔ ذیل میں منتخب کلام ہدیۂ ناظرین ہے:۔

"بیر بہوٹی"[1]

آہ! او ننھے سے کیڑے! نازشِ صحرا ہے تو ۔۔۔ دشت میں اک سرخ چھوٹا سا گُلِ رعنا ہے تو

صفحۂ ہستی پہ اک نقشِ تحیر زا ہے تو ۔۔۔ شعلۂ رخسارِ حسن کی چھوٹی سی اک دنیا ہے تو

---

[1] "یہ نظم ادیب الہ آباد اگست ۱۹۱۰ء سے نقل کی گئی ہے"

برقِ عالم سوز کی ننھی سی ہیکل ہے کوئی
آتشِ یاقوت کی چھوٹی سی منقل ہے کوئی

کچھ عجب عالم ہے تیرے حسن کے انداز کا
سرخ ڈورا ہے کسی چشمِ فسوں پرداز کا
قطرۂ مضطر ہے خونِ کشتگانِ ناز کا
قلب خوں گشتہ ہے مژگاں پہ کسی جانباز کا

یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پر جلوہ گر
جامِ زریں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

گل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویرِ حسن
خونِ عاشق یا زمیں پر ہے گریباں گیرِ حسن
یا عقیقِ سرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیرِ حسن
نقشِ نیرنگِ فسوں ہے یا کوئی تصویرِ حسن

جلوۂ گل ہے فضائے وادیٔ پُرخار میں "
سرخ تکمہ ہے قبائے سبزۂ کہسار میں "

محضرِ خونِ شہیداں ہے ترا دامانِ سرخ
یا ہے خونِ کشتگانِ عشق کا عنوانِ سرخ
یا کسی کے ناوکِ پُرخوں کا ہے پیکانِ سرخ
اشکِ گلگوں یا ہے زیبِ پنجۂ مژگانِ سرخ

رنگ آمیزی ہے قدرت کی تری تصویر میں
اک دلآویزی ہے قدرت کی تری تصویر میں

حسن میں تیرے ہے اسے ناطورۂ نازآفریں
فندقِ پائے حسیناں کی ادائے دلنشیں
جلوۂ رخ سے ترے گلگوں ہے دامانِ زمیں
بزمِ صحرا میں ہے تو جامِ شرابِ آتشیں

بادۂ گلگوں ترے چھوٹے سے پیمانے میں ہے
عالمِ نیرنگِ افسوں تیرے میخانے میں ہے

وادیٔ پُرخار میں اک مجمرِ سوزاں ہے تو
دامنِ کہسار میں اک شعلۂ عریاں ہے تو
کشتِ زارِ حسن میں اک دانۂ مرجاں ہے تو
یا کسی گلگوں قبا کا گوشۂ داماں ہے تو

ناز ہے صحرا کو تیری شوخیٔ رفتار پر
دوڑتا ہے خوں کا قطرہ سبزۂ کہسار پر

گل بداماں ہے کوئی دوشیزۂ کمسن مگر
ہلکی پھلکی سرخ پھولوں کی ہے چادر دوش پر
وقفِ رعنائی ہے یا کوئی عروسِ سیمبر
روئے زیبا پر ہے غازہ سرخ جوڑا زیب پر

لوٹتا ہے کوئی بسمل سبزۂ بیگانہ پر

یا مئے گلگوں کا قطرہ ہے لب پیمانہ پر

جلوۂ گل سے ہے رنگیں روئے زیبائے بہار　　نازنیں ہے یا کوئی محوِ تماشائے بہار
یا مئے گلرنگ سے گلگوں ہے مینائے بہار　　یا ہے آغشتہ بخوں داغِ سویدائے بہار

سبزۂ کہسار نے یا لعل ہے اُگلا کوئی "
چن رہی ہے پھول یا دوشیزۂ رعنا کوئی

جلوۂ اُمید

شب کہ وقفِ بالشِ تسکیں، دلِ بیتاب تھا　　عالمِ رویا میں، میں سرمستِ ذوقِ خواب تھا
بس کے پھولوں میں عجب انداز سے بادِ نسیم　　چل رہی تھی بھینی بھینی، ناز سے بادِ نسیم
نیلا نیلا سامنے تھا اک سہانا کوہسار　　جس کے دامن میں رواں تھا ایک دلکش آبشار
پڑ رہی چوٹی پہ تھیں سورج کی کرنیں زرد زرد　　ٹھنڈی ٹھنڈی روح پرور تھی عجب کچھ بادِ سرد
آسماں پر اک لوا تھا زمزمہ ریزِ نشاط　　اور شفق آلودہ تھا، دامانِ صبحِ انبساط
جلوہ آرا تھی لبِ ساحل پہ اک تصویرِ حسن　　پاک دامانی کا پُتلا، شعلۂ تنویرِ حسن
بزمِ قدرت کے مناظر تھے اگرچہ دلنشیں　　نقشِ حسرت تھی مگر وہ لعبتِ ناز آفریں
گل سے رخساروں پہ تھی آہستہ آہستہ فغاں　　ماجرائے دردِ دل کرتی تھی یوں رو کر بیاں

او مری آنکھوں کے تارے او مرے نورِ نظر　　او مرے دلبند، او آسائشِ قلب و جگر
تم کو میرے شیوۂ مہر و محبت کی قسم　　تم کو ماں کی مامتا، اور ماں کی شفقت کی قسم
تم کلیجے کی ہو ٹھنڈک تم مرے دل کا سرور　　پتلیوں کی روشنی ہو اور مری آنکھوں کا نور
قابلِ عبرت ہے اب افسوس اردوادِ وطن　　تم رہو گے آہ کب تک خانہ بربادِ وطن
اپنے یارانِ وطن کو تم نہ پہچانو گے کیا　　ہمصفیرانِ چمن کو تم نہ پہچانو گے کیا
کیا کشاکش میں رہیں گے یوں ہی ارکانِ وطن　　جمع ہوں گے کیا نہ اجزائے پریشانِ وطن
حیف! تم کو ہے مرے دردِ نہاں کی بھی خبر　　مر رہی دکھیا ہے کچھ ہے پیاری ماں کی بھی خبر
میں نے کس کس ناز و نعمت سے تمہیں پالا ہے آہ　　میں نے جھیلیں ہیں جو کڑیاں میری شفقت ہے گواہ

ہ یہ نظم "زمانہ" بابت ماہ ستمبر ۱۹۱۰ء سے نقل کی گئی

تم مرے لختِ جگر ہو، میری خدمت فرض ہے
بڑھ گئی ہے حد سے اب ناچاریٔ اہلِ وطن

پالا پوسا ہے تمہیں، ماں کی اطاعت فرض ہے
تم پہ لازم آہ! ہے غمخواریٔ اہلِ وطن

قلبِ نازک میں ادھر اک مجمعِ اندوہ تھا
ارغوانی تھیں اُدھر عکسِ شفق سے چوٹیاں
تھیں سہانی وادیاں اور پُر فضا تھا کوہسار
وہ صدا تھی یا مسرّت کا ترانہ تھا کوئی

اور شریکِ نالۂ پیہم سکوتِ کوہ تھا
نیلی نیلی تھی عجیب دلکش فضائے آسماں
چل رہی تھی جھُوم کر بادِ صبا مستانہ وار
خواب و راحت کا مگر دلکش فسانہ تھا کوئی

رخصت اے عہدِ گزشتہ! رخصت اے ایّامِ غم
سہتے سہتے قوم کو غم آہ! صدیاں ہو گئیں
دُور ہونے والی ہے اب گردشِ لیل و نہار
قوم و ملّت کے بکھیڑے ختم ہونے والے ہیں
پھیلتی جاتی ہے پھر حبِّ وطن کی روشنی
آ رہا ہے ہند میں پھر کاروانِ اتحّاد
قیدِ قوم و رنگ و ملّت دُور ہونے والی ہے

صبحِ عشرت سے بدلنے والی ہے اب شامِ غم
آرزوئیں کتنی مٹ کر، خانۂ ویراں ہو گئیں
آ رہا ہے امن و آسائش کا دورِ روزگار
موجِ طوفاں کے تھپیڑے ختم ہونے والے ہیں
ہو چلی ہے تیز شمعِ انجمن کی روشنی
یعنی قائم ہونے والی پھر ہے شانِ اتحّاد
ظلمتِ شب ہائے غم کا فور ہونے والی ہے

لے کے آئی جب صدا یہ جنبشِ بادِ سحر
جن لبوں پہ تھی ابھی آہستہ آہستہ فغاں
یاس و حرماں کا مرقع جو دلِ صد پارہ تھا

چھا گیا تسکین کا اک عالم دلِ بیتاب پہ
مسکراہٹ آ گئی تھی اب دلکش جھلک اُن پر عیاں
اب جو دیکھا، آرزوؤں کا وہ اک گہوارہ تھا

خوشنما چوٹی ہمالہ کی تھی اک پیشِ نظر
ہلکی ہلکی کچھ عجب تسکیں فزا تھی روشنی
روئے روشن کی ضیا تھی جلوہ افروزِ نشاط
نجم نورانی نہ تھا اک کوکبِ اُمید تھا
کچھ عجب دلکش ادا سے تھا فلک پہ جلوہ گر

تھا سکوتِ شب میں اس پہ اک ستارہ جلوہ گر
پیاری پیاری تھیں شعاعیں، دلربا تھی روشنی
تھا فروغِ حسنِ دلکش، شمعِ بزمِ انبساط
پہ تو حسنِ ازل تھا جلوۂ جاوید تھا
تھا نگاہِ ناز کا جادو تسلط خلق پہ

یہ وہ جادو تھا، دلوں پر جس نے افسوں کر دیا ۔۔۔ موتیوں سے دامنِ اُمید جس نے بھر دیا
تھے پریشاں آہ! اک مدت سے جو اجزائے قوم ۔۔۔ متحد ہو کر وہ آخر بن گئے شیدائے قوم
بھائی بھائی آہ! جو برسوں سے تھے بچھڑے ہوئے ۔۔۔ تھے جو زنجیرِ نفاق قوم میں جکڑے ہوئے
اِن میں یکرنگی کا عالم پھر نظر آنے لگا ۔۔۔ اور ہم آہنگی کا عالم پھر نظر آنے لگا
سونے والو! خواب سے چونکو سحر ہونے کو ہے ۔۔۔ آفتابِ حبِّ قومی جلوہ گر ہونے کو ہے

ستی[1]

اے ستی اے جلوہ گاہِ شعلۂ تنویرِ حسن ۔۔۔ پاک دامانی کا نقشہ ہے تری تصویرِ حسن
یہ تنِ نازک ترا یہ شعلہ ہائے آتشیں ۔۔۔ یہ چتا کی آتشِ سوزاں یہ جسمِ نازنیں
صاعقہ ہے برق کا تیرے دلِ مضطر کی آگ ۔۔۔ پھونک دیتی ہے تجھے سوزِ غمِ شوہر کی آگ
ہند کو ہے ناز تیری ہمتِ مردانہ پر ۔۔۔ تو چراغِ کشتہ ہے خاکسترِ پروانہ پر
آگ میں ہے تو سپندِ شوقِ جلنے کے لئے ۔۔۔ شمعِ ماتم ہے شبِ غم میں پگھلنے کے لئے

گرمیٔ ہنگامۂ محشر تری محفل میں ہے
سرد جو ہوتی نہیں وہ آگ تیرے دل میں ہے

---

[1] یہ نظم ادیب نومبر [illegible] میں چھپی تھی۔ اس میں سے چند اشعار نقل کئے گئے۔

خاتمہ

افسوس ہے یہ بزرگ ہم سے رخصت ہو کر آرام کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ہم نے آہِ پُرسوز سے ان کا ماتم کیا۔ ان کے غم میں سوگوار رہے۔ لیکن ان کے پہلے شعرا کی پانچ محفلیں گرم ہو ہو کر ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔ یہ محفل بھی آخری قانونِ قدرت کے تابع تھی۔ کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ یہ بزم برہم نہ ہوتی۔ اللہ اللہ کیسے پاک طینت اور پاکیزہ خیال بزرگ تھے۔ ان صاحبوں نے ہمارے لئے شاعری کا بیش بہا خزانہ چھوڑا۔ ہمارے خیالات کے اظہار کے لئے کیا کیا روشیں نکالیں۔ کیا کیا گلکاریاں کیں۔ اور مضامین کے کیسے کیسے چمنستان ہم کو عطا کر گئے۔ نئی راہیں بنا گئے۔ اور زادِ سفر دے گئے۔ اب ہمارا زمانہ آگیا ہے۔ دیکھئے ہم زمینِ شعر میں کیا کیا گل کھلاتے ہیں۔

دورِ ہفتم

(سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک)

تمہید

لیجئے!! اب ہمارا زمانہ آگیا ہے۔ اگلے بزرگ ہمارا ساتھ چھوڑ کر عدم آباد کو تشریف لے گئے اور ہم ہکا بکا رہ گئے۔ کوئی آزمودہ کار نہ تھا۔ جو راہ کی صعوبت کو اپنے مشوروں سے آسان بنا دیتا لاچار ہم اپنے بل بوتہ پر اُٹھ کھڑے ہوتے اور میدانِ شاعری میں چکر لگانے لگے۔ زمانہ کی لکد کوبی نے دل میں درد اور آنکھوں میں آنسو پیدا کر دئے۔ اگلوں کے کلام کو خوب غور سے پڑھا۔ محاورات اور الفاظ کو دھیان میں رکھا۔ گذشتہ دَور کے بزرگوں کے سامنے شعر کہنا تو شروع ہی کر دیا تھا۔ اور ان کی اصلاح اور ہمت افزائی سے کچھ بات بھی پیدا کرنے لگے تھے۔ اب دماغ پر جو زور دیا۔ تو فلکِ ہفتمیں پر ہمارا بھی تخیل پہنچنے لگا۔ اور ہم نے بھی بلند پروازی شروع کر دی۔ ایک صاحب جو صورت و شکل کے لحاظ سے متشاعر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن باطناً شعر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بحرِ سخن میں ایسے غوطے لگاتے ہیں کہ صرف درِ شاہوار لے کر نکلتے ہیں اور جب بلند اڑتے ہیں۔ تو بامِ عرش پر جا کر دم لیتے ہیں ان کی شہرت چار دانگِ ہند ہی میں نہیں۔ بلکہ تمام عالم میں ہے۔ دوسرے صاحب آسمان سے تارے توڑ کر لاتے ہیں۔ تصوف کی روشنی میں یہ ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں اور اپنے گوشۂ عزلت میں چپکے چپکے کچھ کہے جاتے ہیں۔ مشتاقانِ کلام جو کچھ سُن پاتے ہیں اُسے لے اُڑتے ہیں۔ خود بھی سر دُھنتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی مستِ الست بنا دیتے ہیں۔ تیسرے صاحب سادگیِ وضع کے قائل ہیں۔ لیکن

اشعار میں مومن خانی تراکیب برتتے ہیں۔ رنگ وہی پرانا ہے۔ لیکن جدید خیالات اور طرزِ بیان سے مُردہ میں جان ڈال دی ہے۔ یعنی تغزل کو ازسرِ نو زندہ کیا ہے۔

اِس دَور کے شعرا بکثرت ہیں۔ شاید اتنے شاعر جن کا درجہ بھی بلند ہو کسی دَور نے پیدا نہیں کئے۔ اقبال سب سے پیش پیش ہیں۔ ان کی قوتِ متخیلہ کے سامنے سب کا جوش ٹھنڈا ہو جاتا ہے اُن کی بلند پروازی اور مسائلِ زندگی کے ہر شعبہ پر مضمون آفرینی نے شعرائے ماسبق پر بھی ترجیح دینے کی سفارش کر دی ہے۔ لیکن شادِ عظیم نے وزیرِ زبان سے صلاح لی اور اس نے بیسیوں غلطیاں نکال دیں اور کہا کہ یہ شاعر استاد کے درجہ کو نہیں پہنچتا۔ اس کی بلند آہنگی خواہ اس کو چرخِ چہارم پر پہنچا دے۔ لیکن اس کی خامیٔ زبان بحیثیت شاعر اس کے مدارجِ اعلیٰ طے کرنے میں ہمیشہ حارج رہے گی۔ حسرت کا اسے احسان سمجھو یا نقصان کہ اس نے تغزل کو برقرار رکھا۔ اگر اس دَور کے شعرا حسرت کا ساتھ نہ دیں اور غزل گوئی میں ہر نوع اور ہر نہج کے خیالات بطرزِ نو ادا نہ کریں۔ تو یہ بیمار کب کا رخصت ہو گیا ہوتا۔ اصغر کے تصوف کی چاشنی نے سب کو شیریں دہاں بنا دیا۔ فانی اور جگر کے نغماتِ دلکش اپنی صدا سے سب کو تڑپانے لگے۔ لہذا یہ دَور اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکا کہ تغزل کا یہ بیمار جس کو دِق ہو چکی ہے۔ موت کی گہری نیند سو رہا ہے۔ مگر اب وہ زمانہ دُور نہیں ہے جب یہ کہن سال اپنے مرضِ مزمنہ کا شکار ہو کر دُنیائے ہند سے رخصت ہو جائے گا۔ اُس وقت ہم سب مل کر "خس کم جہاں پاک" کہیں گے۔

اکثر مسلمان صاحبان سمجھتے ہیں کہ اہلِ ہنود اُردو زبان میں مسلمانوں سے کم رتبہ ہیں۔ اور اسی طرح شیعہ صاحبان سمجھتے ہیں۔ کہ اُردو شاعری اُن کے گھر کی لونڈی ہے۔ لیکن یہ دونوں مفروضات ان آخری ادوار میں بین طور پر غلط ثابت ہوئے۔ چکبست، سرور، ساحر، برق، کیفی، نظر وغیرہ کے کلام کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ کسی مسلمان شاعر سے کم درجہ پر ہیں۔ اسی طرح حالی، داغ، اکبر، امیر مینائی اور اقبال، حسرت، اصغر، جگر، فانی، وحشت وغیرہ جو سنّی المذہب ہیں۔ کسی شیعہ شاعر سے کم رتبہ نہیں ہیں۔

طبقۂ اوّل

اقبالؒ

محمد اقبال نام اور اقبال تخلص ہے۔ آپ کشمیری ہیں۔ لیکن آپ کے جدِّ امجد تقریباً ڈھائی سو برس گزرے کہ مسلمان ہو گئے۔ خود سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں لاہور کالج میں داخل ہوئے۔ اور ایم۔ اے پاس کرکے اورنٹیل کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ اِس کے بعد انگلستان پہنچے۔ وہاں کمبرج میں کامیابی کے ساتھ وقت ختم کیا۔ اور جرمنی گئے۔ اور اس طرح علمی دنیا کے اعلیٰ مدارج طے کرکے واپس آئے۔ اقبال نے یورپ کے قیام کے زمانہ میں بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور اس مطالعہ کا خلاصہ ایک محققانہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جسے فلسفۂ ایران کی مختصر تاریخ کہنا چاہئے۔ اسی کتاب کو دیکھ کر جرمنی والوں نے شیخ محمد اقبال کو "ڈاکٹر" کا علمی درجہ دیا۔ سرکار انگریزی نے بھی از راہِ قدردانی "سر" کا خطاب عطا کیا۔

آپ نے سیالکوٹ میں علومِ مشرقی شمس العلماء مولوی سید میر حسن مرحوم سے پڑھے۔ میر صاحب کی تعلیم کا یہ خاصہ تھا کہ اگر کوئی اُن سے فارسی یا عربی سیکھتا۔ وہ اس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے تھے۔ اقبال کی خوش قسمتی تھی۔ کہ ابتدائے عمر میں مولوی سید میر حسن سا اُستاد ملا۔ بعد ازاں لاہور میں پروفیسر آرنلڈ (جو بعد میں سر ٹامس آرنلڈ ہو گئے تھے) جیسا شفیق اُستاد اور غیر معمولی قابلیت کا شخص ملا۔

اقبال معترف ہے کہ جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے ڈالی تھی۔ اور جسے درمیان میں داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا۔ اُس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے

سے طے ہوئے۔ داغ کی شاگردی کے متعلق کہتے ہیں

نسیم تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخن داں کا

اقبال کو اپنی علمی منازل طے کرنے میں اچھے اچھے رہبر ملے۔ اور بڑے بڑے علماء سے سابقہ پڑا۔ ان لوگوں میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ، براؤن، نکلسن اور سارلی قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر نکلسن نے اقبال کی مشہور فارسی نظم "اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ کرکے اور اس پر دیباچہ اور حاشی لکھ کر یورپ اور امریکہ کو اقبال سے روشناس کیا۔ اسی طرح ہندوستان کی علمی دنیا میں جتنے نامور اس زمانہ میں موجود تھے مثلاً مولانا شبلی مرحوم، مولانا حالی مرحوم، اکبر مرحوم سب سے اقبال کی ملاقات اور خط وکتابت رہی۔ اور ان کے اثرات اقبال کے کلام پر اور اقبال کا اثر ان کی طبائع پر پڑتا رہا۔

ابتدائی مشق کے دنوں کو چھوڑ کر اقبال کا اردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ رسالہ مخزن ۱۹۰۱ء سے نکلنا شروع ہوا۔ تو شیخ عبدالقادر نے اقبال کا کلام اپنے رسالہ میں شائع کرنا شروع کیا۔ اور اس طرح اس ہونہار شاعر کا ہندوستان کی ادبی دنیا نے خیر مقدم کیا۔

بانگِ درا کے دیباچہ نگار نے اقبال کے پدر بزرگوار کے نام اور اقبال کی تاریخ پیدائش سے ہمیں محروم رکھا۔ ممکن ہے کہ سر عبدالقادر کو ان دونوں باتوں کا علم نہ ہو۔ لیکن وہ بآسانی معلوم کر سکتے تھے۔ اتفاق سے ایک رسالہ میں تاریخ پیدائش ۱۸۷۷ء نظر سے گزری۔ اور یہ ناقابلِ معافی کمی پوری ہوگئی۔ اسی طرح ان کے والد کا نام نور محمد معلوم ہو گیا۔

اقبال نے سیالکوٹ ہی میں کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کردی تھی۔ اُن دنوں نواب مرزا خاں داغ دہلوی کا بہت شہرہ تھا۔ جو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اصلاح نہیں لے سکتے تھے۔ وہ خط وکتابت کے ذریعہ دور ہی سے ان سے شاگردی کی نسبت پیدا کرتے تھے۔ غزلیں ڈاک میں ان کے پاس جاتی تھیں۔ اور وہ اصلاح کے بعد واپس بھیجتے تھے۔ اقبال نے بھی انہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لئے بھیجیں۔ مگر یہ سلسلۂ تلمذ بہت جلد ختم ہو گیا۔ جبکہ داغ نے لکھ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔

فارسی میں اقبال نے "اسرارِ خودی"، "رموزِ بیخودی"، "پیامِ مشرق"، "زبورِ عجم اور جاوید نامہ

پانچ کتابیں لکھی ہیں۔ اُن کی نسبت کچھ عرض کرنا ہمارے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔ اُردو میں ایک کتاب علم الاقتصاد بھی ڈاکٹر اقبال کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ مگر چونکہ وہ نثر میں ہے۔ اِس لئے اُس سے بھی ہمیں سروکار نہیں ہے۔ البتہ آپ کا اُردو مجموعۂ کلام "بانگِ درا" "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" کے نام سے علیحدہ علیحدہ شائع ہوا ہے۔ لہٰذا ہم اُس کے متعلق اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ (یہ مضمون غالباً اپریل ۳۸ء سے کچھ دنوں پہلے ختم کر دیا تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہماری کتاب چھپنے سے قبل ہی ڈاکٹر اقبال ملکِ عدم کے راہی ہو جائیں گے۔ افسوس! آپ کا انتقال اپریل ۳۸ء کو ہوگیا۔ اور تمام ہندوستان آپ کے غم میں ماتم کدہ بن گیا۔ ہم نے یہ مضمون بجنسہٖ قائم رکھا ہے۔ اور انتقال کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ جہاں جہاں مرحوم سے خطاب کیا گیا ہے۔ یہ ان کے دورانِ حیات کی طرف اشارہ کرتا ہے)

کلام پر تبصرہ

جب اقبال نے میدانِ شاعری میں قدم رکھا۔ تو سب سے پہلے ایک مشاعرہ میں غزل پڑھی جس کا یہ شعر مشہور ہوگیا:۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے ۔۔۔ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اگرچہ اقبال کے کمال نے اس درجہ ترقی کی ہے۔ کہ یہ ابتدائی شعر اُس کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتا لیکن اس کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا کہ یہ شعر اُن کے جملہ کلام پر صحیح انتقاد کا کام دیتا ہے۔ اِس شعر کا تخیل پتہ دے رہا ہے۔ کہ اس کا مصنف قوتِ متخیلہ سے مالا مال ہے۔ اِس شعر کے مضمون سے صاحبِ شعر میں خوفِ خدا اور شانِ رحیمی پر بھروسہ کرنا بھی پایا جاتا ہے۔ یہ شعر اسلامی عقیدہ کا بھی حامل ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس میں یہ ٹکڑا "سمجھ کے" بہت بُرا ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ میاں کو دھوکا ہوا۔ کہ عرقِ انفعال کے قطروں کو وہ موتی سمجھا۔ حالانکہ اُس کی ذاتِ پاک فریب میں آنے وغیرہ سے منزّہ ہے۔ اگر اقبال بجائے "موتی سمجھ کے" یہ کہتے کہ"

"موتی نہ تھے کہ شانِ کریمی نے چن لئے"

تو اُن کا مطلب صاف ہو جاتا اور یہ نقص باقی نہ رہتا شاعر کا مطلب تو صرف یہ تھا کہ اُس نے میرے آنسوؤں کی قدر کی۔ اور میری خطاؤں کو معاف کر دیا۔ لیکن جس خوبی کے ساتھ یہ مضمون

ادا ہونا چاہئے تھا۔ اُس سے وہ قاصر رہا۔

بعینہٖ اقبال کی شاعری کا یہ حال ہے۔ کہ تخیل قدم قدم پر پایا جاتا ہے۔ اسلامی عقیدت و محبت، درسِ اخوت، بلند نظری، عالی حوصلگی غرض سب کچھ ہے لیکن خدا کی شان میں گستاخیاں بھی ہیں۔ اور زبان کے اسقام بہت ہیں جو ایک ایسے بڑے شاعر کے لئے ہرگز زیبا نہیں ہیں۔ تعقید بھی اکثر پائی جاتی ہے۔ جو اُن کے کلام کو پیچ در پیچ بنا دیتی ہے۔ ہاں اسی کے ساتھ فارسی تراکیب کی عمدگی، نادر تشبیہات اور جوشِ مستی بھی ہے۔ جو اُن کے اشعار کو مقبولِ عام بنانے میں مدد دیتی ہے۔

۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء میں میرے ایک ہم جماعت نے (جو پنجاب سے کچھ تعلق رکھتا تھا۔ اور جس نے اقبال کو ترنم کے ساتھ اپنی نظم پڑھتے سُنا تھا) مجھ سے کہا۔ کہ اقبال نظم خوب پڑھتا ہے۔ اور سامعین کو رُلاتا ہے۔ چنانچہ ایک دو شعر اس نے اقبال کے لہجہ کی نقل کر کے سُنائے۔ اور ہمیں معلوم ہوا۔ کہ یہ کوئی نیا شاعر پیدا ہوا ہے۔

۱۹۰۷ء میں رسالہ مخزن میں نے اپنے نام جاری کرایا۔ اور اسی طرح اقبال کے کلام کو دیکھنے کا موقع ملا۔ غالباً ۱۹۱۲ء میں ایک دن مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی سے بھی اقبال کے متعلق کچھ گفتگو ہوئی۔ وہ اقبال کے کلام میں باعتبار فن بہت غلطیاں سمجھتے تھے۔ اور اس کے کلام کو کچھ زیادہ پسند نہ کرتے تھے۔ اُسی زمانہ میں ایک روز خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے یہاں جو گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ وہ ایک نئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اور انہوں نے ایک جگہ سے کچھ عبارت مجھے پڑھ کر سنائی۔ جس میں اقبال کا ذکر حافظ و غالب کے ساتھ کیا گیا تھا۔ فرمانے لگے کہ پنجابی اصحاب میں "حسِ تناسب" نہیں ہے۔ وہ اپنے یہاں کے شاعر کو دُنیا کے ہر بڑے شاعر سے ٹکرا دیتے ہیں۔ کہاں حافظ و غالب اور کہاں اقبال! غالباً یہ کتاب مرزا سلطان احمد مرحوم کی تھی جو انہوں نے شاعری کے متعلق لکھی ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کہ میری رائے اقبال کے متعلق شروع ہی سے خراب ہو گئی تھی۔ مَیں نے اس تذکرہ میں اپنی قدیم آراء کو جو شاعروں کے متعلق تھیں جگہ نہیں دی۔ بلکہ اُن کے کلام کا تمام و کمال مطالعہ کرنے کے بعد جو رائے قائم ہوئی اُس کو درج کیا ہے۔ مَیں کسی کی رائے سے ہرگز متاثر نہیں ہوتا اور اکثر تو ایسا کرتا ہوں۔ کہ کسی شاعر کے کلام کو پڑھنے کے بعد جو کچھ اپنی رائے ہوتی ہے۔ اُسے لکھ لیتا ہوں۔ اور اس کے بعد کسی اور شخص یا صاحبِ تذکرہ کی رائے دیکھتا ہوں۔ خواہ وہ میری رائے کے خلاف ہو یا موافق۔ اور جہاں کہیں کسی صاحبِ تذکرہ کی رائے سے مجھے اتفاق نہیں ہوتا، مَیں اُس

کا بھی اظہار کر دیتا ہوں۔

میں یہ دیکھتا رہا ہوں۔ کہ بعض اصحاب اقبال کی تعریف میں بیحد غلو سے کام لیتے ہیں۔ اور بعض اصحاب اُس کی شاعری میں نقائص نکالنے کے درپے رہتے ہیں۔ مجھے دونوں قسم کے صاحبان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ میں اُن لوگوں کو بھی نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ جو اقبال کی محض خوشنودیِ مزاج حاصل کرنے کے لئے تاکہ کبھی آیندہ زمانہ میں اس تعارف سے کام لیا جاسکے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور ان کے کلام پر ایک اُلٹا سیدھا مضمون جس میں زیادہ تر اقبال کی مدح و ستائش کی جاتی ہے چھپوا دیتے ہیں۔ اسی طرح میں ان لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔ جو خواہ مخواہ نکتہ چینی اور عیب جوئی سے کام لیتے ہیں۔

"اقبال" شاعر ہے اور شاعر بھی ایسا کہ اُس کو صفِ اوّل میں جگہ دی جائے۔ ہماری شاعری میں تغزل نے ایسی جگہ گھیر لی تھی کہ کسی اور صنفِ کلام کی گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی۔ جن شاعروں نے مرثیے لکھے۔ تو اُن کو لوگوں نے بہ حقارت یہ کہنا شروع کیا کہ بگڑا ہوا گویا قوال اور بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو۔ جب انیس اور دبیر کی باری آئی۔ اور انہوں نے مرثیہ کو درجِ کمال پر پہنچا دیا۔ تو غزل گو شعراء کو چار و ناچار مرثیہ گویوں کو بھی شعراء کے زُمرہ میں داخل کرنا پڑا۔ اسی طرح حالی اور آزاد کی نظموں کو غزل گو شعرا نے اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ اور ہمیشہ اس کی مخالفت کی لیکن زمانہ ایک بہت بڑا مصلح ہے۔ چونکہ انگریزی زبان کے عام رواج نے لوگوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اور اُن میں وسعتِ نظر پیدا ہو گئی تھی، اس لئے قدیم روایات کے حاملوں کی کچھ پیش نہ گئی۔ اور نوجوانوں کے دلوں میں قدیم شاعری سے تنفر اور جدید شاعری سے دلچسپی بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی۔ اب بھی بعض "پرانی لکیر کے فقیر" غزل گوئی کو معراجِ کمال سمجھتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر رجحانِ طبیعت نظموں کی طرف ہو گیا ہے۔ اور محض غزل گو خال خال نظر آتے ہیں

بہر حال "اقبال" نے حالی کی قومی شاعری سے متاثر ہو کر حالی کی تقلید کا مصمم ارادہ کر لیا اور اُس نے جو کچھ لکھا سلیقہ سے لکھا حالی کی نظمیں بے شک دلآویز ہیں۔ اور صفائی اور سادگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ لیکن اقبال، غالب کے تخیّل سے بہت متاثر معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے اندازِ بیان نے اُس کو اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ اس لئے اس نے حالی کا تتبع محض اپنے وارداتِ قلب کو غزل کی بجائے نظم میں ادا کرنے کے لئے کیا ہے۔ ورنہ درحقیقت اس نے غالب کے اندازِ بیان کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ اور اس کی تخیّل کو اپنا ہادی سمجھا ہے۔ حالی کے کلام میں دلسوزی

اور مرثیہ خوانی پائی جاتی ہے۔ جس کو پڑھ کر نوجوان طبیعتیں متاثر ہوتی ہیں۔ اور آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں۔ اپنے اسلاف کی قدر و عظمت قائم ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی بے بسی بھی دل پر منقش ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ حالی نے بھی لوگوں کو ابھارنے اور ان میں اُمنگ اور ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اُن کی نصیحت آمیز باتیں خشک ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور رنگینیٔ بیان سے معرا ہیں۔ اس کے برعکس اقبال بلند پرواز ہے، اس کا فلسفہ جہاں مفہوم میں پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ وہاں اس کی فارسی تراکیب کی دلکشی اور نادر تشبیہات کی عمدگی کو اپنے مقام سے گزرنے نہیں دیتیں۔ وہ بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور ناظرین کو بھی اپنے آسمانِ تخیل کی سیر کراتا ہے۔ اس کی مستی و سرخوشی اس کی بلند آہنگی، بانگ درا کی طرح کارواں کو اپنے پیچھے پیچھے چلے آنے کا اشارہ کرتی رہتی ہے۔ شاعر کبھی آسمانوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اور کبھی قعرِ بحر میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ لیکن اُمنگ اور ولولہ کبھی اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ وہ حالی کی طرح خود روتا ہے۔ نہ اوروں کو رلاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ آہ ضرور کرتا ہے۔ لیکن فوراً "ہشیار باش" کہہ کر قدم مارنے لگتا ہے۔ الوالعزمی اور خودداری کا سبق دیتا ہے۔ اور مسلمانوں میں اخوت اسلامی کو دوبارہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ کاش! حالی کی طرح اُس کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا۔ تاکہ اُس کے قول و فعل میں تطابق پیدا ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو اس کا کلام ایک آتش فشاں پہاڑ بن جاتا جس کی آگ کے شعلے دلوں کی گہرائیوں میں اُتر کر داغ جگر پیدا کر دیتے۔ جو کبھی مٹائے نہ مٹتے۔ اور آفتاب کی طرح روشن ہو کر رہتے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ ہم کو شاعر کے کلام سے مطلب ہے نہ کہ اُس کے افعال سے؟ وہ غالباً اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں۔ کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" اگر شاعر کا کام "پیغام" پہنچانا ہے اور سردہ دلوں میں روح اور تازگی پیدا کرنا ہے۔ تو اُس کو ایک ہادی کی طرح پاک و صاف رہنا اور برائیوں سے بچنا چاہیئے ورنہ اس کی بات کا کیا اثر ہوگا۔ اور اس کا کلام اگر محض الفاظ کا مجموعہ نہ سمجھا جائیگا۔ تو اور کیا کہا جائیگا؟" ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

شاعر کو اپنے مجموعۂ اضداد ہونے کا بھی احساس ہے۔ چنانچہ خود کہتا ہے:۔

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال! تو　　رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے

جبینِ شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز   کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے

ہمارا قیاس ہے۔ کہ اقبال نے "مثنوی مولوی معنوی" کا خوب مطالعہ کیا ہے حکمت و فلسفہ کالج کی تعلیم، پروفیسر آرنلڈ کی صحبت، مغربی ممالک کی سیر و شاگردی نے سکھایا۔ اور اس کو خوبی کیساتھ بیان کرنا مثنوی مذکور نے بتا دیا۔ فارسی تراکیب کی ساخت اور تخیل کی بلند پروازی مرزا غالب کے کلام نے سکھا دی، حالی کے کلام نے قومی لگن لگا دی اور ہدایت کی۔ کہ وہ اس قسم کی شاعری کرے۔ اگر اقبال اپنی شاعری کے لئے من حیث المجموع کسی کا ممنونِ احسان ہے۔ تو اس کو مرزا غالب مرحوم مولانا حالی مرحوم اور مولانا ئے روم رحمتہ اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ کہ جن کے کلام بلاغت نظام کے مطالعہ نے اس درجہ پر پہنچا دیا۔

ہمارا خیال ہے۔ کہ اقبال اپنا پیغام عام مسلمانوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اگر اس کے مخاطب صرف خواص ہیں۔ تو وہ اپنا کام پورا کر چکا۔ لیکن خواص ہیں جو بے حسی اور جھجک ہے۔ اس کے لحاظ سے اس نے اپنا پیام گویا پتھروں کو پہنچایا ہے۔ جو ٹس سے مس نہیں ہونگے۔ اس لئے اگر اس کا مقصد حقیقتاً لوگوں میں اخوتِ اسلامی کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اور اسے اسلام سے محبت ہے۔ تو اسے چاہیئے کہ وہ اپنی شاعری کا رُخ پھیر دے۔ بیشک آسان الفاظ میں حکمت و معانی کی باتیں نگین ادائی کے ساتھ بیان کرنا مشکل ہے۔ اور قدم قدم پر اس کو مشکلات کا سامنا ہوگا۔ لیکن لوگ اس کو علامہ کہتے ہیں۔ اور اس کے صاحبِ فضل و کمال ہونے میں بھی شبہ نہیں۔ وہ کیوں ایسا پیرایۂ بیان اختیار نہیں کرتا جو عامی سے لے کر عالم تک اور مزدور سے لے کر بادشاہ تک اس کے کلام کو اپنا حرزِ جان بنالیں۔ کلام کی خوبی عام فہمی ہے، دشوار پسندی کوئی خوبی نہیں۔ یہ تو صرف اپنی علمیت و فلسفہ کا مظاہرہ ہے۔ غالب نے جو تغزل میں یہ رنگ اختیار کیا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی۔ کہ سلاست و روانی اور عام فہمی میں کوئی دل کشی باقی نہ رہی تھی۔ اس کے لئے ضرور تھا۔ کہ وہ اپنی شاہراہ دوسروں سے علیحدہ نکالے۔ ورنہ غالب کو آج کون غالب کہتا؟ علاوہ ازیں زبان میں وسعت پیدا کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ اور اس کو اقبال ہی خوب سمجھتا ہے۔ کہ اگر کل غالب نہ پیدا ہوتا۔ تو آج اقبال کے لئے میدانِ شاعری تنگ نظر آتا۔ نہ اس کی بانگِ درا کا پتہ ہوتا۔ نہ وہ بالِ جبریل کی مدد سے خیالی پرواز کر سکتا۔ اور نہ ضربِ کلیم اس پر کارگر ہوتی۔

یورپ کی سیر و سیاحت نے جہاں ایسے مقامات پر پہنچایا۔ جو کبھی اسلام کے حلقہ بگوش تھے اور جہاں اب کوئی اسلام کا نام لیوا نہیں۔ اور جہاں مسلمانوں کی یادگاریں شکستہ حالت میں نظر آتی ہیں۔ وہاں ایسے اشخاص سے بھی ملادیا۔

جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ اول الذکر کو دیکھ کر ایک شاعر جو کچھ بھی لکھ دے کم ہے۔ اور آخر الذکر سے مل کر جو کچھ بھی ایک فلسفی اخذ کر لے تھوڑا ہے۔ اقبال نے ان دونوں مواقع سے فائدہ اٹھایا۔ اور اپنی بیش بہا نظمیں تیار کیں۔

اگرچہ مشہور یہ ہے۔ کہ "جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ" لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے اپنی نظموں میں؛-

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

تا ممکن ہے کہ آدمی اُن کو پڑھے اور پڑھ کر متاثر نہ ہو۔

"بالِ جبریل" میں اقبال "بانگِ درا" سے زیادہ عمیق ہے۔ "بانگِ درا" اس کا ابتدائی کلام ہے اور "بالِ جبریل" سنِ رُشد کو پہنچ کر کہا گیا ہے۔ نہایت دلچسپ، بغایت شیریں اور بہت بامزہ ہے۔ بانگِ درا میں جو کھردرا پن اور سختی پائی جاتی ہے۔ وہ بالِ جبریل میں نزاکتِ خیال اور فصاحت و روانی سے بدل جاتی ہے۔ پختگی بھی بالِ جبریل کا جوہر ہے۔ اور دقائق و غوامض جو اُس میں بھرے ہوئے ہیں۔ بانگِ درا کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ مختصر یہ کہ بانگِ درا نقشِ اول ہے۔ اور بالِ جبریل نقشِ ثانی۔"

"ضربِ کلیم" کو بعض اصحاب ضربِ کاری نہیں سمجھتے۔ اور اُسے بالِ جبریل سے کم رتبہ خیال کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ خیالات میں عمق اور پختگی اس میں بھی ہویدا ہے۔ زبان میں سلاست اور روانی زیادہ ہے۔ بے شک کہیں کہیں زبان کی خامیاں موجود ہیں۔ لیکن بانگِ درا اور بالِ جبریل سے بہت کم ہیں۔ جن مضامین پر اقبال گوہر افشانی فرماتے ہیں۔ ناظرین کو کلامِ اقبال پڑھنے سے پہلے اُن سے پوری واقفیت ہونی چاہئے اُس وقت وہ شاعر کے لطیف اشارات کو سمجھ سکتے ہیں۔ ورنہ اُن کی شاعری ایک بے کیف اور بے معنی شاعری معلوم ہو گی۔

بعض ہندو اصحاب اقبال پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اس کا ابتدائی کلام وطن پرستی کے جذبہ سے لبریز ہے۔ لیکن اب وہ اسلامی روایات کا حامل بن گیا ہے۔ اور اُس میں تنگ نظری پیدا ہو گئی ہے اصل یہ ہے۔ کہ ہندو اصحاب اسلامی اخوت کے اُصول سے ناواقف ہیں۔ اور جو کچھ مستشرقین نے سمجھا دیا ہے۔ اُسی کو وہ صحیح سمجھتے ہیں۔ وہ پان اسلام ازم اور اخوت کو مرادف الفاظ جانتے ہیں حالانکہ یہ بات حقیقت سے کوسوں دُور ہے۔ ہمارا اصولِ اخوت، حُبِّ وطن کے ہرگز خلاف نہیں ہے۔ اُصولِ اخوت کوئی جارحانہ کارروائی نہیں ہے۔ بلکہ مرافعانہ یا مدافعانہ ہے۔ یعنی

اُن مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی لازم ہے جن پر دوسروں کے مظالم سے مصیبتیں نازل ہو رہی ہوں۔ یہ نہیں کہ کسی مسلمان ظالم کا ہم ساتھ دیں۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

یہ سچ ہے کہ اپنے وطن کی بہبودی کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں کو کوشش کرنی چاہئے۔ اگر ڈاکٹر اقبال اپنی پس ماندہ قوم کو اُبھارتا ہے۔ اور اُس کو ترقی کی راہیں دکھاتا ہے۔ تو یہ اصلاحی خدمت ہی نہیں ہے۔ بلکہ ملک کی بھی خدمت ہے۔ اگر ملک ہندو قوم سے ہی مراد ہے۔ تو یہ دوسری بات ہے، ورنہ کوئی وجہ نہیں۔ کہ ایک قوم میدانِ ترقی میں قدم مارتی چلی جائے۔ اور دوسری قوم کو نگاہِ غلط انداز سے بھی نہ دیکھا جائے۔ ہر محبِ وطن کا فرض ہے۔ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان دونوں قوموں کو مخاطب کرے۔ اور ان کی بھلائی میں کوشاں ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہندو اصحاب اپنے ہم مذہبوں پر فدا ہیں۔ اور اُن ہی کی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ تاہم وہ قابلِ الزام نہیں قرار پاتے۔ برخلاف اِس کے اگر کوئی مسلمان اپنے ہم مذہبوں کی برائیاں بیان کر کے اُن کو اصلاح کی طرف مائل کرتا ہے۔ تو ہندو اصحاب اُس پر فرقہ پرستی کا الزام عاید کرتے ہیں۔ کیا انصاف اور دانائی اِسی کا نام ہے؟

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

لہٰذا ہم ایسے معترضینِ اقبال سے ببانگِ دہل کہتے ہیں۔ کہ اُس کا مذہب فرقہ پرستی سے بہت ارفع ہے۔ وہ بنی نوعِ انسان کی خدمت کو اپنے اوپر لازم کئے ہوئے ہے۔ چونکہ حالات ناموافق ہیں۔ اِس لئے وہ صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کو ترقی کی شاہراہ پر چلنے کے لئے اُکسا رہا ہے۔ دوسری قومیں اُس کے ہم مذہبوں سے بہت آگے ہیں۔ اِسی لئے یہ اُس کی خدمت نہایت اہم ہے۔ اور ملک پر احسان ہے۔ کہ وہ مسلمانوں کو بھی آپ کے دوش بدوش چلنے کے لئے تیار کر رہا ہے۔ اگر آپ خود فرقہ پرست نہ ہوتے۔ تو اُس کے کام کی بیحد تعریف کرتے نہ یہ کہ اُس پر زبان طعن دراز کرتے۔ مزید برآں ایک مستشرق معترض کے جواب میں خود اقبال نے ایک جگہ لکھا تھا کہ میرے نزدیک اسلام ہی میرے فلسفۂ انسانیت کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ میں اسلام کو عرب حجاز یا عراق و عجم کا مذہب تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ وہ انسان کا "دین" ہے۔ اور جب میں اسلام سے خطاب کرتا ہوں۔ تو میرے ذہن میں مسلمان نہیں۔ بلکہ تمام دنیا کے انسان ہوتے ہیں۔"

آئیے اب کلامِ اقبال کا مطالعہ کیجئے۔ وہی اقبال جو اپنی سب سے پہلی نظم "ہمالہ" میں فیلِ بے زنجیر کی تشبیہ ذوق سے مستعار لیتا ہے۔ اپنی نظم "طلوعِ اسلام" میں کیا گیا نادر تشبیہات پیدا کرتا ہے۔

اقبال:-

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر　　فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

حالانکہ "فیلِ بے زنجیر" بغیر لفظ "مست" پورا مطلب ادا نہیں کرتا۔ کیونکہ بغیر مستی کے جھومنا ممکن نہیں۔

ذوق نے خوب کہا ہے:-

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ　　کہ جیسے جائے کوئی فیلِ مست بے زنجیر

ماہِ نو کا آخری شعر ہے:-

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں　　طفلکِ سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں

ایسا ہی رخصت اے بزمِ جہاں میں یہ شعر ہے:-

مدتوں بیٹھا ترے ہنگامۂ عشرت میں میں　　روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں میں

"میں میں" کی تکرار بری معلوم ہوتی ہے مثلاً ایک اور جگہ:-

ہے جنوں مجھکو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں　　ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں

پھر وہی "میں میں" کی تکرار ع

تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کر کے چھوڑوں گا

موجِ دریا میں ایک شعر ہے:-

آب میں مثلِ ہوا جاتا ہے، توسن میرا　　خارِ ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

"اٹکا" کی بجائے "الجھا" ہونا چاہیئے، "اٹکا" خلافِ محاورہ ہے۔

"یہاں" حشو ہے اور خلافِ فصاحت ع

الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا

اس شعر کی بنیاد حالی کے شعر پر ہے:-

اقبال:- نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں　　تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

حالی:- نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں　　یہ گلچینی ہے یا لٹس ہے گلچیں! یا ہے قزاقی

"رُلواتا ہے" کی بجائے "رُلاتا" ہونا چاہئے۔ ع:۔

جو تڑپاتا ہے پروانے کو، رُلواتا ہے شبنم کو

"تک، اور بھی" دونوں ساتھ ساتھ استعمال نہ ہونے چاہئیں۔ ان میں سے ایک کافی ہے ع

نہ اُٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگِ گل تک بھی

بالِ جبریل صفحہ ۲۲۰، "شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ"

دہاتی کی بجائے دیہاتی ہونا چاہئے۔ کیونکہ اردو میں اسی طرح مستعمل ہے۔

بانگِ درا صفحہ ۱۳۵:۔

سچ اگر پوچھے تو افلاسِ تخیل ہے وفا   دل میں ہر دم اک نیا محشر بپا رکھتا ہوں میں

سچ اگر پوچھے کی بجائے سچ اگر پوچھو ہونا چاہئے۔ کیونکہ سچ اگر پوچھے خلافِ روزمرہ ہے

صفحہ ۲۸۸ خضرِ راہ:۔   ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر

محوِ نظر کی بجائے محوِ نظارہ ہونا چاہئے۔

بانگِ درا صفحہ ۱۴۲:۔

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا   خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رُلواؤں گا

رُلواؤں گا کی بجائے رُلاؤں گا، ہونا چاہئے۔ رُلواؤں گا غیر فصیح ہے

بانگِ درا صفحہ ۱۴۹:۔ ع

پئے گا سارا جہاں میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہو گا

ہر کوئی خلافِ محاورہ ہے۔ ہر ایک، ہونا چاہئے۔

بانگِ درا صفحہ ۲۰۹ ع

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات   یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

"سکھلاتی ہے" غیر فصیح ہے۔ "سکھاتی ہے" ہونا چاہئے

صفحہ ۲۷۲ تاریخ دان بھی اُسے پہچانتا نہیں   تاریخ دان باعلانِ نون خلافِ روزمرہ ہے

اقبال کے کلام میں تذکیر و تانیث کی غلطیاں بھی اکثر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً

بانگِ درا صفحہ ۱۲۲:۔

رمزِ آغازِ محبت کی بتا دی کس نے

رمز مونث نہیں ہے، مذکر ہے۔ اس لئے۔

"آغازِ محبت کا رمز کس نے بتا دیا"

ہونا چاہئے

بالِ جبریل صفحہ ۲۵ :-

اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

توڑ دی پرہیز کی بجائے توڑ دیا پرہیز چاہئے۔ کیونکہ پرہیز مذکر ہے مونث نہیں ہے۔

بالِ جبریل صفحہ ۲۰۵ :-

بہشت راہ میں دیکھا تو ہو گیا بیتاب   عجب مقام ہے جی چاہتا ہے جاؤں برس

بہشت مونث ہے۔ "بہشت راہ میں دیکھی" ہونا چاہئے۔ ایک نظم کا عنوان ہے "ایک مکڑا اور مکھی" مکڑا ہماری زبان کا کوئی لفظ نہیں ہے "مکڑی" ہونا چاہئے۔ خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو۔

بانگِ درا صفحہ ۱۱۸ ع

ہوش کا دارو ہے گویا مستیٔ تسنیم عشق

کا کی بجائے کی ہونا چاہئے۔ کیونکہ دارو مؤنث ہے مذکر نہیں۔

اقبال کے کلام میں تعقید اکثر پائی جاتی ہے

بانگِ درا صفحہ ۶۴

"یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا"

یہ بھی تعقید واقع ہوئی ہے۔ یہ مصرع آسانی کے ساتھ اس طرح بدلا جا سکتا ہے۔

یہ سب کچھ ہے مگر قدرت کا مقصد میری ہستی ہے"

بانگِ درا صفحہ ۱۸۰

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی   ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی؟

مصرع آخر کی تعقید دونوں مصرعوں کو بے ربط کر دیتی ہے۔ حالانکہ باہم مربوط ہیں۔ سلاست کا تقاضا تھا۔ کہ مصرع میں "ترے محبوب کی امت" آتا

خدا کی شان میں گستاخیاں بھی اقبال سے سرزد ہو گئی ہیں۔ نہیں معلوم یہ حالتِ جذب کی کیفیت تھی یا دیدہ و دانستہ انہوں نے ایسا کہنا پسند کیا۔

شکوہ   پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں   ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

خدا کی شان میں یہ کہنا بے انتہا گستاخی ہے کہ " تو بھی تو دلدار نہیں"

رحمتیں ہیں تری اغیار کے شانوں پہ برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پہ
گویا اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) انصاف و رحم سے کام نہیں لیتا۔
"اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور"
یہ کہنا ضعفِ ایمان کی دلیل ہے اور دوسرے تعلیم یافتوں کو گمراہ کرتا ہے
اقبال نے جوابِ شکوہ بھی لکھا ہے۔ اور اس میں "تلافی مافات" کی کوشش کی ہے۔ اگر شکوہ اور جوابِ شکوہ ساتھ ساتھ لکھے جاتے تو "گستاخی" "گستاخی" نہ سمجھی جاتی بلکہ دوسرے لوگوں کا خیال سمجھا جاتا اور اقبال کو اُن کا ترجمان۔ لیکن اب تو یہ توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ جبکہ دونوں نظمیں مختلف اوقات میں لکھی گئیں اور بانگِ درا میں مختلف مقامات پر چھپیں۔ بایں ہمہ جوابِ شکوہ خوب ہے اور گریز خوب تر جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

ایک اور جگہ اقبال فرماتے ہیں :۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

خیر الرازقین کو بخیل کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟

یہ مشتِ خاک یہ صرصر یہ وسعتِ افلاک کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد

اب اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے۔ کہ خود اقبال نعرہ زن ہے ؎

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اقبال کے کلام میں بعض متروکات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ع
بامِ گردوں سے و یا صحنِ زمیں سے آئی
و یا کا استعمال اب اس طرح جائز نہیں۔
یا تلک اور لہو دونوں الفاظ متروک ہیں۔ لیکن اقبال کے یہاں تواتر کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔
بعض اصحاب اس قسم کے قوافی کو پسند نہیں کرتے۔ بلکہ غلط سمجھتے ہیں۔ مثلاً
آئے جو قراں میں دو ستارے کہنے لگا ایک دوسرے سے
تارے اور سے کا قافیہ ؎

ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا — آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا

جا رہا اور دیکھتا کا قافیہ۔

متذکرہ بالا نقائص معمولی ہیں۔ لیکن معمولی شاعر کیلئے۔ جو شاعر آجکل ہندوستان میں فرد ہو اس کے لئے اس قسم کے معمولی اسقام اس کی شہرت پہ نہایت بدنما داغ ہیں۔ اگر اقبال ضدی نہیں ہے تو اسے اپنے کلام کو ان نقائص سے بہت جلد پاک وصاف بنا دینا چاہئے۔ اور آیندہ احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ ورنہ اقبال کو "شاعرِ اعظم" تو ضرور کہا جائے گا۔ لیکن اس کے کلام کو وہ درجہ استناد بھی حاصل نہ ہوگا۔ جو دوسرے درجہ کے شعراء کو حاصل ہے۔ ناسخ کا کلام مستند ہے۔ لیکن اس میں شعریت نہیں ہے۔ کہا جائے گا کہ اقبال کا کلام سراپا شعریت ہے لیکن مستند نہیں ہے۔

بعض اصحاب لفظی غلطیوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اور ضرورتِ شعری کی بنا پہ ہر غلطی کو جائز تصور کرتے ہیں۔ ان کو شاید یہ معلوم نہیں۔ کہ ایسی خامیاں زیادہ تر شاعر کی سہولت پسندی اور عدم توجہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جو اس کی قادر الکلامی کو بٹہ لگاتی ہیں۔ جہاں ایسی غلطی ہو۔ کہ ہر ممکن کوشش کے بعد اس کی اصلاح نہ ہو سکے۔ ورنہ مضمونِ شعر سے ہاتھ دھونا پڑے۔ تو ضرورتِ شعری کا عذر جائز ہو سکتا ہے۔ برعکس اس کے کسی اور صورت میں یہ عذر، عذرِ لنگ ہے۔ اور اس کا جواب یہی ہے۔ کہ "شعر گفتن چہ ضرور" علاوہ ازیں ہر شخص زباندان نہیں ہو سکتا۔ اگر زبان کی خامیوں کی گرفت نہ کی جائے۔ اور ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تو پھر زبان کا تحفظ نہیں ہو سکتا۔ اور ہر شخص مختار ہوگا کہ جو چاہے کہے۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ کوئی زبان ہی نہ رہے گی۔ نہ اس کے قواعد ہوں گے اور نہ اس کے ضوابط۔ ہر زبان کے کچھ قواعد ہوتے ہیں۔ اور اہلِ زبان ان کا لحاظ رکھتے ہیں۔ تمام دنیا کی زبانوں کا یہی طریقہ ہے۔ اردو زبان کے لئے آپ کی یہ راہ روی کوئی استثنا قائم نہیں کر سکتی۔

اقبال کی تشبیہات بہت خوب ہوتی ہیں اور صرف تشبیہات ہی کا کام نہیں دیتیں بلکہ وضاحت کا مشکل کام سرانجام دیتی ہیں، ملاحظہ فرمائیے

کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت — جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی

اٹھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں — عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں — آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت — ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت

گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا   عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا
کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا   ہویدا تھی نگینے کی تمنّا چشمِ خاتم سے
بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی   رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ   کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا   قدرت ہے مراقبے میں گویا
جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری   گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامانِ آبرو کا!
آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے   کچھ مکدّر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے

ع   صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں سے ہم   آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار   صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار
میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے مجاز   پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
بجھائے خواب کے پانی نے اخگر اس کی آنکھوں کے   نظر شرما گئی ظالم کی درد انگیز منظر سے!
مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی   دیں زخمہ ہے جمعیتِ ملت ہے اگر ساز

اب فارسی تراکیب ملاحظہ ہوں:-

حیرتِ علم آفریدہ، نگہِ نارسیدہ، دیدۂ حکمت پسند، سیمِ سیّال، لغزشِ مستانۂ دل، شرمندۂ گوشِ سماعت، سکوت آمیز، میکدۂ بے خروش، فردوسِ نظر، نادش بیجا، اسیرِ امتیازِ رنگ و بو، طائرِ زیرِ دام، طرب اندوزِ حیات، آئینہ دارِ شبِ دیجور، تلوّن کیش، طفلکِ گفتار آزما، حسنِ منظرِ شام، بہشتِ دیدۂ بینا، جلوۂ یوسفِ گم گشتہ، عقلِ خجستہ پے، ذوقِ تکلم، کشمکشِ انتظار، ہم دوشِ ارم، آئینہ دارِ ہستی، نفسِ آتش سوار، خزاں نادیدہ، عقلِ زیاں اندیش، خوگرِ حمد، خوگرِ پیکرِ محسوس، فکرِ فلک رس، محرمِ عمل، سرگرمِ تقاضا، دشتِ جنوں پرور، جوئے سرود آفریں، بینِ شکوۂ ایام، آشنائے لطفِ بیخوابی، ظلمت ربا، جہانِ اضطراب وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے یہاں مقامی رنگ بھی بکثرت موجود ہے۔ مثلاً

نہ سیرِ گل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے   رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک

یا ہمالہ، مرزا غالب، سید کی لوحِ تربت، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا گیت، نیا شوالہ، داغ، کنارِ راوی، سوامی رام تیرتھ، عبدالقادر کے نام، گورستانِ شاہی، رام، غلام قادر رہیلہ

شبلی و حالی، والدۂ مرحومہ کی یاد میں، نانک، ہمایوں وغیرہ نظمیں جو صرف ہم لوگوں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن میں مقامی رنگ صاف نظر آتا ہے۔

اسلام کے احکام کی خوبی (محاصرۂ ادرنہ)

ذمی کا مال لشکرِ مسلم پہ ہے حرام
فتویٰ تمام شہر میں مشہور ہو گیا

چھوتی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج
مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا

بالِ جبریل میں پیر و مرشد اور جبریل و ابلیس کا مکالمۂ شعری دونوں بہت خوب ہیں۔ اول الذکر مکالمے میں اقبال نے بہت سے وہ نکتے پیر رومی کی زبان سے حل کر دئیے ہیں۔ جن کو حل کرنا بہت دشوار تھا۔ اور آخر الذکر مکالمے میں دنیا کی غایت ابلیس کی زبان سے خوب بیان کی ہے

ضربِ کلیم کی نظمیں بھی درسِ آموزِ عبرت ہیں اور جہادِ زندگی کے لئے آمادۂ پیکار کرتی ہیں۔ مثال کے طور پہ ایک چھوٹی سی نظم جو تین شعروں پر حاوی ہے۔ اور جس کا عنوان "امتحان" ہے۔ پڑھئے کس عمدگی کے ساتھ جہد و عمل کا سبق دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کہا پہاڑ کی ندی نے سنگ ریزے سے
فتادگی و سرافگندگی تری معراج

ترا یہ حال کہ پامال و دردمند ہے تو
مری یہ شان کہ دریا بھی ہے مرا محتاج!

جہاں میں تو کسی دیوار سے نہ ٹکرایا
کسے خبر کہ تو ہے سنگِ خارہ یا کہ زجاج!

جیسا کہ سرورق پہ تحریر ہے۔ واقعی یہ کتاب دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اس کے خیالات موجودہ زمانہ کے مسلمات کے خلاف ہیں۔ اور نہایت حقارت کے ساتھ ان کی بے مائگی اور دنائت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اقبال کے ہمنوا ہو کر ہم نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ عصرِ حاضر حب الوطنی کا زمانہ ہے۔ ہر شخص اپنے وطن کو بہتر سے بہتر دیکھنا چاہتا ہے اور اس کی ترقی کے لئے جھوٹ، فریب، دغا اور دنیا بھر کے عیوب کو جائز سمجھتا ہے لیکن اقبال زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اور بنی نوعِ انسان کی شاہ راہِ ترقی کا مشعل بردار ہے۔ وہ کسی خاص ملک یا مقام کا پابند نہیں۔ بلکہ اس کی آواز ایک صلائے عام ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ؎

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اگرچہ اقبال کا تمام کلام منتخب ہے لیکن نمونہ کے طور پہ حسب ذیل اشعار انتخاب کے بعد

درج کئے جاتے ہیں:-

اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق
سنگ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر
اے تہی ساغر ہماری آج ناداری بھی دیکھ

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

جہانبانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی!

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا!

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم "
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے!

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی! جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

نہیں اِس کھُلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے! نہ قفس نہ آشیانہ!

حدیثِ بے خبراں ہے، تو با زمانہ بساز،
زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز!

نگہ پیدا کر اے غافل تجلّی عینِ فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ!

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذر و دلقِ اویس و چادرِ زہرا؟

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

علاجِ آتشِ رومیؔ کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں!

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں!

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا!

کہاں سے تو نے اے اقبالؔ سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا!

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے!

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق!

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی!

خدا وندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دل آویزی

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ! وہ دل کہ ناصبور نہیں

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے!
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ!

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

حسرت

آپ کا نام فضل الحسن اور حسرت تخلص ہے۔ وطن قصبہ موہان ضلع اناؤ ہے ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔اے پاس کیا اور عربی فارسی کی تکمیل از خود کی۔ کالج کے طلباء نے غالباً لباس کی رنگینی اور کسی قدر شرم و حیا کی وجہ سے "خالہ جان" کا خطاب دے دیا تھا۔ راقم الحروف نے پرانے یونین میں خود مولانا کو ریشمی رنگین لباس اور لیس دار ٹوپی پہنے ۱۹۰۸ء میں دیکھا تھا۔ جب ۱۹۰۸ء میں آپ کے رسالہ اردوئے معلیٰ میں ایک مضمون "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" شائع ہوا۔ تو آپ پہ بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ حالانکہ کالج کے ایک طالب علم نے یہ مضمون لکھا تھا لیکن حسرت نے اُس کا نام ظاہر نہ کیا اور تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس وقت مسلمانان ہند وفاداری کی زنجیر مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے اور صرف مولانا ہندوستان کے تمام طول و عرض میں پہلے مسلمان تھے جنہوں نے استبداد کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ علی گڑھ کالج کے جاہ پسند اصحاب نے اپنے دل کا بخار نکالا اور مولانا کے خلاف خوب شہادت دی۔ حسرت کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ

حسرت کی بلند حوصلگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے۔ کہ جن لوگوں نے اُن کے خلاف شہادت دی تھی۔ ان کو ان لوگوں سے کبھی کسی قسم کی پرخاش نہیں ہوئی۔ برعکس اس کے نواب وقار الملک کے سوا اب تک علی گڑھ کے جاہ پسند اصحاب حسرت سے بلاوجہ بغض و عناد رکھتے تھے۔ اور عملاً مضرت رسانی کی فکر میں رہتے ہیں۔" کیا سوانح نگار حسرت کو علی گڑھ کے جاہ پسند اصحاب سے بہتر اخلاق کی توقع تھی؟ اگر ایسا تھا۔ تو ہمارے نزدیک وہ ارباب علی گڑھ کی افتاد مزاج سے قطعی ناآشنا ہے۔

حسرت کے مذاق ادبی نے ۱۹۰۳ء میں اردوئے معلیٰ علی گڑھ سے جاری کرایا۔ یہ رسالہ نہایت عمدہ کاغذ پر اعلیٰ لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ خاکسار کو حسرت کے فصیح و بلیغ کلام کی زیارت اُسی زمانہ میں ہوئی تھی۔ مگر دیانت زمانہ نے پھر فرصت نہ دی۔ کہ آپ کے کلام سے لطف اندوز

ہوتا لیکن حسرت کی عمدہ شاعری کا نمونہ دماغ میں موجود تھا۔ اور گاہ گاہ کاغذ پہ بھی زیارت ہو جاتی تھی۔ اس وقت آپ کے مکمل دیوان کو دیکھنا پڑا۔ نہ صرف اس نظر سے کہ اُس سے حظ حاصل کیا جائے۔ بلکہ اس نظر سے بھی کہ حسرت کا درجۂ شاعری متعین کیا جائے۔

حسرت کے ادبی شوق نے شعرائے اُردو کے منتخب کلام کو محفوظ کر دیا ہے۔ اور یہ اُن کا ایسا کارنامہ ہے۔ کہ جس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اِس کے علاوہ شرح دیوان غالب، نکاتِ سخن اور دیوان حسرت دس حصوں میں آپ کی دیگر تصنیفات سے ہیں۔

حسرت نے سیاسی کاموں میں ۱۹۰۵ء سے حصہ لیا اور سودیشی تحریک کے آپ ابتدا ہی سے حامی و مویّد رہے۔ ۱۹۰۸ء میں جب آپ کو دو سال کی سزا ہوئی اور جیل میں آپ پر ضرورت سے زیادہ سختی کو روا رکھا گیا۔ تو آپ نے قید سے چھوٹنے کے بعد تحریر فرمایا۔

"لوگوں کا عام طور پر خیال تھا کہ یہ مشقت (یعنی چکی کی مشقت) چند روزہ ثابت ہوگی۔ . . . . لیکن راقم کو اہلِ فرنگ کی شرافت اور عالی حوصلگی سے سابقہ پڑا اور تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا۔ حالانکہ عام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک یا دو ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی"

غرض اس ابتلا و آزمائش کے بعد مولانا حسرت کی پالیسی پختہ ہوگئی۔ اور وہ کانگریس کے مقتدر رہنماؤں میں سے ہو گئے۔ لیکن ۱۹۳۷ء کے بعد کانگریس کی مسلم آزار حکمت عملی سے تنگ آکر وہ مسلم لیگی ہو گئے۔ حسرت کا عزم و استقلال اور ایثار قابلِ تقلید ہے۔ مذہبی اعمال و عقائد میں کمال درجہ شغف و توغل رکھتے ہیں اور اپنے کلام میں ہر قسم کے معتقدات کو ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے متفرق طور پر بعض نظموں میں اپنے سیاسی عقائد کو بھی ظاہر کیا ہے۔ بے حد خلیق اور منکسر المزاج ہیں۔ جب مشاعرہ کی دعوت دی جاتی ہے۔ تو آپ بے تکلف اس میں شریک ہوتے ہیں لیکن افسوس ہے۔ کہ اکثر میر مشاعرہ جو اپنے آپ کو سخن فہم سمجھتے ہیں حسرت کی خاکساری سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر بعض شعرائے حال سے پہلے غزل خوانی کے لئے بلا لیتے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے۔ کہ حسرت عصرِ حاضر کا بہترین شاعر ہے۔ اور ایسے استاد باکمال کے بعد کسی اور شاعر کو پڑھنے کی اجازت نہ دینی چاہئے۔ اس سے حسرت کی شاعری پہ کچھ حرف نہیں آتا۔ بلکہ خود میر مشاعرہ کی سخن فہمی کا راز کھل جاتا ہے۔ حسرت تو اول پڑھیں یا بعد میں پڑھیں۔ ان کے حسبِ حال یہ مصرع ہے۔

صدرِ ہر جا کہ نشینی صدر است
خدائے بزرگ ایسے پاک نفس اور برگزیدہ شخص کو تا دیر قائم رکھے۔ ع
ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

کلام پر تبصرہ

ہم برابر دیکھتے آئے ہیں۔ کہ ہر دور کے ذہین وطباع اشخاص اپنے لئے علیحدہ رستہ نکال لیتے ہیں اور اپنی شاعری میں جدت طرازی سے جاذبیت پیدا کر لیتے ہیں۔ جس وقت حسرت نے شعر کہنا شروع کیا، فضائے شاعری داغ کے پرشور نالوں یا قہقہوں سے گونج رہی تھی۔ اور ان کے اکثر ہم عصر شعراء بھی وہی راگ الاپ رہے تھے۔ نوجوان طبیعتیں داغ کی پیروی کو فخر سمجھتی تھیں اور آنکھ بند کئے ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ زبان کی صفائی اور روزمرہ پہ اس شاعری کا دارومدار تھا۔ مضمون کچھ ہو یا نہ ہو۔ لیکن محاورات اور روزمرہ کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ حسرت کی ندرت آفریں طبیعت نے اس کو گوارا نہ کیا۔ اور نہ یہ رنگ اُن کو پسندِ خاطر ہوا۔ بجائے اس کے امیر مینائی یا داغ کی شاگردی اختیار کریں۔ آپ نے حضرت تسلیم کو اپنا رہنما بنایا۔ تاکہ اپنے اُستاد کے ذریعہ سے حضرت مومن کی بارگاہ میں شرفِ باریابی حاصل ہو جاتے۔"

وہ نکاتِ سخن جو حضرت تسلیم کی شاگردی سے آپ پر منکشف ہوئے اور وہ اندازِ بیان جو حضرت مومن کا خاص حصہ تھا، حسرت کے دل و دماغ پر اثر کئے بغیر نہ رہا۔ اور حسرت نے دل میں ٹھان لی۔ کہ اس کی شاعری کا سنگِ بنیاد اندازِ مومن ہوگا۔ اور فارسی تراکیب کی برجستگی اور خیالات کی عمدگی ایک پُر فضا اور دلکشا عمارت تیار کر دیگی۔ معاملہ بندی۔ بوالہوسی، عریانی، کنگھی، چوٹی، سُرمہ، کاجل سب خام خشت قرار دی گئیں اور رد کی گئیں۔ نیز زمانۂ حال کے مطابق معمولی اور سچی باتوں کو حُسنِ ادا کے سیمنٹ سے ایسا چسپاں کیا۔ کہ آپ کی شاعری کی عمارت پختہ اور استوار ہونے کے علاوہ دلفریب اور شاندار بھی بن گئی۔

جب آپ نے ۱۹۰۳ء میں اپنا رسالہ اردوئے معلی علی گڑھ سے جاری کیا۔ تو اس وقت داغ کے شاگردوں نے حقیقی شاعری کی وہ مٹی پلید کر دی تھی۔ کہ تُک بندی یا قافیہ پیمائی کے سوا اردو شاعری کا اور کوئی مصرف نظر نہ آتا تھا۔ غالب اور مومن نے یہ ہزار دقت و رسوائی

اپنا اپنا رنگِ تغزل خواص میں مقبول و دلپذیر بنایا تھا۔ اور اُن کے شاگردانِ رشید نے اِس رنگ کو حتی المقدور رونق بھی دی تھی۔ لیکن عوام نے ذوق کا ساتھ دیا۔ اور اُس کے شاگرد خاص نے ایسا نقارہ بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے۔ عوام نے واہ واہ کے وہ نعرے بلند کئے۔ کہ اُن کے شور کے سامنے عندلیبِ شاعری خود سر بگریباں ہو کر رہ گئی۔ اِس فضائے تیرہ و تار میں اردوئے معلّٰی کا ستارہ اُفقِ شاعری پر چمکا اور رفتہ رفتہ بلند ہوتا گیا۔ جس سے آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوا۔ اُدھر ۱۹۰۵ء میں حضرتِ داغ کا انتقال ہو گیا۔ اور اب بے سری فوج کیا لڑتی؟ شاگردانِ داغ اپنے اپنے مقام پر کچھ عرصہ تک اپنی شہنشاہیت کا اعلان اور جہاں اُستاد کی جانشینی کا ادعا کرتے رہے۔ اِس طوائف الملوکی نے اُس لوچ اور پادر ہوا تختِ شاعری کا ادھر بھی خاتمہ کر دیا۔ اور مدعیانِ شہنشاہیت کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی دے دیا۔ جب حسرت کی شاعری کا لشکرِ جرار اپنی نئی توپوں، بندوقوں، ہوائی جہازوں، اور گیسوں سے مسلح ہو کر میدانِ جنگ میں آترا تو داغ کے شاگردوں کی شاعری کی فوج اپنی پرانی تلوار اور ڈھال اور توڑے دار بندوق سے مقابلہ کے لئے آمادۂ پرخاش ہوئی۔ لیکن بہت جلد ایک ہی حملہ میں پسپا ہو گئی۔ اور اپنے لال قلعہ میں جا کر ایسی محصور ہوئی کہ دم توڑ کر ہی نکلی۔

حسرت مظفر و منصور ہو کر میدانِ شاعری پر قابض ہو گیا۔ اطراف و اکنافِ ہند سے ہدایا و تحائف پیش ہونے لگے۔ کلکتہ جیسی دور دراز جگہ سے بھی وحشت اپنی سوغات بھیجنے لگا۔ بہار، مشرقی اضلاع لکھنؤ، دلی اور دکن سب نے تہدیۂ تہنیت پیش کیا۔ شاگردانِ داغ نے بھی جو وقت شناس تھے آپ کے علمِ شاعری کے نیچے پناہ لی۔ فانی نے آپ کی شیوا بیانی اختیار کی۔ اور غالب کے بحرِ شاعری کی پہنائیوں میں جا کر گوہرِ بے بہا بن گئے۔ جگر مراد آبادی آپ کی اُستادی کے قائل ہو گئے۔ اصغر گونڈوی آپ کا عروج دیکھ کر دست بدنداں رہ گئے۔ اور چار و ناچار اسی روش پر چلنے لگے۔ یہاں تک کہ فلسفۂ شاعری میں گم ہو گئے۔

پنجاب کو اقبال تسخیر کر چکا تھا۔ اگرچہ اقبال اور حسرت کا رنگ بالکل جدا جدا ہے۔ لیکن لوگ شاید تغزل میں بھی اقبال کو حسرت پر ترجیح دیں۔ کیونکہ اُن کا تبحّر، وطنیت، انصاف اور سخن فہمی سے بالاتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال رنگِ تغزل سے قطعی نا آشنا ہے۔ اور اُس کا دل قوم کی تنزل پذیری سے متأثر ہے۔ اُس کی نظموں میں سوز و گداز ہے۔ ولولہ ہے جوش ہے لیکن اُس کے یہاں معشوقِ خیالی کے پیچھے سرگردانی کہاں ہے؟

"ناز والے نیاز کیا جانیں"

حسرت نے جب شعر کہنا شروع کیا۔ تو ابتدائی زمانہ کے لحاظ سے اُن کے اشعار کی کوئی قدر و قیمت نہ ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اُس وقت بھی آپ کی زبان سے قابلِ قدر اشعار نکلے۔ فرماتے ہیں:۔

بار بار آتا ہے یکس کا خیال — بیخودی بتلا مجھے کیا ہو گیا

نااُمیدی کا بُرا ہو آخر — اب نہیں دل میں تمنّا کوئی

چشمِ جاناں کے ہیں دُنیا سے نرالے انداز — جب نظر کرتی ہے اک لطف نیا ہوتا ہے

حسرت کی فطری صلاحیتِ شعری تو اِن ہی اشعار سے ہویدا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اُس نے قدیم رنگِ شاعری میں کیا جدت کی جس نے نہ صرف اس کی شاعری کو مقبول و دلنواز بنا دیا۔ بلکہ اُس وقت کے رنگِ شاعری کو جو بہت پھیکا پڑ گیا تھا۔ چمکا دیا۔

سب سے پہلے حسرت نے مومن سے اندازِ بیان مستعار لیا۔ اور اُس کے بعد فارسی تراکیب کی چاشنی سے دلآویزی پیدا کی۔ رفعتِ تخیّل ذاتی تھی۔ اِن تینوں باتوں نے مِل کر حسرت کے کلام کو بالکل اچھوتا اور نیا بنا دیا۔ اِس میں شک نہیں۔ کہ آپ کا رنگ قدیم شاعری سے ہرگز علیحدہ نہیں ہے۔ وہی ہجر و وصال کی باتیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میر کی شاعری اگر اٹھارھویں صدی کے خیالات کا پرتو ہے۔ تو حسرت کی شاعری بلاشبہ بیسویں صدی کے طرزِ بیان کا آئینہ ہے۔

جب حسرت نے یہ رنگِ تغزل اختیار کیا۔ تو اور لوگوں نے بھی مختلف طریقوں پر حسرت کی پیروی شروع کر دی۔ وہ لکھنؤ جہاں حضرتِ ناسخ کی صدائے بازگشت کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اپنے قدیم گنبدِ شاعری سے باہر نکلا اور حالی اور حسرت کے بتائے ہوئے رستہ پر گامزن ہوا۔ موجودہ شعرائے لکھنؤ یقیناً غالب اور مومن کے زمرۂ تلامذہ میں منسلک معلوم ہوتے ہیں۔ اور ناسخ و آتش سے دُور کا بھی رشتہ نہیں رکھتے۔

لیکن حسرت کی شاعری نے اگرچہ قدیم شاعری کے حق میں مسیحائی کا کام کیا۔ تاہم یہ رنگ بھی زیادہ دیرپا نہیں ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے، ضرورتیں بدل گئی ہیں۔ عشق و عاشقی کی گھاتیں کچھ سے کچھ ہو گئی ہیں۔ ستم روزگار معشوق کے جور و جفا سے [illegible] لے گیا ہے۔ اس وقت کا یہ تقاضا ہے۔ کہ عشقیہ شاعری کو خیرباد کہہ کر دیگر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی جائے۔

الغرض حسرت کے کلام میں جابجا مومن کا اندازِ بیان پایا جاتا ہے۔ مثلاً چند اشعار لکھے

جاتے ہیں۔

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی ‏ وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

اثر ایسا کہاں سے لائیں یا رب نالۂ دل میں ‏ جو اُس بے مہر کو بھی رازِ غم سے آشنا کر دے

اک شوخِ بے وفا پہ دل آیا حضور کا ‏ آخر پڑا نہ صبر دلِ ناصبور کا

نا تا کہ رسا ہیں تم سے نالے مگر اے دل ‏ اتنا بھی نہیں کرتے ہیں مجبور کسی کو

اس کی بات ادب ہے پاتیں جو ہم اس میں بھی مزا ‏ آپ نے تو نہ دیا کچھ بھی اذیت کے سوا

انھوں نے پھیر دیا خط یونہی سلام کے بعد ‏ بڑھا گئے میرا تخلص بھی میرے نام کے بعد

اس نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں ‏ نا تا کہ اُن کے رُخ سے نظر کامیاب ہے

شکوۂ جور، تقاضائے کرم، عرضِ وفا ‏ تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں

شوق جب حد سے گذر جاتے تو ہوتا ہے یہی ‏ ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں

کیسے کہہ دوں اُسے بیگانۂ الفت کہ وہ شوخ ‏ ظلم کرتا ہے مگر مائلِ فریاد بھی ہے

تراکیبِ فارسی کا استعمال جس قدر نفاست اور عمدگی کے ساتھ حسرت کے یہاں پایا جاتا ہے شعرائے حال کے یہاں کم ملے گا۔ حالانکہ تراکیبِ فارسی کو عمدہ طور پر برتنے کی خاص کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً شاہدِ قاتل

دے دے کے مفت جانِ شہیدانِ عشق نے ‏ اُس نازنیں کو شاہدِ قاتل بنا دیا

آشنائے نازِ بیجا۔

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرمِ نیاز ‏ تجھ کو آخر آشنائے نازِ بے جا کر دیا

نظرِ ہوش ربا

دیوانہ کیا ساقیِ محفل نے سبھی کو ‏ کوئی نہ بچا اس نظرِ ہوش ربا سے

عہدِ یک عمرِ فراغت۔

عہدِ یک عمرِ فراغت سے بھی خوشتر گذرا ‏ وہ جو اک لحظہ تری یاد میں ہم پر گذرا

کرمِ نوازش، منجملۂ اسبابِ نازش، بیگانۂ اُنس، تہیائے ترکِ تمنا، کارِ زبانِ بے زبانی، نا حقِ آگاہی، فکرِ نایابیِ شراب، دلدادۂ بیگانہ خوئی، کشمکشِ غم ہائے فرقت، نازبردارِ الم، محشرِ اضطرابِ خاموش، جفاہائے التواہی، خوکردۂ آزار، حشرِ آرزو، خلشِ ناتواں، خانہ بدوشِ آرزو، آوارۂ دشتِ جستجو، حسرتِ تبسم وغیرہ وغیرہ

رفعتِ تخیّل کی مثالیں درجِ ذیل ہیں :-

حضور مجھ پہ نہ ضائع کریں عطا اپنی کہ مستحق ہوں جفا ہائے التزامی کا

سبھی احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال اور ہی کچھ ہے تمنا ترے زندانی کی

سیہ کار تھے با صفا ہو گئے ہم ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

جب اُن سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم

رہ گئے ذاتِ حق میں ہو کے فنا اب نہ ہم ہیں نہ دل نہ سوز نہ ساز

داغؔ کا ایک شعر ہے :-

مرے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

حسرتؔ اسی مضمون کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں :-

شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کہ اور بھی تکلیفِ اضطراب کی شدت ہے آجکل

آتشؔ کا شعر مشہور ہے لیکن حسرتؔ بھی کیا خوب کہتے ہیں :-

ہر پھول چمن میں زر بکف ہے بانٹے ہیں بہار نے خزانے

قارون کی بجائے بہار کا خزانہ بانٹنا زیادہ اچھا ہے

حسرتؔ ردیف کو قافیہ سے خوب دست و گریباں کر دیتے ہیں۔ حالانکہ بعض نامور شعراء کے یہاں ردیف اور قافیہ اکثر اشعار میں باہم مربوط نہیں ہوتے۔ مثلاً

تھے بسکہ دلپذیر محبت کے واقعات کچھ کچھ وہ اب بھی یاد مجھے ہیں جو سب نہیں

سب کو نہیں کے ساتھ کیسا مربوط کیا ہے

آپ نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں مثلاً

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا

یا

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

یا

یاد ہیں سارے وہ عیشِ با فراغت کے مزے دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

وغیرہ وغیرہ۔ اگر حضرت حسرتؔ غزل خوانی کی بجائے نظمیں لکھنے لگیں۔ تو کیا ہی اچھا ہو۔ غزلیات کی تعداد کافی ہو چکی ہے۔ عمدہ نظموں کا سرمایہ بھی ہونا چاہئیے۔ آپ کے بعض اشعار جن کو تعلّی کہا جا سکتا

ہے۔ پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بیان واقعہ ہے۔ تعلّی نہیں ہے۔

تو نے حسرت یہ نکالا ہے عجب رنگ غزل — اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

طفیلِ عشق ہے حسرت یہ سب مرے نزدیک — ترے کمال کی شہرت جو دور دور ہوئی

اثر جو نغمۂ حسرت میں ہے وہ اور کہاں — کلام دیکھ لیا سن لیا ہزاروں کا

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں — مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود — تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

شعر ہیں تیرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد — تازہ حسرت اثر و حسنِ بیاں کی صورت

حسرت تری اس پختہ کلامی کی ہے کیا بات — پایا ہے کسی اور سخن ور نے یہ کیا رنگ

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گدازِ میر — حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

حسرت تری شگفتہ کلامی پہ آفریں — یاد آ گئیں نسیم کی رنگیں بیانیاں

قائم ہے تیرے دم سے طرزِ سخن قائم — پھر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگِ غزل خوانی

نسیمِ دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرت — جزاک اللہ تیری شاعری ہے یا فسوں کاری

مرحبا حسرت بنائی خوب تصویرِ سخن — رنگِ مومن خوشنما کیسی درجہ اس پیکر میں ہے

رعایتِ لفظی حسرت کے کلام میں بھی کہیں کہیں موجود ہے۔ جس کا افسوس ہے مثلاً

کرتی تھی لیلائے شب نورِ مہ کا مِل نثار — سو رہا تھا بام پہ وہ گیسوؤں والا پڑا

ایک ٹھوکر ہی سہی لے شوخ بے پروا خرام — رہ گزر میں ہے تری اک آرزو والا پڑا

متروک الفاظ آپ کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:۔ کاہے کو، بھلا، تلک، ہائے رہی

وغیرہ وغیرہ۔

ذیل میں حسرت کے منتخب اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

نہ ہو مجھ سا کوئی محوِ تمنا — ہوا کرتی ہیں باتیں دل سے کیا کیا

وہ شرمائے بیٹھے ہیں گردن جھکائے — غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا

مایۂ عشرتِ بیحد ہے غمِ قید وفا — ہیں شناسا بھی نہیں رنجِ گرفتاری کا

اب عشق کا وہ حال نہ ہے حسن کا وہ رنگ — باقی ہے فقط عہدِ تمنا کا فسانہ"

مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل — پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا

اہلِ نظر کو بھی نظر آیا نہ روئے یار
یاں تک حجابِ نور نے مستور کر دیا

سمجھے ہوئے تھے ہم تری بے اعتنائی کو
مگر جب غور سے دیکھا تو اِک لطفِ نہاں پایا

اللہ ری بہار کی رنگ آفرینیاں
صحنِ چمن کو تختۂ جنت بنا دیا

سادگی ہائے تمنا کے مزے جاتے رہے
ہو گئے مشتاق ہم اور وہ خود آرا ہو گیا

نہاں شانِ تغافل میں ہے رمزِ امتیاز اُس کا
یہ اندازِ جفا ہے التفاتِ دل نواز اُس کا

نگاہِ آرزو تابِ نگاہِ یار کیا لاتی
اگر حائل نہ ہو جاتا حجابِ کارساز اُس کا

شرحِ بے مہریٔ احباب کہوں کیا حسرت
رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا

گر جوشِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی "
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

چل بھی دیئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں
تیری محلسرا کا یہی راستا ہے کیا

ہم کیا کریں نہ تیری اگر آرزو کریں
دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا

اک برقِ تپاں ہے کہ تکلم ہے تمہارا
اک سحر ہے لرزاں کہ تبسم ہے تمہارا

اب نہ وہ تم رہے نہ ہم افسوس
کیا زمانہ کا انقلاب ہوا

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

محروم اک ہمیں ہیں اسے مقصدِ تمنا
دنیا میں ورنہ کس کا تجھ سے نہ کام نکلا

شوقِ وصالِ یار کے قابل بنا دیا
دل کیا تھا عاشقی نے اُسے دل بنا دیا

ہم نے غیرت کو بھی کرم سے ترے
بارہا نحوِ التجا دیکھا

عاشق ہوئے اور مر مٹے ہم
اپنی تو یہ مختصر ہے روداد

رعنائیٔ خیال کو ٹھہرا دیا گناہ
زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دور

میں بے خبرِ غم تھا مگر وہ دمِ رخصت
دیکھا کئے مڑ مڑ کے مجھے حدِ نظر تک

اللہ ری جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا
وہ سمجھے کہ اِس سے جدا ہو گئے ہم

ناکامیوں پہ اپنی ہنسی آگئی تھی آج
سو کتنے شرمسار ہوئے بیکسی سے ہم

ملتے ہیں اِس ادا سے کہ گویا خفا نہیں
کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں

پرسشِ حال پہ ہے خاطرِ جاناں مائل
جراَتِ کوششِ اظہار کہاں سے لاؤں

ہے وہاں شانِ تغافل کو جفا سے بھی گریز
التفاتِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں

حسرت جفائے یار تو اک عام تھی ادا
اظہارِ التفات مگر بے سبب نہیں

اے دل اُن کو وفا کی خُو ہی نہیں
درخورِ لطف یا کہ تو ہی نہیں

گرفتارِ محبت ہوں اسیرِ دامِ محنت ہوں
میں رسوائے جہاں آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں

کمالِ خاکساری پر یہ بے پروائیاں حسرت
میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں کیا قیامت ہوں

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ اُلفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

وصل کی بنتی ہیں اِن باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بیحد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کاہے کو آئینگی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں اِن خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خامکاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

خود ہے اقرار انہیں اپنی ستم گاری کا
پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں

نہ تھی واقف جو میرے اشتیاقِ بے نہایت سے
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں اُس نگاہِ بے محابا کو

وہ ظاہر میں عبث دلدادۂ بیگانہ خوئی ہیں
کہیں دل سے خیالِ اُلفتِ باہم نکلتا ہے

دلِ مضطر کی سادگی دیکھو
پھر انہیں سے سوال کرتا ہے

مجھ سا آوارہ نہ پایا میرے بعد
مدتوں روئی پریشانی مری

وہ جو بیچین ہوئے دیکھ کے حالت میری
ہو گئی اور پریشان طبیعت میری

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

آہ وہ یاد کہ جس یاد کو ہو کر مجبور
دلِ مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے

نہ ہو اُس کی خطا پوشی پہ کیوں نازِ گنہگاری
نشانِ شانِ رحمت بن گیا داغِ سیہ کاری

غضب رنگینیاں تھیں گریہ ہائے ابتدائی کی
ہوئی ہے جن سے دامانِ محبت پر یہ گلکاری

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اہلِ نظر کو بے خبرِ دو جہاں کیا
ایسی کچھ اک نگاہ وہ دزدیدہ کر چلے

روشِ حسن مراعات چلی جاتی ہے
ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے

ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن
حُسن سے اپنے وہ غافل تھا ہیں اپنے عشق سے

صفتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
پھر کہئے کیسی اُمید یہ ہم زندگی کریں

حالت قبولِ عذر سے برعکس ہو گئی
انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
اگر ہوا بھی تو الٹا اثر دعا میں ہوا

تاثیرِ برقِ حسن جو اُن کے سخن میں تھی
کہیں وہ آکے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
اک یہ بھی حقیقت میں ہے شانِ کرم اُن کی

مدت کے بعد پھر ہوئے وہ مائل کرم
مرا عشق بھی خود غرض ہو چلا ہے

اور بھی ہو گئے بیگانہ وہ غفلت کر کے
گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی

کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

جن میں اُٹھے بارہا اُن کی عیادت کے مزے
جب آپ التفات ذرا بھی نہ کیجئے

میں شوخ ہو گیا وہ پشیمان ہو گئے
ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی
سکون یاس بلا اضطراب کے بدلے

اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی
کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری

آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
ظاہر میں وہ بنتے ہیں جو ہر وقت خفا سے

یہ بھی تو اک طریقۂ احیائے عشق ہے
تیرے حسن کو بیوفا کہتے سمجھتے

آزمایا جو انہیں ضبطِ محبت کر کے
حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی

اصغر

۱ اصغر حسین نام اور اصغر تخلص ہے۔ اصلی وطن گورکھپور کے ضلع میں تھا لیکن ایک مدت سے مستقل طور پر گونڈہ میں رہتے تھے۔ یہاں آپ کے والد قانون گو کے عہدے پر مامور تھے۔ یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ کچھ دنوں انگریزی مدرسہ میں بھی تعلیم پائی۔ انٹرنس کے امتحان کی تیاری کی لیکن چند پریشانیوں کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے۔ تاہم فطری صلاحیت کی وجہ سے اتنی استعداد بہم پہنچالی۔ کہ انگریزی کی ادبی کتابوں سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ باقاعدہ تعلیم عربی اور فارسی کی بھی نہیں ہوئی تھی صرف ذاتی مطالعۂ کتب اور غور و فکر کی بدولت اس درجہ پر پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ سرودِ زندگی میں جو آپ کا دوسرا دیوان ہے۔ چار پانچ غزلیں فارسی کی بھی شامل ہیں۔

ابتدا میں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی کو اپنا کلام دکھاتے رہے، آخر میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دکھلائیں۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا کسی فطری شاعر کے لئے پیری مریدی شاگردی ضروری نہیں ہے۔ طبیعت خود ہادی اور رہبر بن جاتی ہے۔ اپنا ذاتی مطالعہ اور غور و فکر بہت اچھا استاد ہے مگر یہ فرسودہ رسم بھی ایک لحاظ سے اچھی چیز ہے کہ ذہین اور طباع شاگرد بہت جلد زبان کے نکات اور شعر کی خوبیوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ استاد میں بھی اہلیت موجود ہو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک خرابی بھی ہے۔ کہ شاگرد کو ایک مدت تک خود اعتمادی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر یہ رسم ابتدائی منازل طے کرنے کے بعد ترک کر دی جایا کرے۔ تو شاگرد کو اپنی اصلاح خود کرنے کا اچھا موقع ملے گا۔ اور اسے اپنی ذات پر بھروسا کرنے کی عادت ہو جائیگی۔

آپ حضرت قاضی شاہ عبد الغنی منگلوری سے شرف بیعت رکھتے تھے چنانچہ کلام میں جو سوز و گداز ہے۔ وہ لذت شناسِ تصوف ہونے کی وجہ سے ہے۔ گونڈہ میں عینک فروشی کی ایک مستقل دوکان تھی۔ بعد ازاں انڈین پریس الہ آباد میں بھی کچھ درسی کتابیں تیار کیں۔ اس کے بعد ہندوستانی اکادمی میں رسالہ ہندوستانی کے اڈیٹر مقرر ہو گئے سنہ ۱۹۳۰ء سے اسی کام پہ مامور

تھے کہ ۱۹۳۴ء میں فالج گرا اور آخر کار آخر نومبر ۱۹۳۶ء کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے۔ راقم خاکسار کو ان کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ دو تین مرتبہ جامعہ ملیہ دہلی کے بزم مشاعرہ کے موقع پر کلام بھی سننے کا اتفاق ہوا۔ پڑھنے کا انداز اچھا نہیں تھا۔ اور یہ مصرع کو:-

"تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں"

آپ کے بارہ میں بالکل غلط ثابت ہوا۔ منکسر المزاج، خلیق اور متواضع تھے۔ باوجود زہد و تقویٰ کے مزاج میں رنگینی اور ظرافت کا عنصر بہت زیادہ تھا۔

کلام پر تبصرہ

غالباً ۱۹۲۸ء میں ہمارے ایک کرم فرمانے "نشاطِ روح" ہدیۃً عنایت کی تھی۔ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اصغر صاحب اگرچہ غالب کے خوشہ چینوں میں ہیں۔ تاہم کلام اچھا خاصا ہے اور اس زمانہ میں غنیمت ہے۔ مقدمہ نگار نے اصغر کی تعریف و توصیف ہی تک اپنی جنبشِ قلم کو محدود رکھا۔ لیکن تبصرہ نگار نے غالب اور مومن پر بھی دست درازی فرمائی۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:-

حقیقت یہ ہے کہ غالب و مومن نے اساتذۂ ایران کے تتبع اور اپنے زورِ طبیعت سے اردو شاعری میں جو دو نئے باب اضافہ کئے تھے۔ وہ محض نقشِ اول تھے۔ جناب اصغر حکیم مومن خاں کے سلسلۂ تلامذہ میں ہیں اور غالب کے شیدائیوں میں اور خوش قسمتی سے بادۂ عرفان کے ذوق شناس بھی ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں حکیم مومن خاں کی براعتِ اسلوب اور شگفتگیٔ ترکیب اور غالب کا زورِ بیان اور نکتہ آفرینی شیر و شکر ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ جنہیں میں تصوف و عرفان نے تاثیر کی روح پھونک دی ہے۔ ان کی شاعری چونکہ نقشِ ثانی ہے۔ اس لئے نقشِ اول کی خامیوں سے پاک ہے۔ اس حیثیت سے اگر ان کو ایک طرزِ خاص کا موجد کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہے"۔

عبارت متذکرہ بالا میں غالب و مومن کی شاعری کو نقشِ اول اور اصغر کی شاعری کو نقشِ ثانی قرار دیا گیا ہے۔ یہ طرزِ ادا اس مصرع سے مستعار لی گئی ہے:-

"نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول"

اور اس مصرع کی حقیقت طرازی سے کسی کو انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن تبصرہ نگار اصغر مرحوم

کی مذاحی میں نقاشِ نقشِ اول اور نقاشِ نقشِ ثانی سے دو شخصیت مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ اس شعر
میں نقاش سے مراد ایک ہی شخص ہے۔ جو نقشِ ثانی کو نقشِ اول سے بہتر بناتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ
اِن (اصغر) کی شاعری چونکہ نقشِ ثانی ہے اسلئے نقشِ اول کی خامیوں سے پاک ہے سراسر غلط ہے
اصغر کا شعر ہمیشہ نقشِ اول رہے گا تا وقتیکہ وہ خود ہی اس کی اصلاح نہ کر دیں۔ البتہ اصلاح
کے بعد وہ نقشِ ثانی ہو سکتا ہے

اب یہ سوال کہ اصغر نے غالب و مومن کی خامیوں کو کہاں تک ترک کر دیا اور ان کی خوبیوں
سے کس درجہ تک فائدہ حاصل کیا۔ اور خود اُن کے یہاں اپنی خامیاں ہیں یا نہیں۔ اس کے جواب
میں خود اصغر کا کلام موجود ہے۔ مومن کے یہاں نازک خیالی اور غالب کے یہاں دشوار پسندی
اور نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے۔ اگر غالب اور مومن کی یہ چیزیں خامیوں میں شمار ہیں کیونکہ لوگ مشکل
تمام اُن کے اشعار کا مطلب سمجھتے ہیں۔ تو اصغر کا کلام بھی سیدھا سادہ اور عام فہم نہیں ہے اور
اس میں بھی یہ خامی موجود ہے۔ اور اگر نکتہ آفرینی فی نفسہٖ اچھی چیز ہے خواہ اس کا اظہار دقیق اشعار
میں کیا جائے یا سیدھے سادے اشعار میں۔ تو اصغر مرحوم مرزا غالب مرحوم کے تخیل تک ہرگز
نہیں پہنچ سکتے۔ اقبال نے ایک نظم میں مرزا غالب کو یوں مخاطب کیا ہے ؎

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

اس لئے اصغر کیا اور اقبال کیا ایک عالم مرزا غالب کے کلام کی ضو فشانی سے منور ہو رہا ہے۔ ان
شعرائے حال کے لئے اس کی تعریف یہی ہے کہ یہ لوگ مرزا غالب کے کلام کو ایک حد تک سمجھ لیتے
اور اس سے مستفید ہو کر ایک حد تک ان کی تقلید میں کچھ کہہ لیتے ہیں۔ نشاطِ روح کا مقدمہ نگار
ان الفاظ میں اصغر کے کلام کی نسبت خود اعتراف کرتا ہے کہ "میرا یہ دعویٰ نہیں کہ حضرت اصغر کا
کلام شعری کوتاہیوں سے بالکل منزہ ہے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی لطافت آفرینیوں
نے تغزل کے انداز قدیم میں رقص و سرود کا ایک نیا عالم پیدا کر دیا ہے۔ جو اب تک نگاہوں سے مخفی
تھا۔ حضرت اصغر کسی خاص صنعتِ سخن کے موجد ہیں۔ اور نہ وہ دنیا میں کوئی پیام لے کر آئے ہیں"
غالباً صنعتِ سخن سے اندازِ سخن یا اندازِ بیان مراد ہے کیونکہ اصنافِ سخن تو پہلے ہی سے چلے آتے
ہیں اور حضرت اصغر نے تغزل یا قطعہ کے سوا کچھ اور لکھا بھی نہیں۔ تعریف کی بات اندازِ بیان بھی ہو
سکتی ہے۔ یہ کوئی تعریف کی بات نہیں۔ کہ آدمی نظم غیر مقفیٰ اردو میں کہنے لگے اور دعویٰ کرے کہ
میں اس کا موجد ہوں۔ لیکن تبصرہ نگار "نشاطِ روح" کے انہیں صفحات میں اصغر کو طرزِ خاص کا موجد

سمجھتا ہے۔

بہر حال جب تک اصغر کا دوسرا دیوان "سرودِ زندگی" نہیں چھپا اور ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ ہم اصغر کو جگر اور فانی کے ہم پلہ سمجھتے تھے۔ اور دوسرے درجہ کے شعرا کے ساتھ ہم ان کو بزم سخن میں جگہ دیتے تھے۔ لیکن "سرودِ زندگی" نے زبانِ حال سے اپنے مصنف کو صفِ اوّل میں بٹھانے کے لئے سفارش کی اور ہم خوش ہیں۔ کہ ہمارے ذوقِ سخن نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ اگرچہ اصغر کے دونوں دیوان نہایت مختصر ہیں۔ لیکن اصغر کی تعریف بلحاظِ نوعیت ہے بلحاظِ جامعیت نہیں۔ انہوں نے غالب و مومن اور ان کے شاگردانِ رشید کے معیارِ تغزل کو برقرار رکھا۔ اور یہی ان کی تعریف ہے لیکن اصغر کے جہاں مضمون آفرینی اور اندازِ بیان میں ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہاں انہوں نے الفاظ کی سلاست اور روانی کی چنداں پروا نہیں کی۔ باوجود کاوش ایسے الفاظ بہم نہ پہنچا سکے کہ نکتہ چینوں کی گرفت کا موقع نہ ملتا اور مطلب سمجھنے میں دقّت نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان کے الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ بآسانی رکھے جا سکتے ہیں۔ جو سریع الفہم ہونے کے علاوہ نقائص بھی دور کر دیتے ہیں۔

"سرودِ زندگی" کے مقدمہ نگار[1] اپنی سخن فہمی کا ادّعا نہیں کرتے، البتہ اصغر کے کلام سے جو کیف اُن کو حاصل ہوا اُس کا اظہار دبی زبان سے کرتے ہیں اور حدود کے اندر رہ کر اصغر کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن تقریظ نگار اپنی شخصیت اور سخن فہمی کو بالائے سمجھ کر اصغر کے کلام کی عمدگی کی صرف شہادت دیتے ہیں۔

مقدمہ نگار تو شعرا کے حال سے اس قدر خائف ہیں۔ کہ اپنے ذوقِ سخن کے صحیح ہونے کا ثبوت مختلف یونیورسٹیوں میں اصغر کے کلام کی اشاعت اور درس و تدریس کو سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ فراموش کر گئے۔ کہ کسی شاعر نے انہیں یونیورسٹیوں کی نسبت غضبناک ہو کر کہا تھا:۔

"شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد؟"

مولانا حالی نے اپنے دیوان مطبوعہ ۱۸۹۳ء کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے "شعر جس کو مدرسہ میں لے جانے کی اجازت نہ تھی، اس کو روز بروز زیادہ تر مدرسہ ہی کے ساتھ پالا پڑتا جاتا ہے تعلیم اپنے عقل و دانش کے پتلے جوق جوق اور فوج فوج پیدا کر رہی ہے جو شعرا کے نزدیک ذوقِ معنی سے ایسے ہی بے بہرہ ہیں۔ جیسے شعراء ان کے نزدیک عقل و دانائی سے۔ ان پر شعر اتنا بھی اثر نہیں کرتا جتنا عرب کے اونٹ پر حُدی خواں کی آواز اثر کرتی ہے" لہٰذا ان کا یہ سہارا کم زور ہے۔ اگر ایک مجموعہ

[1] ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو؟ [illegible]

شاعر نے اصغر کے کلام کی تعریف کی ہے۔ تو یہ بھی کوئی دلیل اس امر کی نہیں کہ واقعی اصغر کا کلام اچھا ہے، کیونکہ سخن گوئی اور سخن فہمی علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، ممکن ہے کہ شاعر خود عمدہ شعر کہتا ہو۔ لیکن سخن فہم اُس درجہ کا نہ ہو۔ اسی طرح کوئی نثار لازم نہیں ہے کہ باوجود ادّعا، سخن فہم بھی ہو۔ اس لئے مقدمہ نگار اگر صرف اپنے تاثرات سے کام لیتے اور اپنے ذوقِ سخن کے صحیح ہونے کا ثبوت متذکرہ بالا صورت سے نہ پیش کرتے تو بہتر ہوتا۔ قارئین خود اندازہ کر لیتے۔ کہ آپ نے کہاں تک حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ اور آپ کا ذوقِ شعر کیسا ہے؟

اصل میں کسی مجموعۂ کلام کے ساتھ مقدمہ، تبصرہ، تقریظ، تعارف اور اسی قسم کے دیگر عنوانات کے ماتحت مضامین لکھنے کا رواج نہایت مضحکہ خیز ہے۔ اگر شاعر میں خود اپنے کلام کی خوبیاں بطرز احسن ظاہر کرنے کا مادّہ موجود نہیں ہے۔ تو اپنے احباب سے اپنی شاعری کی عمدگی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا بھی کوئی مستحسن فعل نہیں۔ اگر آپ کا کلام اچھا ہے تو پبلک ضرور آپ کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرے گی۔ اور اگر کلام معیارِ سخن سے گرا ہوا ہے تو مقدمہ، تبصرہ، تقریظ وغیرہ سب بیکار ہے ایسا کلام کبھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ اگر اپنے کلام کی توضیح و تشریح مقصود ہے تو آپ خود اس کام کو انجام دیجئے۔ پبلک نہایت خوشی سے پڑھے گی لیکن اس کو ہرگز دوسرے صاحبوں کا "دخل در معقولات" گوارا نہیں۔

ظاہر ہے کہ تغزّل میں اب جدت کی زیادہ گنجائش باقی نہیں رہی۔ خیالات تو کم و بیش سب آ گئے ہیں۔ اب انہی خیالات کو عمدگی کے ساتھ ادا کر دینا شاعری ہے۔ اصغر نے اس امر کا اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اُن کے یہاں خیالات تو وہی ہیں۔ لیکن اُن کو نیا لباس پہنا کر جلوہ گر کیا ہے۔ یا یوں کہئے کہ موجودہ زبان کی طرزِ ادا سے کام لے کر ایسے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ کہ اُن میں ندرت اور جدت پیدا ہو گئی ہے۔ ایک بات اصغر کے یہاں خاص ہے۔ اور وہ اُن کا رنگِ تصوّف ہے۔ جو تقریباً ہر شعر میں نمایاں ہے۔ یا تو خواجہ میر درد کے یہاں یہ رنگ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے یا اصغر کے یہاں۔ غالب کا تخیل بہت بلند ہے اور کہیں کہیں رنگِ تصوّف بھی ہے۔ اس لئے وہ ان دونوں صاحبوں سے اونچا ہی اُڑتا نظر آتا ہے۔ ہم ذیل میں اصغر کے ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جن کا مضمون دیگر شعراء سے ٹکراتا ہے لیکن چونکہ حُسنِ بیان موجود ہے۔ طبیعت کو ناگوار نہیں گزرتا۔

اصغر رسمِ فرسودہ نہیں شایانِ اربابِ نظر	غالب منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
اب کوئی منظر بلند از کفر و ایماں دیکھئے	عرش سے پرے ہوتا کاش کے مکاں اپنا

یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے ‏ ‏ ‏ ‏ وہ تجارت ہے دوستی ہی نہیں

مصرعہ، ہجوم کفر بھی جنبش ہے تیری زلفِ برہم کی ‏ ‏ ‏ ‏ اسی لیے بیر مٹھی زلف دیکھی اسکی جن قوموں نے وہ کافر بنیں

قضائے حسن ایمان اُلٹ گیا ہیں اٹھنے زیبا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ رخ نظر آیا جنہیں وہ سب مسلمان ہوگئیں

ذیل میں جناب سیماب اصغر کے ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو حسنِ بیان کی جان ہیں لیکن خیال بہت معمولی ہے:-

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی ‏ ‏ ‏ ‏ یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر ‏ ‏ ‏ ‏ تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں ‏ ‏ ‏ ‏ محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

اب نہ وہ یاں نہ وہ مکاں اب نہ زمیں نہ آسماں ‏ ‏ ‏ ‏ تم نے جہاں بدل دیا آکے مری نگاہ میں

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج و تلاطم میں ‏ ‏ ‏ ‏ وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں ‏ ‏ ‏ ‏ یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد جاتا ہے

صہبائے خوشگوار بھی یا رب کبھی کبھی ‏ ‏ ‏ ‏ اتنا تو ہو کہ تلخیٔ غم سے مزا نہ ہو

طوفِ حرم میں یا سرِ کوئے بتاں رہے ‏ ‏ ‏ ‏ اک برقِ اضطراب رہے ہم جہاں رہے

آپ کے یہاں ظرافت بھی موجود ہے۔ لیکن متانت کے ساتھ۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

محشر میں اہلِ حشر سے دیکھئے خوش ادائیاں ‏ ‏ ‏ ‏ فردِ عمل تو چاہئے دستِ کرشمہ ساز میں

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو ‏ ‏ ‏ ‏ مگر موجِ صبا کی پاکدامانی نہیں باقی

صنم کدے میں تجلی کی تاب مشکل ہے ‏ ‏ ‏ ‏ حرم میں شیخ کو محوِ نماز رہنے دو

آپ نے اکثر فارسی تراکیب مرزا غالب سے مستعار لی ہیں مثلاً تبسم ہائے پنہاں:- ع

ذرا رو کے ہوتے موجِ تبسم ہائے پنہاں کو

واماندگیٔ ذوقِ تماشا ع ‏ ‏ ‏ ‏ واماندگیٔ ذوقِ تماشا نہ چاہیے

موجِ برق ع ‏ ‏ ‏ ‏ موجِ برق اٹھتی ہے میرے آشیانے سے

تجدیدِ تمنا ع ‏ ‏ ‏ ‏ اک نئی جان ہے تجدیدِ تمنا ہونا

جراتِ رندانہ ع ‏ ‏ ‏ ‏ کہاں کھوئی ہوئی ہے جراتِ رندانہ برسوں سے

لیکن اپنی خود ساختہ یا فارسی کی مستعمل تراکیب بھی کچھ کم نہیں مثلاً کاوشِ بیجا، دلِ حیرت آشنا، طرزِ نظر، حقیقت آشنا، خلوت سرائے راز، خطِ ساغر، آتشِ سیال وغیرہ وغیرہ۔

"نشاطِ روح" کے تبصرہ نگار نے نقشِ اول اور نقشِ ثانی کے معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے جس کا

ذکر پہلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ہم یہاں ایک غزل جو "نشاطِ روح" میں درج ہے اور جنابِ اصغر نے "سرودِ زندگی" میں بھی اُس پر مکرر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ نقل کرتے ہیں تاکہ نقشِ اوّل اور نقشِ ثانی سے جو مراد ہے صاف طور پر ظاہر ہو جائے۔ بلکہ ہم اگر یہ کہیں کہ "نشاطِ روح" نقشِ اول ہے۔ اور "سرودِ زندگی" نقشِ ثانی" تو یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ لہٰذا چند ہم قافیہ اشعار لکھے جاتے ہیں:۔

"نشاطِ روح" یا نقشِ اول

ہوش کسی کا بھی نہ رکھ جلوہ گہِ ناز میں
بلکہ خدا کو بھول جا سجدۂ بے نیاز میں

آتشِ گل سے ہر طرف دشت و چمن دہک اٹھا
ایک شرارِ طور ہے خلوتیانِ راز میں

اے دلِ شوخ و حیلہ جو زیرکیِ رنگ و بو
طائرِ قدس کو بھی ہے دامگہِ مجاز میں

سب ہے ادائے بیخودی ورنہ ادائے حسن کیا
ہوش کا جب گزر نہیں اس کی حریمِ ناز میں

"سرودِ زندگی" یا نقشِ ثانی

کچھ تو کمالِ عشق نے حسن کا رنگ اڑا لیا
ایک ادائے ناز ہے بیخودیِ نیاز میں

اصغرِ خاکسار وہ ذرۂ خود شناس ہے
حشر سا کر دیا بپا جس نے جہانِ راز میں

گم ہے حقیقت آشنا، بندۂ دہر ہے نخبر
ہوش کسی کو بھی نہیں میکدۂ مجاز میں

یا تو خرد کو ہوش کو مستی دے بے خودی سکھا
یا نہ کسی کو ساتھ لے اس کے حریمِ ناز میں

قارئینِ کرام پر منکشف ہو گیا ہوگا کہ جو سلاست و روانی نقشِ ثانی میں ہے، نقشِ اول میں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ خیالات کا اظہار جس عمدگی سے نقشِ ثانی میں ہوا ہے، نقشِ اول میں اُس کا پتہ نہیں۔ علاوہ ازیں بعض صورتوں میں وہی خیال نقشِ ثانی میں حسنِ بیان سے متشکل معلوم ہوتا ہے جو نقشِ اول میں صرف ہیولیٰ تھا۔

یہ دیکھ کر کہ حسرت موہانی نے داغ کے رنگِ تغزل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اپنے علمِ بغاوت کے نیچے بہت سے نئے رضاکاروں کو بھرتی کر لیا۔ جن میں سے بہت سے بہت جلد سپہ سالاری کے عہدہ پر فائز المرام ہو گئے۔ نہایت مسرت ہوتی ہے۔ اگرچہ ہمیں اس کا صحیح علم نہیں ہے لیکن ہم اپنے قیاس سے کہہ سکتے ہیں کہ اصغر کی مشقِ سخن تیس سال سے زائد کی نہیں ہے اور حضرتِ اصغر بھی اس بارہ میں حسرت موہانی کے دوش بدوش سینہ سپر ہو کر لڑے ہیں اور فضائے شاعری میں ایک انقلاب بپا کر دیا ہے۔ وہ عشقِ مجازی کی بھیانک تصویریں اور کھلے ڈھلے الفاظ ہیں، جو ہمارے شعراء کا عام وتیرہ تھا۔ کم از کم جنگِ عظیم کے بعد سے بالکل بند ہو گئی ہیں، اگر کہیں کہیں داغ کے شاگردانِ رشید اب بھی اس روش کو نباہ رہے ہیں۔

تو وہ عادتِ دیرینہ کی بنا پر قابلِ معافی ہیں۔ لیکن زمانہ نے اب اُن کا ساتھ دینا چھوڑ دیا ہے۔ اور ہر بلندیِ فن، غالبؔ و مومنؔ کی تقلید کو فخر سمجھتا ہے۔ اصغرؔ نے پندرہ بیس سال کے عرصہ میں شہرت حاصل کی اور حق یہ ہے کہ "نشاطِ روح" کی اشاعت کے بعد ان کا ستارۂ شاعری چمکنے لگا۔ لیکن "سرودِ زندگی" کی اشاعت کے بعد تو وہ آفتاب ہو گیا۔ افسوس! یہ کسے معلوم تھا۔ کہ یہ آفتاب لبِ بام ہے اور جناب اصغرؔ ہم سے بہت جلد جُدا ہو جائیں گے۔

اصغرؔ نے بادۂ عرفان کی سرمستی سے اپنے اشعار کے ذریعے ہم کو بھی متکیف کر دیا ہے لطافتِ خیال یا رفعتِ تخیل، حسنِ بیان کے ساتھ مِل کر قلب کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔ اور اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ سوز و گداز کے ساتھ یاس و حسرت نہیں۔ بلکہ دردِ عشق کی تڑپ محسوس ہوتی ہے۔ اگلے لوگ جو عشق کو ضروری اور اہم سمجھتے تھے۔ وہ اصغرؔ کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ اور ان کے اندازِ بیان سے عشق کی ضرورت اور اہمیت خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے۔ غزل گو شعراء کے یہاں کسی "پیام" کی تلاش بیکار ہے۔ لیکن اصغرؔ کے یہاں "پیامِ عشقِ حقیقی" پایا جاتا ہے۔ اگر یہ غزلیں خانقاہوں میں ترنم کے ساتھ قوال پڑھیں تو سرمستی و بیخودی طاری ہو جائیگی۔ اور وہاں کی فضا کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔

کسی شاعر کا کلام نقائص سے پاک نہیں ہوتا، اصغرؔ کے یہاں بھی اس قسم کی لغزشیں موجود ہیں۔ جو زیادہ تر لفظی ہیں معنوی کم ہیں ؎

شمیمِ گلشن، نسیمِ صحرا، شعاعِ خورشید، موجِ دریا ہر ایک گرمِ سفر ہے، اِن میں مرا کوئی ہم سفر نہیں ہے

دوسرے مصرع میں "ہر ایک گرمِ سفر ہے" کے بعد "لیکن" کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ورنہ موجودہ صورت میں یہ شبہ ہوتا ہے۔ کہ اور اشیاء تو گرمِ سفر ہیں۔ لیکن شاعر گرمِ سفر نہیں۔ حالانکہ "ہم سفر" کہہ کر اس نے ظاہر کر دیا ہے۔ کہ وہ بھی گرمِ رفتار ہے۔ لہٰذا "لیکن" کہہ کر اپنے سفر کو دوسروں کے سفر سے ممیز کرنا چاہئے تھا۔ اور یہ اضافہ آسانی کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ "اِن میں" جو زائد ہے اِس کو حذف کر دیا جائے اور "لیکن" بڑھا دیا جائے۔

نمایاں کر دیا اُس نے بہارِ شُستہ خنداں کو کہ دی نغمے کو مستی رنگ کچھ صبحِ گلستاں کو

دوسرے مصرع میں "نغمہ" بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ اگر کسی طرح "نغمے" کی بجائے "نے" آجاتا۔ تو تلازمہ قائم رہتا مثلاً اس طرح کہہ دیتے "کہ دی کچھ نے کو مستی، رنگ کچھ صبحِ گلستاں کو"

قفس ہو دام ہو کوئی چھُڑائے اب یہ ناممکن " ازل کے دن کلیجے میں بٹھایا تھا گلستاں کو

"کلیجے" کی بجائے "سینہ" ہونا چاہئے تھا۔ کلیجہ ثقیل لفظ ہے۔ اور شعر کی نزاکت پر بارِ گراں ہے۔ مثلاً

یوں ہو سکتا تھا۔

"ازل کے دن ہی سینے میں جگہ دی تھی گلستاں کو"

ہوئے جو ماجرے خلوت سرائے راز میں اُس سے — نہ کفر اب تک ہوا واقف، خبر اِس کی نہ ایماں کو

"ہوئے جو ماجرے"، معلوم نہیں کیا محاورہ ہے۔ یہ شاید اپنے دیس کی زبان ہوگی۔ کم از کم اردو زبان اس کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ "ماجرے" کی بجائے "گفتگو" ہونا چاہئے تھا۔ اردو میں کیا ماجرا ہوا "کیا حال ہوا" کے معنی میں آتا ہے۔ نیز "ماجرا" واحد ہے جس کی جمع "ماجرے" کبھی استعمال نہیں ہوتی۔

نہ میں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھ کو ذوقِ عریانی — کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

دوسرے مصرع میں "جیب و گریباں" دونوں ہم معنی لفظ ہیں اور اندازِ بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ اس لئے دوسرے مصرع کو اس طرح پڑھا جائے۔ تو کیا ہرج ہے؟

"کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود میرے گریباں کو"

تاکہ جیب و گریباں کا نقص بھی دُور ہو جائے۔

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں۔

"بکھرا دِئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں"

بکھرا دیئے ہیں کی بجائے بکھروا دِئے ہیں۔ ہونا چاہئے۔ کیونکہ بکھرنا سے مصدر متعدی بکھیرنا یا بکھروانا ہو سکتا ہے۔ بکھرانا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ بکھرے ہوئے ہیں" کہا جائے۔ نیز ہمیں یہ شعر مہمل معلوم ہوتا ہے۔ اگر اِس کا مفہوم یہی ہے کہ رات کو جو ہم روتے ہیں اور آہ کھینچتے ہیں تو اللہ تعالےٰ کے یہاں سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ بلکہ ماہ و انجم بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تو ہم حیران ہیں۔ کہ ماہ و انجم کے بکھرے ہوئے نظر آنے سے دونوں مصرعوں میں کیا ربط قائم ہوا۔ اور اس سے شاعر کا کیا مطلب ہے؟ اتنا لکھنے کے بعد اتفاق سے رسالہ الناظر میں یہ شعر نظر پڑا، جس پہ ایک صاحب نے دونوں مصرعوں کی بے ربطی کا اعتراض کیا تھا۔ اور مجیب نے یہ توجیہ کی تھی۔ کہ ندائے درد سے جلوہ دکھا کا اصرار مراد ہے اور جواب میں مہ و انجم بکھیر دینے سے یہ مراد ہے کہ اِن سے اس کا جلوہ نظر آتا ہے ممکن ہے۔ کہ جناب اصغرؔ کا یہی مطلب ہو لیکن الفاظ سے ظاہر نہیں ہوتا۔

ازل میں اک تجلّی سے ہوئی تھی بیخودی طاری — تمہیں کو میں نے دیکھا تھا کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

یہاں سیاقِ عبارت اس امر کا مقتضی ہے کہ "ایسا یاد ہوتا ہے" کی بجائے "ایسا یاد آتا ہے" ہونا چاہیئے

اور اس لحاظ سے اصغرؔ قافیہ اور ردیف کو باہم مربوط نہ کر سکے۔

موج نسیم صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے — اور بھی جان پڑ گئی کیفیتِ نماز میں

کیفیت کو کیفیّت یعنی یہ تشدید یائے لکھنا چاہیئے تھا۔

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوداؔ — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کائنات دہر کیا! روح الامیں بیہوش تھے — زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

کائنات دہر کی ترکیب قابلِ اعتراض ہے۔ خود کائنات کے معنی دنیا ہیں۔ اور اگر کائنات سے مراد حقیقت ہے یعنی "زمانہ کی کیا حقیقت" تو کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ یہ تلمیح ایسی ہے۔ جو سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ نقائص بہت معمولی ہیں۔ کلام ایسا اچھا ہے۔ کہ سب انتخاب ہے اور ہم خوش ہیں کہ حضرت اصغر نے اپنا منتخب کلام چھپوایا۔ فضول اور بیکار اشعار کو جگہ نہیں دی۔

ذیل میں سرودِ زندگی سے بہترین اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

آدمی نہیں سُنتا آدمی کی باتوں کو — پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں ہے تو — اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

تمام دفترِ حکمت اُلٹ گیا ہوں میں — مگر کھلا نہ ابھی تک کہاں ہوں کیا ہوں میں

کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا — خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

ترا جمال ہے، تیرا خیال ہے، تو ہے — مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

کہاں اے مسلمِ سرگشتہ تو محوِ تماشا ہے — جب اِس آئینۂ ہستی میں تیرا ہی سراپا ہے

تیری ہزار برتری، تیری ہزار مصلحت — میری ہر اک شکست میں ہے میری ہر اک قصور میں

بس اتنے پہ ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا — کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو

ہاں! سینہ گلوں کی طرح کر چاک — دے مر کے ثبوت زندگی کا

ذروں کا عشق مستیِ صہبائے عشق ہے — عالم رواں دواں پہ تقاضائے عشق ہے

ہیجان و اضطراب ہے اُمیدِ وصل سے — رازِ حیات شورشِ بیجائے عشق ہے

شکوہ نہ چاہیئے کہ تقاضا نہ چاہیئے — جب جان پہ بنی ہو تو کیا کیا نہ چاہیئے

خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے — اہلِ تپش کو آتشِ سینا نہ چاہیئے

کیوں شکوۂ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں — اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب — وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب کون تشنگانِ حقیقت سے یہ کہے
آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی
کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی
وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
اُس حسنِ کاروبار کو مستوں سے پوچھیے
اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو
ایک ایک تنکے پر شکستگی طاری
محو ہے ذوقِ دید بھی جلوۂ حسنِ یار میں
فتنۂ دہر بھی بجا فتنۂ حشر بھی درست
کچھ ملتے ہیں اب پختگیِ عشق کے آثار
خاموش یہ حیرت کدۂ دہر ہے اصغرؔ
یوں نہ اس دورِ خزاں کو بے حقیقت جانیے
چاہیئے داغِ معصیت اُس کے حریمِ ناز میں
شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی
نغمہ نہیں بیاں نہیں یہ کوئی داستاں نہیں
پردۂ فطرت میں میرے اک نوائے راز ہے
از ازل تا بہ ابد محوِ تماشا ہوتا
سارے عالم میں ہے بیتابی و شورش برپا
کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
کیا بہارِ نقشِ پا ہے اے نیازِ عاشقی
اشکِ پیہم کو سمجھ لیتے ہیں اربابِ نظر
خطِ ساغر میں رازِ حق و باطل دیکھنے والے
مرے آگئے ہیں عشوہ ہائے حسنِ رنگیں کے

اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں
ہے زندگی کا رازِ تلاشِ سراب میں
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا
جلووں کے اژدہام نے حیراں بنا دیا
جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا
جب مختصر کیا انہیں انساں بنا دیا
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا
خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے
برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے
ایک شعاعِ نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں
لذتِ غم کے واسطے جب کوئی فتنہ گر نہیں
نالوں میں رسائی ہے نہ آہوں میں اثر ہے
جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرزِ نظر ہے
پرورش پائی ہے اس نے زیرِ دامانِ بہار
پھول یہ ایک بھی نہیں دامنِ پاکباز میں
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں
شرحِ نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں
ذرّہ ذرّہ اس جہاں کا گوش برآواز ہے
میں وہ ہوں جس کو نہ مرنا ہے نہ پیدا ہونا
ہائے اُس شوخ کا ہمشکلِ تمنّا ہونا
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا
لطف سر رکھنے میں کیا سر رکھ کے مر جانے میں ہے
حسن تیرا میرے چہرے سے جھلکتا دیکھیں
ابھی کچھ لوگ ہیں ساقی کی محفل دیکھنے والے
تڑپتے ہیں ابھی تک رقصِ بسمل دیکھنے والے

جنونِ عشق میں ہستیٔ عالم پر نظر کیسی
رُخِ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

کبھی سنتے تھے ہم یہ زندگی ہے وہم بے معنیٰ
مگر اب موت کو بھی خطرۂ باطل سمجھتے ہیں

اُبھرنا ہو جہاں، جی چاہتا ہے ڈوب مرنے کو
جہاں اُٹھتی ہوں موجیں ہم وہاں ساحل سمجھتے ہیں

مگر اک مشتِ پر کی خاک سے کچھ ربط باقی ہے
ابھی تک شاخِ گل کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشمِ بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

وہی بیتابیاں جانے وہی یہ خستگی سمجھے
کہ جس نے آب و گل میں شورشیں بھر دیں محبت کی

دلِ حزیں میں شرارے دبے ہوئے ہیں ابھی
خدا کیواسطے اسے نے نواز رہنے دے

قفس کیا، حلقہ ہائے دام کیا، رنجِ اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح آزاد ہوتا ہے

یہ سب ناآشنائے لذتِ پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

نظر میں وہ گل سما گیا ہے تمام ہستی پہ چھا گیا ہے
چمن میں ہوں یا قفس میں ہوں مجھے اب اسکی خبر نہیں ہے

ہوا کو موجِ شراب کر دے فضا کو مستِ خراب کر دے
یہ زندگی کو شباب دے دے نظر تمہاری نظر نہیں ہے

ذرے ذرے میں کیا جوشِ ترنم پیدا
خود مگر کوئی نوا سازِ محبت میں نہیں

عشق کی فطرت ازل سے حسن کی منزل میں ہے
قیس بھی محمل میں ہے لیلیٰ اگر محمل میں ہے

اس جہانِ خیر میں آرام کیا راحت کہاں
لطف جب ہے اپنی دنیا آپ پیدا کیجئے

کوئی ایسا نہیں یارب کہ جو اس درد کو سمجھے
نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

نگہِ ناز کو یہ بھی تو گوارا نہ ہوا
اک ذرا درد میں ملتی تھی جو راحت مجھ کو

زمانہ آرہا ہے جب اسے سمجھیں گے سب اصغر
ابھی تو آپ خود کہتے ہیں خود تنہا سمجھتے ہیں

یہاں میں ہوں نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے
یہ میخانہ ہے اس میں معصیت ہے باخبر ہونا

دہر ہی نے مجھ پہ کھولی راہِ بے پایانِ عشق
راہبر کو اک فریبِ رہ گزر سمجھا تھا میں

وہ نغمۂ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

کچھ ایسا دیکھ کر چپ ہوں بہارِ عالمِ امکاں
کوئی اک جام پی کر جس طرح سرشار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

آشوبِ حسن کی بھی کوئی داستاں رہے
مٹنے کو یوں مٹیں کہ ابد تک نشاں رہے

خوشا حوادثِ پیہم خوشا یہ اشکِ رواں
جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے

کہاں زمان و مکاں پھر کہاں یہ ارض و سما
جہاں تم آئے یہ ساری بساط برہم ہے

اِک تبسّم، یا ترنّم، اک نظر یا نیشتر
کچھ نہ کچھ ہوگا بھڑکتی ہے رگِ جاں دیکھئے

ہمہ تن ہستیٔ خوابیدہ مری جاگ اُٹھی
ہر بُنِ مو سے مرے اُس نے پکارا مجھ کو

کون سی بزم سے آتے ہیں جوانانِ چمن
خاک میں لے کے چلا ذوقِ تماشا مجھ کو

دل پہ لیا ہے داغِ عشق کھو کے بہارِ زندگی
اِک گُلِ تر کے واسطے مَیں نے چمن لُٹا دیا

ہے خستگی کے دم سے رعنائیٔ تخیّل
میری بہارِ رنگیں پروردۂ خزاں ہے

طبقۂ دوم

صفی

علی نقی نام اور صفی تخلص ہے۔ سادات زیدی سے ہیں۔ ۱۲۷۸ھ ۱۸۶۲ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی سے بھی بہرہ وافی رکھتے ہیں۔ ۱۸۷۹ء میں لال اسکول اور برانچ اسکول متعلقہ کیننگ کالج میں انگریزی تعلیم دینے پر آپ کا تقرر ہوا۔ لیکن ۱۸۸۳ء سے ملازمت سرکاری میں داخل ہوگئے۔ اور محکمۂ دیوانی میں مختلف مقامات اور مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۳ء میں چالیس سال کام کرنے کے بعد پنشن پائی۔

فن شعر میں کسی کے شاگرد نہیں۔ خود اپنی طبیعت سے اس فن میں ترقی کی ہے۔ اور آج اس درجہ پر پہنچ گئے ہیں۔ کہ آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ انگریزی تعلیم اور زمانہ کے انقلاب نے آپ کو جادۂ راہِ مستقیم پر ڈال دیا ہے۔ غزلوں میں بھی لکھنؤ کے بجائے دہلی کا اتباع پایا جاتا ہے اور نظموں کا رنگ تو حالی کی تقلید کا آئینہ ہے۔ نکات عروض اور دقائق فن سے باخبر ہیں۔ اور تمام اصناف سخن پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ غزل، قصیدہ، قومی و تاریخی نظمیں، سلام و نوحہ و مراثی، تاریخیں، رباعیات، قطعات اور مثنوی سب کچھ لکھا ہے۔ جونپور، پٹنہ اور لکھنؤ وغیرہ میں شیعہ کانفرنس کے موقع پر طلائی تمغے اور قوم کی طرف سے لسان القوم کا خطاب عطا ہوا ہے۔

آپ کی ایک مثنوی تنظیم الحیات ہے۔ جس پر ہندوستانی اکادمی الہ آباد نے مبلغ پانسو روپیہ کا انعام دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب تک آپ بقید حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ابھی اور زندہ رکھے تاکہ آپ کے گلہائے معانی سے چمن ہند مشکبو ہوتا رہے۔ آپ خلیق، منکسر المزاج اور نیک کردار ہیں۔

کلام پر تبصرہ

لکھنؤ کی فضا پر نظر کرتے ہوئے حقیقتاً یہ امر تعجب خیز ہے۔ کہ اُس میں صفؔی، عزیزؔ، چکبستؔ
آرزوؔ اور ثاقبؔ پیدا ہوں۔ وہاں کی شاعری کا دارومدار رنگِ ناسخ پر تھا۔ وہی ایک صدی تک چلتا
رہا۔ اور غالباً اب تک چلتا رہتا۔ اگر یہ مبارک ہستیاں جن کا ذکر اوپر ہوا بروئے کار نہ آئیں۔ ان کی
طبیعتوں پر کیونکر انقلابِ زمانہ نے اثر کیا نہیں کہا جا سکتا۔ مقدمہ دیوانِ حالی اور آزادؔ و حالیؔ کی
نظمیں ضرور ایک عنصرِ غالب ہیں۔ کہ ان نوخیز شاعروں کی طبیعتوں میں امنگ اور ولولہ پیدا کر دیا۔
اور انہوں نے ٹھان لی۔ کہ غزل کی اصلاح کی جائے۔ اور جدید طریقہ پر شاعری کی بنیاد رکھی جائے۔
دہلی میں شاگردانِ داغؔ اپنے اُستاد کے رنگ پر جادۂ پیما رہے۔ اور سرِ مو تفاوت نہ کیا۔ چنانچہ وہ جہاں
تھے وہیں رہ گئے اور ترقیِ زمانہ کا ساتھ نہ دے سکے۔

ہم کہیں لکھ چکے ہیں کہ حسرتؔ موہانی نے قدیم رنگِ تغزل کو خیرباد کہہ کر چمنستانِ سخن میں نئی روشیں
نکالیں۔ ملبہ تو وہی پرانا تھا۔ مگر اُس سے نئی عمارت تیار کی۔ ورنہ تغزل کبھی کا دم توڑ چکا تھا۔ از سرِ نو
زندگی حسرتؔ، اصغرؔ، وحشتؔ، صفؔی، عزیزؔ وغیرہم نے عنایت کی رشک ہے۔ کہ ان لوگوں کے
یہاں وہ رکیک جذبات اور خیالات نہیں۔ جو مجازی عشق کے آئینہ دار ہیں۔ غزل کا درجہ بڑھ گیا
ہے اور ہر کس و ناکس کے لئے اب یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ وہ غزل گوئی میں جلد کوئی خاص شہرت حاصل
کر لے۔ عمر کا بہت بڑا حصہ صرف کرنے کے بعد اگر وہ جدت پسندی اور اختراع سے بھی کام لے
تو شاید کچھ نام حاصل کر سکے۔ یہ زمانہ درحقیقت نظم کا ہے بھی نہیں۔ آجکل شاعری سے بہتر نثر نگاری
ہے۔ ہمارے ملک میں انقلاب رونما ہے۔ اِس کو جلد صورت پذیر کرنے کے لئے نثر ہی سے
خوب کام لیا جا سکتا ہے۔ نظم لکھنا بیحد فرصت کا کام ہے۔ صرف ان لوگوں کو اس طرف توجہ کرنی
چاہئے۔ جو روزِ ازل سے شاعری کا مادہ اپنی طبیعت میں لائے اور طبیعت اُن کو نظم کہنے پر اُبھارتی ہے
یا شاعری کی طرف مائل کرتی ہے۔ دوسروں کو دیکھ کر خود شعر و شاعری اختیار کرنے سے گریز کرنا
چاہئے۔

صفؔی کی روح میں ضرور شاعری جلوہ گر تھی۔ ورنہ بغیر استاد اپنے ذاتی شوق سے شاعری کی طرف
متوجہ ہو کر صحیح رستے پر پڑ جانا اگر ناممکن نہیں تھا۔ تو دشوار ضرور تھا۔ عزیزؔ نے یقیناً اور ممکن ہے
دیگر شعرائے لکھنؤ نے بھی صفؔی کی روش کو پسند کر کے خود بھی وہی رستہ اختیار کیا۔ جس پر اُن کے

مُسن ہم سفر نے اُن سے پہلے بادیہ پیمائی شروع کر دی تھی۔

صفی کی غزلیں ضرور جدید طرز کی ہیں۔ لیکن صفی کو غزل گو شاعر کہنا نہ چاہئے۔ ان کی غزلوں میں آمد نہیں ہے۔ صرف آورد سے کام لے کر وہ کچھ کام کی باتیں ضرور کہہ جاتے ہیں۔ ان کی طبیعت کو نظموں سے زیادہ لگاؤ ہے۔ اور وہ نظم خوب کہتے ہیں۔ مولانا حالی کی تقلید کرتے ہیں۔ اور بیانیہ شاعری کی جھلک اُن کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ بندش کی صفائی، مضامین کی جدت و نزاکت اور بلند خیالی اُن میں موجود ہے۔ فارسی تراکیب اور حسنِ تخیل بھی قدم قدم پر پایا جاتا ہے کہیں کہیں عربی ضرب الامثال بھی باندھ جاتے ہیں۔ دل میں قومی درد رکھتے ہیں۔ اور زیادہ تر قومی نظمیں کہتے ہیں۔

اِس وقت تک آپ کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اِدھر اُدھر سے جو غزلیں دستیاب ہوئیں۔ اور جو چند نظمیں ہماری نظر سے گزریں۔ ان کی بنا پر ہم نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ بہر حال آپ کی کہنہ مشقی اور پختہ کاری ان سے بھی ظاہر ہے۔ اور یہ بات بھی عیاں ہے۔ کہ آپ کسی طرزِ خاص کے موجد نہیں ہیں۔ اور نہ آپ کو صاحبِ طرز کہا جا سکتا ہے۔

صفی کی غزلوں میں بعض شعر قدیم رنگ کے بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت کیسی ہی کیوں نہ بدل جائے۔ اُسے اپنے ماحول سے بالکل جُدا کرنا سخت مشکل ہے۔ فرماتے ہیں:۔

گھر میں بیٹھے ہوئے لکھ بھیجنے ہو اک نسخہ   خوب آتا ہے علاجِ تپِ ہجراں کرنا

اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ بعض الفاظ کی جمع بھی ہم استعمال کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ وہ مفرد ہی استعمال ہوں تو مزہ دیتے ہیں مثلاً

ہے ترقی کی ہواؤں سے زمانہ شاداب   ہم بھی سر سبز کبھی ہونگے الٰہی کہ نہیں

یہاں ترقی کی ہواؤں کے بجائے اگر صرف ترقی کی ہوا آتا تو بہتر ہوتا۔ اِسی طرح

اے راہ رَوو! مجھ کو نہ للّٰہ مٹاؤ
اک نقشِ کفِ پا ہوں کسی راہ گزر میں

یہاں اے راہ رَوو کو واحد استعمال کرنا زیادہ اچھا معلوم ہوتا۔

بعض فارسی تراکیب مثلاً وسیع النظر، غفلت کدۂ ہستی، دست بداماں، سر بگریباں، زود فراموش، تنگ نائے دہر وغیرہ خوب استعمال کی ہیں۔ جن سے کلام میں گرمی اور رونق آ جاتی ہے۔ جماہی، بھول بھلیاں وغیرہ ہندی الفاظ بھی کلام میں ایک خوبی پیدا کرتے ہیں اور آپ ان کے استعمال میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ مثلاً آپ کی نظم "بہار" کا آخری شعر ہے۔

اب کی بارش میں ذرا سیر کو ریتی پر جاؤ　　پہلے خشکی تھی جہاں اب وہاں چلتی ہے ناؤ
سینہ تانے ہوئے مستانہ وہ دریا کا چڑھاؤ　　دور تک پاٹ کا وہ پھیر وہ چکر وہ گھماؤ

لے گئی جب لبِ دریا شبِ مہتاب مجھے
دور سے آنکھیں دکھانے لگے گرداب مجھے

آپ کی مثنوی "تنظیم الحیات" جو اکانومی آف ہیومن لائف کا ترجمہ ہے۔ اور نظم میں ہے آپ جیسے پختہ کار شاعر کے لئے باعثِ فخر نہیں ہے۔ تعقید، ایطا، ضعفِ تالیف، استعمال متروکات یہ سب عیوب اس میں کثرت سے موجود ہیں لیکن چونکہ ترجمہ ہے۔ اور نظم کی دقتیں بھی ظاہر ہیں۔ اس لئے اس سے قطع نظر کی جاتی ہے۔

ذیل میں آپ کی غزلیات سے چند اشعار اور دو نظمیں درج کی جاتی ہیں

دیکھ لوں دور سے تصویرِ شبابِ رفتہ　　رخ ادھر بھی کبھی اے عمرِ گریزاں کرنا
دمِ تعمیر صد افسوس نہ سمجھے یہ صفی　　گھر کا آباد ہی کرنا تو ہے ویراں کرنا
غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا　　ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا
اے حسن، اے مجسمۂ رحمتِ خدا　　کافر ہے وہ جسے کہ ترا آسرا نہیں
ہے اختلافِ وحدت و کثرت نمائشی　　دریا سے موج، موج سے دریا جدا نہیں
جو دل کہ معتقد نہ ہوا اعجازِ حسن کا　　دنیا میں کوئی اس سے زیادہ برا نہیں
حسنِ مجاز، چشمِ حقیقت پسند میں　　خوش رنگ ہے ضرور مگر دیرپا نہیں
دنیا کا ورق بینشِ اربابِ نظر میں　　اک تاش کا پتہ ہے کفِ شعبدہ گر میں
کرتی ہے گریبانِ سحر کو شفق آلود　　ڈوبی ہوئی اک آہ رسا رنگِ اثر میں
پابند نہیں جلوۂ آزاد مکاں کا　　یکساں ہے صفی دیر و حرم اپنی نظر میں
بلبلیں شور مچائیں نہ چمن میں کہہ دو　　بسترِ گل پہ کوئی خوابِ گہ ناز میں ہے
کوئی آزاد ہے لذت کشِ گلگشتِ چمن　　کوئی محبوسِ قفس حسرتِ پرواز میں ہے
دیکھیو تھک کے نہ بیٹھ اے دلِ حسرت انجام　　قدمِ سعی ابھی سرحدِ آغاز میں ہے
کہئے یہ رمز و کنایات کوئی کیا سمجھے　　ان کی جو بات ہے وہ سلسلۂ راز میں ہے
دیں بھی جوابِ خط کہ نہ دیں کیا خبر مجھے　　کیوں اپنے ساتھ لے نہ گیا نامہ بر مجھے
سرمہ ہیں چشمِ دل کے لئے تلخ تجربے　　پیری نے کر دیا ہے وسیع النظر مجھے

دو دن کی زندگی میں قویٰ نے دیا جواب — افسوس کام کے نہ ملے ہم سفر مجھے
دل دے دیا صفیؔ مگر اس کی خبر نہ تھی — پینا پڑے گا ہجر میں خونِ جگر مجھے

دیکھئے کیوں! کوئی تربت ہو گی — دیکھ کر اور ندامت ہو گی
دل میں رہ رہ کے کھٹک ہوتی ہے — خلشِ دردِ محبت ہو گی
دل میں رکھیں تو کدورت کہلائے — منہ سے نکلے تو شکایت ہو گی
زہر ہے زہر صفیؔ آبِ حیات — زندگی بڑھ کے مصیبت ہو گی

کیا کروں اب جو عطا ساغرِ جم ہوتا ہے — وقت وہ ہے کہ مسرت سے بھی غم ہوتا ہے
دل کے اجزائے پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ — کہیں صدیوں میں یہ سرمایہ بہم ہوتا ہے

الٰہی! زندگی کیا، موت کیا بیمارِ ہجراں کی — پریشاں خواب وہ تعبیر یہ خوابِ پریشاں کی
وہ کیوں در پردہ میرے چاک پیراہن پہ ہنستے ہیں — ذرا آئینہ لانا دیکھ لوں صورت گریباں کی
صفیؔ حکمِ رہائی مل چکا پھر کیوں توقف ہے — نگہ درباں سے کنجی کھو گئی ہے قفلِ زنداں کی

دل جب نہ پریشاں ہو جمعیتِ ساماں ہے — ہر غنچۂ نورس کی مٹھی میں گلستاں ہے
آ کر جو نہیں جاتی وہ ہے شبِ تنہائی — جا کر جو نہیں آتی وہ عمرِ گریزاں ہے

کل ہم آئینے میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے — کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

نظم

(جو ویدک اور طبی کانفرنس میں پڑھی گئی)

ہم آج اس بزم میں اک آہِ پُر تاثیر کھینچیں گے — جو دل میں دیر سے پیوست ہے وہ تیر کھینچیں گے
نہ ٹوٹیں ارتباطِ باہمی کی خوشنما کڑیاں — سنا ہے قوم کے زور آزما زنجیر کھینچیں گے
دکھا دیتا ہے نقشہ قوم کی نا اتفاقی کا — ہم اس دل کی جو ٹکڑے ٹکڑے ہے اک تصویر کھینچیں گے
کریں گے سرکشانِ قوم کو اپنی طرف مائل — جہاں تک ہے کمانِ چارۂ تقدیر کھینچیں گے

کسی سے داد لینی ہے نہ پیدا نام کرنا ہے
ہمیں کچھ کام کرنا ہے ہمیں کچھ کام کرنا ہے

مگر کمزوریِ خلق و محبت بڑھتی جاتی ہے — کہ یارانِ طریقت میں عداوت بڑھتی جاتی ہے
ہماری قوم! تیرا بھی ستارہ کیا ستارہ ہے — سعادت گھٹتی جاتی ہے نحوست بڑھتی جاتی ہے
زمانہ چونکتا جاتا ہے قومیں جاگتی جاتی ہیں — قیامت ہے ہماری اور غفلت بڑھتی جاتی ہے

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

وہ یونانی شفا خانہ کا اک بیمار زندانی — جیسے گھیرے ہوئے ہیں آجکل امراضِ نفسانی
جو آگے دو قدم اپنی جگہ سے بڑھ نہیں سکتا — مریضِ ناتواں بدبخت فنِ طبِ یونانی
جسے آئے ہوئے ہندوستان میں مدتیں گزریں — جو ہے مانندِ ویدک چارہ سازِ نوعِ انسانی
وہی موضوع اہلِ طب[1] ہے جو موضوع ویدک ہے — جسے کچھ بھی سمجھ ہوگی سمجھ لے گا بآسانی
جدا گانہ روش ظاہر ہے باطن میں یکساں ہے — علاقہ اک طرح کا طب و ویدک میں ہے روحانی
سبب کیا ہے تمہیں کیوں آخر اس ویدک سے نفرت ہے — وہ دائل کا ذخیرہ جس میں ہے اس وقت لاثانی
خزانہ تجربوں کا مفت ملتا ہے نہیں لیتے — سمجھتے ہی نہیں کچھ نفع و نقصان ہائے نادانی

ملائی طب میں ویدک بھی تو آخر تم خفا کیوں ہو
خلافِ مشربِ ورع ماکدر خذ ما صفا کیوں ہو

خداوندا عطا کر ناتوانوں کو توانائی — ترقی طب کو دنیا چاہتے ہیں طب کے شیدائی
بدن میں روحِ تازہ پھونک دے اس قوم بے حس کے — کہ میدانِ ترقی میں کرے ہنگامہ آرائی
بزرگوں نے ہمارے کیا نمایاں کوششیں کی تھیں — کہ اب تک صفحۂ ہستی پہ ہیں آثارِ دانائی
ہمارے اوج علم الادویہ کو پا نہیں سکتے — وہ سیارے جنہیں اس دور میں ہے نازِ یکتائی
انہیں کی طرح اڑ لیں چاہیئے ہم کو بھی سرگرمی — ہماری بھی رگوں میں ہے وہی تو خونِ آبائی
یہی دھن ہے منازل طے کریں گے وادیِ طب کے — سمائی ہے سروں میں پھر ہوائے جادہ پیمائی
پھریں گے گلشنوں میں جنگلوں کی خاک چھانیں گے — چنیں گے جا کے اب گلہائے بستانی و صحرائی

یہی گلہائے تحقیقات لے جا کر چڑھائیں گے
مزارِ بوعلی سینا پہ اک چادر چڑھائیں گے

جون پور

جونپورا اے مولدِ سلطانِ عادل شیر شاہ — تیرے آثارِ قدیمہ تیری عظمت پر گواہ
کہہ رہا ہے قلعۂ شاہی یہ با حالِ تباہ — مدتوں تک ہند کی ہم بھی رہے ہیں تخت گاہ

---

[1] یہاں موضوعِ اہلِ طب کی بجائے موضوعِ طب ہونا چاہیئے تھا۔ تنہا

ایک غافل قوم کی کھوئی ہوئی عظمت ہیں ہم
ہم سے عبرت کا سبق لو منظرِ عبرت ہیں ہم

جون پور اے بابِ علم و فضل کا دار السرور — کہتے تھے شیرازِ ہند اکثر تجھے اہلِ شعور
تجھ میں تھے شاہانِ شرقی کے عمارات و قصور — خود تری تاریخِ آبادی ہے شہرِ جونپور [۷۷۲ھ]
اب کہاں وہ بام و در سب ہو گئے زیر و زبر
نام تک میں ہے ترے رنگِ تغیر کا اثر[۱]

اے محمد شاہ جوناں کی مکمل یادگار! — کیا ہوئے وہ پھول جن سے اس چمن کی تھی بہار
آہ وہ تیرے مشاہیر انتخابِ روزگار — تیری بستی آج تک ہے جن کے غم میں سوگوار
چل بسے یوں مدفنوں کا بھی نشاں ملتا نہیں
یوسف اک کیا کارواں کا کارواں ملتا نہیں

وہ شمالی حصہ میں اک پُر فضا بارہ دری — خوشنما فیروز شہ کے وقت کی صنعت گری
دیتی ہے روکار سے یوں دادِ صنعت گستری — میں نے دیکھے ہیں بہت سے دورِ چرخِ چنبری
ٹھیس لگتا ہے کہ چوٹوں سے بدن سب چور ہے
قلعہ کہتا ہے کنواں دل کا مرے ناسور ہے

جونپور اے شاہدِ پہلو نشینِ گومتی — خوب ہی تو نے چنی ہے آستینِ گومتی
لکھنؤ کے بعد نقشِ نگینِ گومتی — پڑتی ہے تجھ پہ نگاہِ دور بینِ گومتی
کیوں محبت کو تری سمجھیں نہ فرضِ منصبی
ہم کو تیرے ساتھ ہے ایک دعویٰ ہم مشربی

منتخب وہ سبزہ زاروں میں رواں اک آبِ جو — بادہ کش دو ایک کاسے میں زلالِ آرزو
ایک شفاف آئینہ دو مہوشوں کے روبرو — دیکھئے نقشہ جونپور اور شہرِ لکھنؤ
ایک دریا پر بسے ہیں شانِ ساحل ایک ہے
دل بظاہر ہیں جدا لیکن رگِ دل ایک ہے

---

[۱] :- "نام تک میں ہے ترے رنگِ تغیر کا اثر"
دوسرے بند کی ٹیپ کا آخری مصرع ہے۔ اس مصرع میں اس کی تشریح ہے۔ یعنی اصل نام جَون پور واؤ کے جزم سے تھا اب اس کو بعض لوگ جَوِن پور واؤ کے زیر سے بولتے ہیں۔

فانی

شوکت علی خاں نام فانی تخلص بدایون کے رہنے والے ہیں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ تیرہ سال کی عمر تک عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں انگریزی پڑھنی شروع کی اور ۱۹۰۱ء میں بریلی کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۹۰۸ء میں ایل، ایل بی کی ڈگری علی گڑھ کالج میں قانون کی تعلیم پاکر حاصل کی۔ کچھ دنوں لکھنؤ میں اور اس کے بعد آگرہ اور اٹاوہ میں وکالت کرتے رہے۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن چلے گئے اور آخر عمر تک وہیں رہے۔

آپ کو گیارہ بارہ سال کی عمر ہی سے شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور بیس سال کی عمر میں آپ کا ایک دیوان بھی تیار ہو گیا تھا۔ لیکن یہ دیوان چھپنے سے پہلے تلف ہو گیا۔

فانی نے غزل گوئی کے علاوہ چند انگریزی ڈراموں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے ۱۹۰۶ء میں ایک اور دیوان بھی مرتب کیا تھا لیکن وہ بھی ضائع ہو گیا تھا۔ ۱۹۰۶ء کے بعد سے تقریباً گیارہ سال تک اپنی اگلی علمی کوششوں کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے آپ شعر و سخن کو بھی خیرباد کہہ چکے تھے۔ لیکن ۱۹۱۶ء سے دوبارہ شوق پیدا ہوا۔ اور رسالہ نقیب بدایوں کے اڈیٹر نے ایک مختصر مجموعۂ کلام شائع کیا۔ جو فانی کا پہلا دیوان سمجھنا چاہئے۔ دوسرا دیوان "باقیاتِ فانی" کے نام سے ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا ہے

افسوس کہ آخر ۱۹۴۲ء میں بمقام حیدرآباد دکن انتقال فرمایا۔ سنا گیا ہے۔ کہ بروقتِ وفات مرحوم ایسی کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ کہ دوا بھی میسر نہ آئی۔ آہ! یہ ہے حیدرآباد دکن کی اردو نوازی جس کا شہرہ چار دانگ ہند میں ہے۔ غالباً اسی بنا پر فانی نے یہ شعر کہا تھا۔

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

کلام پر تبصرہ

آجکل یہ وبا عام ہوتی جاتی ہے۔ کہ اپنے مختصر کلام پر کسی دوست یا مدّاح سے مقدمہ لکھوا کر

دیوان کا حجم بڑھا دیا جائے۔ تاکہ اُس ظریف کا شعر جو اُس نے مجموعۂ کلامِ غالب کے طبع ہونے پر کہا تھا ان حضرات پر صادق نہ ہونے پاتے۔

ڈیڑھ دو جزو پہ ہے مطلع و مقطع غائب　　غالب آسان نہیں صاحبِ دیوان ہونا

لیکن دیوان کے ساتھ کسی اور شخص سے مقدمہ لکھوا کر شائع کرنے کا مقصد صرف اسی قدر نہیں ہے کہ دیوان کی ضخامت میں اضافہ ہو جائے۔ بلکہ یہ راز بھی پنہاں ہے۔ کہ شاعر کے کلام کو کسی نہ کسی طرح مرزا غالب مرحوم کے کلام سے بہتر اور بافوق ثابت کیا جائے اور مقدمہ نگار کی حیثیت سخن فہمی کے لحاظ سے کچھ ہو یا نہ ہو کم از کم اُس کا سرٹیفکیٹ تو حاصل ہو جائے۔ یہی بات نشاطِ روح میں پائی گئی اور یہی بات باقیاتِ فانی میں موجود ہے۔

مقدمہ نگار حضرات اول اردو شعر و شاعری پر بحث کیا کرتے ہیں۔ اور بیسیوں صفحے اس مبحث کی نذر کر دیتے ہیں تاکہ ان کی سخن فہمی کے متعلق "ہر کہ شک آرد کافر گردد" والا فقرہ موزوں ہو جائے۔ مصوری، نقاشی، سنگتراشی، معماری اور خدا جانے کس کس سے شاعری کا موازنہ کرتے ہیں اور آخر میں ایک لفظ آرٹ ضرور لاتے ہیں۔ اور جہاں کہیں وہ اپنے ممدوح کے شعر کو بہتر ثابت کرنے سے قاصر رہتے ہیں، اس لفظ کے پس پردہ پناہ گزیں ہو جاتے ہیں۔

فانی کا کلام اگر بجائے خود غور سے پڑھا جائے۔ تو ضرور اچھا ہے۔ لیکن موازنہ کے شاخسانے نے اس میں ترقی معکوس پیدا کر دی ہے۔ موازنہ بھی کسی اور کے کلام سے نہیں۔ بلکہ غالب کے کلام سے کیا گیا ہے۔ اور فانی کو فاضل اور غالب کو مفضول ٹھہرایا ہے۔

اگرچہ ہمارے نزدیک غالب کا کوئی مشکل شعر نہ سمجھنا نادانی کی دلیل نہیں ہے۔ لیکن اُس کے رتبہ کو نہ پہچاننا حقیقتاً بے بصری ہے۔ غالب اردو شاعری کا آفتاب ہے۔ اور اس نے اپنا وہ نظامِ سخن قائم کیا ہے کہ تمام شعرا سیاروں کی طرح اُس کے گرد گھومتے ہیں۔ اور اُس سے اکتسابِ نور کرتے ہیں۔ زہرہ، مشتری، قمر، عطارد سب اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ غریب زمین کا کیا ذکر! خود فرماتے ہیں:۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی　　روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

کیا کوئی شخص انکار کر سکتا ہے۔ کہ ہمارے علمِ ادب میں خواہ نثر ہو یا نظم غالب کی ندرت آفریں ترکیبیں بار بار استعمال نہیں کی جاتیں۔ اور اُس کے خیالات کا چربہ کبھی نہ کبھی طرح نہیں اتارا جاتا۔ کیا ہمارے تغزل نے مرزا غالب کے کلام بلاغت نظام کی بدولت عمرِ جاوداں نہیں حاصل کر لی

ہے ؟ اقبال کیا، حسرت کیا، اصغر کیا، وحشت کیا، فانی کیا، جگر کیا، عزیز کیا، صفی کیا، وہ موجودہ دور کا کونسا شاعر ہے۔ جس نے کلام غالب کا مطالعہ نہیں کیا۔ اور اس کو منتہائے خیال سمجھ کر اپنی شاعری کی بنیاد نہیں ڈالی؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ بار بار کلام غالب پڑھ کر خود بخود طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک غزل گو شاعر آسانی سے غالب کے خیال کو کسی قدر تغیر و تبدل کے ساتھ دوسرے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ یہ تو بڑی ستم ظریفی ہے۔ کہ ایسے شعر کو غالب ہی کے شعر سے موازنہ کر کے برتر ثابت کیا جائے ؎

گر از بسیطِ زمین عقل منعدم گردد بخود گماں نبرد ہیچ کس کہ نادانم

غالب کا شعر ہے :۔

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز مَیں ہوں اپنی شکست کی آواز

مقدمہ نگارِ فانی اس کے جواب میں فانی کا یہ شعر پیش کرتے ہیں :۔

ہوں، مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم میری ہستی ہے غیب کی آواز

اپنی شکست کی آواز میں جو نزاکت اور ندرت ہے وہ غیب کی آواز میں کہاں ہے علم ادب کا ایک معمولی جملہ ہے کہاں ہے ؟ گلِ نغمہ بالکل اچھوتی ترکیب ہے۔ فانی کے مصرع اولیٰ میں "ہوں" کا لفظ اپنے بھونڈے پن کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو شان اور شکوہ غالب کے شعر سے ہویدا ہے، فانی کا شعر اس سے معرا ہے۔ شعر کی بندش جس قدر غالب کے یہاں چست ہے، فانی کے یہاں اُسی قدر سست ہے۔

غالب کے شعر کا مفہوم یہ ہے۔ کہ میری ہستی ایک ناکام اور بیکار ہستی ہے۔ نہ میں مخلوقات کا سرتاج ہوں اور نہ میں اس دنیا کی مشین کا کوئی کار آمد پرزہ ہوں۔ میں صرف اپنی شکست کی آواز ہوں یعنی۔

ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے

جس طرح قطرہ، دریا سے جدا ہو کر فنا ہو جاتا ہے یا شیشہ ٹوٹتے وقت صدا دیتا ہے، یہی حال ہے۔

غالب نے نہایت خوش اسلوبی سے اپنے عمدہ خیال کو ادا کیا ہے۔ برخلاف اس کے فانی کے شعر میں کوئی خوبی نہیں پائی جاتی۔ وہ صرف یہ کہتے ہیں۔ کہ اگرچہ مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا ہوں لیکن خود میری ہستی سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کوئی میرا پیدا کرنے والا ضرور ہے۔ وہ اپنی

۱؎ مولانا رشید احمد صدیقی ریڈر اردو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

ہستی سے وجود باری تعالیٰ پر دلیل لاتے ہیں۔ لیکن ان کو اپنی ذات کا کوئی علم نہیں۔ کہ وہ کیا ہیں، یہ وہ خیال ہے جو نہایت عام ہے۔ دنیا کی ہر شئے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس کا پیدا کرنے والا اور نظام عالم قائم رکھنے والا کوئی ہے ضرور۔ اب شارح کو اختیار ہے کہ اپنے ممدوح شاعر کی لاعلمی کو "حقیقت انسانی کے ما فوق الادراک ہونے کا فلسفہ" کہے یا جو چاہے کہے۔

غالب: نکوہش ہے سزا فریادیٔ بیدادِ دلبر کی　　　مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی

فانی نے اس شعر کو پڑھنے کے بعد اپنے دو شعروں میں صبح محشر کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

کیا جانئے کہ حشر ہو کیا صبح حشر کا　　　بیدار تیرے دیکھنے والے ہوئے تو ہیں

شاید کہ شام ہجر کے مارے بھی جی اُٹھے　　　صبح بہار حشر کا چہرہ اُتر گیا

غالب نے معشوق کے ستم کی فریاد کو عاشق کے لئے توہین تصور کیا ہے اور حقیقتاً وہ عاشق ہی کیا جو معشوق کے ظلم کی شکایت کرے۔ اور خواہاں انصاف ہو۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ ایسا خیال بھی نہ آنا چاہئے۔ ورنہ کیا عجب ہے۔ کہ صبح محشر اس حماقت پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ کیسا اچھا مضمون ہے اور عام شعراء کے خیالات سے کس قدر مختلف ہے۔ ہر غزل گو شاعر معشوق کے جور و جفا کا انصاف روز حشر پر اٹھا رکھتا ہے۔ غالب سب سے الگ ہو کر کہتا ہے۔ کہ جو شخص بیدادِ دلبر کا فریادی ہے، اس کی سزا یہی ہے۔ کہ وہ رسوا اور بدنام ہو۔ اور اس کا مضحکہ اڑایا جائے۔

فانی کہتے ہیں۔ کہ حشر ہیں کہیں اور حشر بپا نہ ہو جائے۔ کیونکہ تیرے ستم رسیدہ جاگ اٹھے ہیں۔ اور وہ اپنی فریاد و زاری سے میدانِ حشر کا خدا جانے کیا حال بنا دیں۔ یہ تو وہی عام شعراء کی طرح آسمان و زمین کے قلابے ملانا ہوا اور کچھ مطلب نہ نکلا۔ اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں یعنی دوسرے شعر میں دہرایا ہے۔ کہ شاید عشاقِ ستم رسیدہ زندہ ہو گئے۔ جو صبح بہارِ حشر پر اوس پڑ گئی۔ یعنی ان کی فریاد نے سب کو خاموش کر دیا۔ فانی نے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی۔ وہی عام خیال باندھ دیا ہے۔ لیکن مقدمہ نگار کی رائے ہے[1]۔ "الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی۔ خیالات کا اتار چڑھاؤ۔ اور ان سب کا مجموعہ بلند آہنگی اور بلند نظری نے فانی کے شعر کو بہت بلند کر دیا۔" افسوس ہے کہ مقدمہ نگار "شام ہجر کے مارے" اور "فریادیٔ بیدادِ دلبر" کو ایک طرف اور

[1] باقیات فانی حصہ نثر صفحہ ۴۳ از جناب رشید احمد صاحب صدیقی۔

دوسری جانب "چہرہ اُتر گیا" اور "خندۂ دنداں نما" میں جو فرق ہے اِس پر بھی غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں سمجھتے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اُن کا اِن الفاظ کی طرف توجہ دلانا بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ سو وہ دراصل غالب کے شعر کا مفہوم ہی نہیں سمجھے۔ ورنہ غالب کے الفاظ بزبانِ حال کہہ رہے ہیں۔ کہ ان الفاظ سے بہتر اور الفاظ اِس مطلب کو ادا ہی نہیں کر سکتے۔ فرماتے ہیں[1] "محبوب کے جور و ستم کے فریادی کا انجام رسوائی ہے۔ نام نہاد مظلومین کی یہ اُمید کہ روزِ حشر میں کچھ شنوائی ہو گی۔ کہیں یہ نہ ہو کہ صبحِ محشر بجائے خود "فریادیٔ بیدادِ دلبر" کے لئے صرف ایک خندۂ دنداں نما ثابت ہو اور فریادیٔ محبوب کو رسوائی بالائے رسوائی نصیب ہو۔ فانی نے اِسی خیالی اندیشہ بایقین کو زیادہ بلند و بلیغ طور پر ادا کیا ہے۔" قارئینِ کرام سمجھ گئے ہونگے۔ کہ حضرت نے بالکل اُلٹا مطلب سمجھا ہے غالب تو بیدادِ دلبر کے فریادی کو نہایت حقارت سے دیکھتا ہے۔ اور اُس سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اُس کو اِس بُرے نام سے مخاطب کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ خود فریادی ہے۔ اور داد رسی چاہتا ہے۔ اور اس کو اندیشہ ہے۔ کہ شاید محشر میں بھی داد نہ ملے۔ برعکس اس کے فانی کو ایسے لوگوں سے ہمدردی ہے۔ اور وہ اُن کو "ہجر کے مارے" کہہ کر اظہارِ ہمدردی کرتا ہے۔ غالب اُن کو تضحیک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لئے "خندۂ دنداں نما" کہتا ہے۔ فانی اُن کا ہمدرد ہے۔ اِس لئے "صبحِ حشر کا چہرہ اتر گیا" کہتا ہے

اب ذرا انصاف سے کہئے۔ کہ الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، بلند آہنگی۔ اور بلند نظری غالب کے یہاں ہے یا فانی کے یہاں جو عام شاہراہ پر آنکھیں بند کئے چلے جا رہے ہیں صائب نے شاید ایسے ہی موقع پر یہ شعر کہا تھا۔

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

الغرض فانی، غالب کے مدِ مقابل کسی حیثیت سے پیش نہیں کئے جا سکتے۔ البتہ اُن کی بعض فارسی تراکیب سے یہ پایا جاتا ہے کہ وہ غالب کے مقلد ہیں۔ کہیں کہیں اچھا مضمون باندھ گئے ہیں۔ اور کہیں کہیں صرف لفاظی ہی لفاظی ہے۔ چونکہ وہ نواب مرزا داغ کے شاگرد ہیں، اِس لئے اُن کے کلام میں اپنے استاد کا پرتو بھی بعض بعض جگہ پایا جاتا ہے مثلاً

نگاہِ شوق میرا مدعا تو اُن کو سمجھا دے
مرے منہ سے تو حرفِ آرزو مشکل سے نکلے گا

نہ آئیں گے وہ تب بھی دم نکل ہی جائیگا فانی
مگر مشکل سے نکلے گا بڑی مشکل سے نکلے گا

---

[1] - باقیاتِ فانی صفحہ ۲۴

ہر بے گنہ سے وعدۂ بخشش ہے روزِ حشر گویا گناہ کی بھی ضرورت نہیں رہی
الٰہی آگ لگ جائے زمانہ کی دورنگی کو جنہیں نازک بدن سمجھو وہی پتھر نکلتے ہیں
بتایا راستہ عشقِ مجازی نے حقیقی کا خدا کی شان رہزن بھی کبھی رہبر نکلتے ہیں
اپنی جنت مجھے دکھلا نہ سکا تو واعظ کوچۂ یار میں چل دیکھ لے جنت میری
شکوۂ ہجر پہ سر کاٹ کے فرماتے ہیں اب کرو گے کبھی اس منہ سے شکایت میری
تو مسیحا نے بھی اللہ نے بھی یاد کیا تیرے بیمار کو ہچکی بھی قضا بھی آئی

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کلامِ غالب بہت پسند ہے ، اس لئے اکثر غالب کا تتبع کرتے ہیں مثلاً

ٹوٹا طلسمِ ہستیِ فانی کے راز کا " احسان مند ہوں الم جاں گداز کا
میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا
بچ رہا تھا ایک آنسو دارو گیرِ ضبط سے جوششِ غم نے پھر اس قطرہ کو دریا کر دیا
مرا وجود ہے میری نگاہِ خود نشناس وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز واں ہوتا
ہر مژدۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب عالم دلیلِ گمرہیِ چشم و گوش تھا

لطف یہ ہے کہ فانی نے غالب کا اتباع یہاں تک کیا کہ بعض اشعار ہم بھی اُن کی زبان سے نکل گئے۔ مثلاً

فصلِ خبر بڑھا گئی عمر کے باب راز ہیں یادِ وصالِ مختصر ملے کے شب دراز ہیں
زہر ہے یاد وائے دل وہ ہیں کہ موت ہے قریب رعشہ مری نظر میں ہے یا کفِ چارہ ساز ہیں

مختصر یہ کہ فانی کے یہاں داغ کا بھی رنگ ہے اور غالب کا بھی۔ کلام میں سوز و گداز بھی ہے۔ اور یاس و حسرت بھی۔ چونکہ ان کی زندگی آلام و مصائب میں گزری ہے۔ اس لئے اُن کے یہاں میر جیسا درد بھی ہے۔ مثلاً

بہت سر پیٹتی ہیں آرزوئیں کوئی ناکام جاتا ہے جہاں سے
نازک ہے آج شاید حالت مریضِ غم کی کیا چارہ ساز سمجھا کیوں زار زار رویا
فانی کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رویا
شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا
وہ سخت جان ہیں ہم کہ شبِ غم بھی کاٹ دی فانی ہمیں تو موت نہ آئی تمام رات

فانی کے یہاں بعض فارسی تراکیب جو انہوں نے غالب کے اتباع میں اختیار کی ہیں۔ اکثر و بیشتر وہی ہیں جو غالب نے استعمال کی ہیں۔ مثلاً تمہیدِ صد ہزار قیامت، عنوانِ شوق، خاطرِ حسرت نواز، تہمتِ نظارۂ جمال، نگہِ امتیاز، روشناسِ خضر، دیباآشنا، منت کش، سادہ دلِ تکلف برطرف، لرزشِ پیہم، دل فریبیِ حسنِ عمل، فریبِ التفات، سامانِ صد نگاہ۔ سامانِ صد جراحتِ پنہاں، بساطِ عجز، وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ حضرت داغ نے حسبِ ذیل الفاظ کو متروکات میں داخل کر دیا ہے۔ اور کچھ عرصہ تک یہ متروکات میں شمار ہوتے رہے ہیں۔ لیکن حسرت و فانی کے یہاں ان کے مستعمل ہونے سے گمان ہوتا ہے کہ یہ حضرات ان کو پھر جاری کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال وہ الفاظ جو فانی کے کلام میں پائے گئے حسبِ ذیل ہیں اور راقم خاکسار کی رائے میں قابلِ ترک ہیں۔

کاہے کو، ارے توبہ، اللہ رے، لہو بجائے خون، ہائے رے۔ انکھڑیوں وغیرہ

فانی نے اپنے اشعار میں بعض مضامین غالب سے مستعار لئے ہیں۔ اُن کے مداح تو ان اشعار کو غالب کے اشعار کے بالمقابل پیش کرتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک اگر ان کو سرقہ بھی نہ کہا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ فانی نے نئے طرز سے ان مضامین کو باندھنا چاہا لیکن وہ ناکام رہے ہیں۔ اکثر غزلیں غالب کی غزلوں پر کہی گئی ہیں۔ مگر فانی وہ اندازِ غالب کہاں سے لاتے۔ جو ان کی یہ غزلیں قبول ہوتیں۔ طبع آزمائی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوا خود فانی کا رنگ قابلِ تعریف سہی مگر اس قدر پختہ اور شستہ نہیں ہے کہ اُن کو استادوں کے زمرہ میں شامل کیا جائے۔

غالب

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

فانی

جتنے غم چاہے دیے جا مجھے یارب لیکن
ہر نئے غم کے لئے تازہ جگر پیدا کر

ہے کہ فانی نہیں ہے کیا کہئے
راز ہے بے نیاز محرمِ راز

اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے
میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

اپنی تو ساری عمر ہی فانی گزار دی
اک مرگِ ناگہاں کے غمِ انتظار نے

غالب — **فانی**

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

یا میرے بیشمار گناہوں سے درگزر
یا میرے عذر حسن کرم بے حساب سے

ذیل میں فانی کے اشعار گوہر بار پیش کئے جاتے ہیں:-

بے اجل کام نہ اپنا کسی عنوان نکلا — دم تو نکلا مگر آزردۂ احسان نکلا

بجلیاں شاخ نشیمن پہ چھپی جاتی ہیں — کیا نشیمن سے کوئی سوختہ سامان نکلا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی — زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

مذاق تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا — بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

ظہور جلوہ کو ہے ایک زندگی درکار — کوئی اجل کی طرح دیدہ آشنا نہ ملا

نشان مہر ہے ہر ذرہ ظرف مہر نہیں — خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

اے جذب بیخودی ترے قربان جائیے — پھرتا ہے دل میں کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا

فغاں نے کوئی اثر تو کیا یہ کیا کم ہے — یہی سہی کہ وہ آزردۂ فغاں نہ ہوا

یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی — فانی نا امید کو موت کا آسرا دیا

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں — اک بیقرار تڑپا اک دل فگار رو دیا

لکھ چکے ہم جا چکا خط گر یہی حالت رہی — ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی — تھک تھک کے اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

سایہ بھی جس پہ میرے نشیمن کا پڑ گیا — کیوں آسماں وہ باغ ہی سارا اجڑ گیا

بنتی نہیں ہے صبر کو رخصت کئے بغیر — کام ان کی بیقرار نگاہوں سے پڑ گیا

اک حشر اور چاہئے اس روسیاہ کو — فانی زمین حشر میں غیرت سے گڑ گیا

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا — اک جوش تھا کہ محو تماشائے جوش تھا

ہائے کیا دن ہیں کہ نقش سجدہ ہے اور سر نہیں — یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبال دوش تھا

عشق کی دنیا زمین سے آسماں تک شوق تھی — تھا تو کچھ تیرے سوا آغوش ہی آغوش تھا

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ — کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

وہ جلوہ مفت نظر تھا نظر کو کیا کہئے — کہ پھر بھی ذوق تماشا نہ کامیاب ہوا

اُلٹ گئی مری اُمید و بیم کی دنیا — پھر کیا نظامِ تمنّا میں انقلاب ہوا

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد نہیں بہار کیا — ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا؟

اپنے کمالِ شوق پہ حشر کا دن ہے منحصر — وعدۂ دید چاہیئے زحمتِ انتظار کیا

تجلیات وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل — کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

خطابِ روزِ حشر کی صدائے بازگشت ہوں — جوابِ بے سوال ہوں سوالِ بے جواب کا

بہار اپنی چمن اپنا قفس کی تیلیوں تک ہے — مبارک نکہتِ گل کو چمن بردوش ہو جانا

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

تعینات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ — بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار — نہ موجِ بوئے گل اُٹھتی نہ آشیاں ہوتا

اس جانِ تمنّا سے بے پردہ نہ شکوہ کر — وہ تجھ سے خفا ہے تو جینے سے خفا ہو جا

اس ہستی فانی سے کر قطعِ نظر فانی — تو دوست کا طالب ہے دشمن سے جدا ہو جا

نہ آ فریب کہ پروردۂ فنا ہوں میں — بنا ہے برق کے تنکوں سے آشیاں صیّاد

قسمت کے حرفِ سجدۂ در سے مٹا تو دوں — دل کانپتا ہے شوخیِ تدبیر دیکھ کر

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی — دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم — رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

جسمِ آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح — خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

ظرفِ دیوانہ بقدرِ ہمتِ وحشت نہیں — لاؤ ہر ذرّہ میں پیدا وسعتِ صحرا کریں

بیزار ہو نہ جائے کہیں زندگی سے دل — تاثیر سے خفا مرے نالے ہوئے تو ہیں

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی — سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

حشر میں حشر چاہیئے حشر پہ حشر چاہیئے — دفن ہیں سجدہ ہائے شوق ناصیۂ نیاز میں

آسماں بھی ترے کوچے کی زمیں ہے لیکن — وہ زمیں جس پہ ترا سایۂ دیوار نہیں

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ " — بھڑک اُٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

سنتے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے — کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

اک سرگزشتِ درد ہے ہر ذرّہ خاک کا — پہنچی ہے داستانِ غمِ دل جگہ جگہ

نہیں کہ وحشتِ دل چارہ گر نہیں ہے مجھے — جنونِ چارۂ وحشت مگر نہیں ہے مجھے

یہ جستجو ہے کہ ہے عالمِ مجاز کہاں — تلاشِ چشمِ حقیقت مگر نہیں ہے مجھے

دل جن سے ملے اب وہ نگاہیں نہیں ملتیں — ملنے کو تو ملتی ہے نظر اُن کی نظر سے

رہ جائے یا بلا سے یہ جان رہ نہ جائے — تیرا تو اے ستمگر ارمان رہ نہ جائے

اے یاس تُونے آکے اُسے بھی مٹا دیا — لذت سی کچھ جو شکوۂ رنج و محن میں تھی

نگاہِ شوق کے دم تک تھیں آنکھیں — اب آنکھیں یادگاریں ہیں نظر کی

اب جفا ہے نہ وفا یادِ وفا باقی ہے — تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانونکی

مانا حجابِ دید مری بے خودی ہوئی — تم وجہِ بیخودی نہیں یہ ایک ہی ہوئی

چمکا دیا ہے رنگِ چمن لالہ زار نے — شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے

ہاں ہم نہ تھے فریبِ تمنّا سے بے خبر — کیا کہئے کیا کیا دلِ اُمیدوار نے

بشر میں عکسِ موجوداتِ عالم ہم نے دیکھا ہے — وہ دریا ہے یہ قطرہ لیکن اس قطرہ میں دریا ہے

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے — ٹھہر جائے تو انگارہ ہے بہ جائے تو دریا ہے

مری محرومیوں کا فیض جاری ہے رگ و پے میں — بدن میں جو لہو کی بوند ہے خونِ تمنّا ہے

عشق نے دل میں جگہ کی تو قضا بھی آئی — دردِ دنیا میں جب آیا تو دوا بھی آئی

ہماری لاش مرقع ہے بے قراری کا — اِک اضطراب کی صورت بھی اس قرار میں ہے

افشائے رازِ اہلِ جنوں مصلحت نہیں — پھرتا ہوں دھجیوں کو گریباں کئے ہوئے

کیوں اہلِ حشر ہے کوئی نقّادِ سوزِ دل — لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے — موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم — بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

یہاں بلائے شبِ غم وہاں بہارِ شباب — کسی کی رات کسی کے ہیں دن قیامت کے

شیوۂ عاشقی نہیں ہجر میں آرزوئے مرگ — ہاں نہیں زندگی عزیز موت ہی زندگی سہی

اپنے دیوانے پہ اتمامِ کرم کر یا رب — درو دیوار دئے اب انہیں ویرانی دے

ہر دل ہے تیرے غم کی امانت لئے ہوئے — ذرّے ہیں اِک جہانِ حقیقت لئے ہوئے

اجل سے ہے دلِ مایوس کو اُمیدِ آسائش — مری ڈوبی ہوئی کشتی کو ساحل کی تمنّا ہے

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں — آواز آرہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار تیرے — یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی — دنیا ہی بدل دی ہے تعمیرِ نشیمن نے

جگر

آپ کا نام علی سکندر اور جگر تخلص ہے۔ مراد آباد کے رہنے والے ہیں حضرت اصغر سے مستفید ہیں اور تسلیم سے اصلاح لی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے۔ کہ ہر ایک کامل فن سے استفادہ کیا ہے۔ حسرت موہانی اور اصغر گونڈوی کے بھی معتقدین میں سے ہیں۔ اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ مزاج لاابالی واقع ہوا ہے۔ بظاہر رند مشرب ہیں۔ دل کا حال خدا جانتا ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی کے یوم تاسیس کے موقع پر دو تین مرتبہ خود آپ کی زبان سے آپ کا کلام سننے کا اتفاق ہوا خوب پڑھتے ہیں۔ الفاظ کو اس قدر کھینچتے ہیں۔ کہ بعض اوقات یہ شبہ ہو جاتا ہے۔ کہ مصرع وزن سے گر گیا۔ لیکن پڑھنے کا انداز ساحرانہ ضرور ہے۔ صورت سے ہمہ تن شعر معلوم ہوتے ہیں۔ جو تصویر آپ کے مجموعۂ کلام میں چھپی ہے۔ اُس سے ہمارے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اگر امروہہ مصحفی کے وطن ہونے پر فخر کر سکتا ہے۔ تو مراد آباد کا جگر کے مرز بوم ہونے پر نازاں ہونا بجا ہے۔ اندازاً پچاس سال کی عمر ہے۔ گذشتہ صدی کے آخری سنین میں پیدا ہوئے ہونگے۔ فارسی کی کافی استعداد رکھتے ہیں۔ خوش طبع خلیق اور منکسر المزاج ہیں۔ بقید حیات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ دیر تک یہ سلسلہ قائم رکھے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ آپ کے مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہجہاں کے اُستاد تھے۔ لیکن عتاب شاہی کی وجہ سے دلی کو چھوڑ کر مراد آباد کو وطن اختیار کرنا پڑا۔ خاندان میں برابر علم کا چرچا چلا آتا ہے۔ جگر کے والد مولوی علی نظر صاحب بھی شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ خواجہ وزیر سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ جگر کی ابتدائی تعلیم نہایت معمولی ہے۔ فارسی میں یوسف زلیخا اور سکندر نامہ دیکھا ہے۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتے ہیں۔ حسن مجازی کی تلاش و جستجو میں مختلف مقامات کی سیر کی ہے۔ ۱۳، ۱۴ برس کے سن سے شعر کہتے ہیں۔ شگفتہ مزاج اور رنگین طبع ہیں۔

کلام پر تبصرہ

عصر حاضر میں رنگ تغزل بدل گیا ہے۔ قافیہ پیمائی کی بجائے خیال آرائی کو جگہ دی گئی ہے۔

انداز بیان نے بھی کروٹ لی ہے۔ اور غالب و مومن کے طرز بیان کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔ لیکن تغزل میں اگلوں نے کوئی بات باقی نہیں چھوڑی۔ خیالات تو کم و بیش وہی ہوتے ہیں جو سلف کے یہاں بندھے ہیں۔ البتہ ان کو اس طرح بیان کر دینا کہ ان میں ندرت اور دلفریبی کی شان پائی جائے۔ یہی موجودہ رنگِ تغزل کے لئے باعثِ فخر ہے۔ حضرتِ جگر میں وارداتِ قلب کو اپنے خاص انداز میں بیان کر دینے کی قدرت پائی جاتی ہے۔ وہ دوسروں کے قلوب کو اپنے کلام سے گرما دیتے ہیں۔ اور جوش و اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ رعنائی بھی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ جو خیالات دیگر شعراء کے یہاں بندھ چکے ہیں۔ ان کو اپنے اندازِ خاص میں اس طرح بیان کیا ہے۔ کہ اگر ان سے سبقت نہیں لے گئے تو نہ سہی۔ اور ان کی ہمسری نہیں ہو سکی تو نہ سہی۔ لیکن سامعین میں ایک کیفیت اور اثر ضرور پیدا کر دیا۔ مثلاً

جگر، میں وہاں ہوں جہاں نہیں میں بھی
عالم ماورائے عالم کیا

غالب، ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

〃 اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں
درحقیقت مجھ کو جیسے اعتبار آ ہی گیا

〃 ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

〃 عشق بے اقتدار کے ہاتھوں
حسن خود بھی شکستہ پا ہوا

〃 پھر لیا ہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

〃 وہ ہمارے قریب ہوتے ہیں
جب ہمارا پتہ نہیں ہوتا

مومن، تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

〃 الٰہی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہے
بھلاتے ہیں انہیں وہ یاد آئے جاتے ہیں

حسرت موہانی، بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

مومن، دل کو قلق ہے ترکِ محبت کے بعد بھی
اب آسماں کو شیوۂ بیداد آ گیا

آپ کے کلام میں داغ کا رنگ بھی نمایاں ہے مثلاً

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

پھر اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں
بادش بخیر جس نے دیوانہ کر دیا ہے

مجھ کو جنوں سے اپنے شکوہ جو ہے تو یہ ہے
میری محبتوں کو افسانہ کر دیا ہے

آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں فرما دیجئے　　　سب یہ کہتے ہیں جگر دیوانہ ہے دیوانہ ہے

ذرّہ ذرّہ دیدۂ و دل ہے گوشہ گوشہ بستی ہے　　　عشق ہے جب تک سلسلہ جنباں دل کی ہستی، ہستی ہے

بعض تراکیب فارسی بھی آپ کے کلام میں دلپذیر واقع ہوئی ہیں مثلاً

غم التفاتیاں ع　　اس کی غم التفاتیاں سہے سہے

ساغر سر جوش، نظارہ فراموش۔ ع

آنکھ نظارہ فراموش ہوئی جاتی ہے

پشیمان نگاہی محشر ادا ع :-

یہیں کہیں کسی محشر ادا نے لوٹ لیا

حسن برق خرام ع :- جیسے کوئی نسبت خاص ہو ترے حسن برق خرام سے

چشم بادہ بجام، مجبور کشاکش، ظالم مظلوم نما۔ شعر

میری جانب نگہ ہوش ربا آتی ہے　　　پھر وہی ظالم مظلوم نما آتی ہے

لغزش نیم گام۔ شعر

لرزش دست شوق آہ! نہ پوچھ　　　لغزش نیم گام نے مارا

ذرۂ بے کیف، روح خوابیدہ، پائے طلب، شعلہ بداماں، حیرت آباد فنا، شورش بیگانگی، فردوس بداماں، شعر

جہنم میں بھی فردوس بداماں ہونگے　　　دیکھ لینا وہ ہمیں سوختہ ساماں ہونگے

سجدہ ریز مستی اور جوش انتظار وغیرہ۔

ایک جگہ آپ نے حسب حال شعر فرمایا ہے

سب کو مارا جگر کے شعروں نے　　　اور جگر کو شراب نے مارا

نہیں معلوم حضرت جگر متروکات کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لئے کیوں مصر ہیں۔ اور اس میں کیوں لطف محسوس کرتے ہیں۔ اور اسی طرح خلاف محاورہ لکھتے ہیں آپ کا ذوق کیوں خوش ہوتا ہے ہم توارے، اور، نیز انکھڑیوں وغیرہ کے استعمال سے مسرور نہیں ہوتے۔ آپ کو یہ الفاظ اور اسی قبیل کے دیگر الفاظ مبارک رہیں۔ آپ ایک جگہ چھیڑ کی جمع چھیڑیں استعمال کرتے ہیں ؎

اپنے مطلب سے عشق کی چھیڑیں

ظاہری بے وفائیاں توبہ

کربلائیاں سے

منزلِ عشق اے خدا کی پناہ ہر قدم کربلائیاں، توبہ

ہمیں شبہ ہے کہ لفظ کربلائیاں اس معنی میں استعمال بھی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ناکامیاب کی جگہ ناکام ہونا چاہیئے۔ ع

"مرگِ ناکامیاب نے مارا"

مستانہ وار۔ اگرچہ خود حضرتِ جگر بھی اس کو غلط سمجھتے ہیں۔ مگر اُن کا ذوقِ شعری اِس کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ افسوس ہے۔ کہ ہمارا ذوقِ تنقید آپ سے اختلاف رکھتا ہے۔ اور ہرگز جائز نہیں سمجھتا۔ رازدارِ راز شعر

ہمیں وہ اب ہیں جو کھوئے ہوئے سے پھرتے ہیں ہمیں وہ تھے کہ ترے رازدارِ راز رہے

یہاں صرف رازدار کہنا کافی ہے۔ رازدارِ راز غلط ترکیب ہے۔ سیریں سیر کی جمع۔ یہ بھی دل پسند نہیں سے

کیوں ہٹ کے جائیں ہم دل کی سرزمیں سے دونوں جہاں کی سیریں حاصل ہیں سب یہیں سے

اسے کاش بجائے کاش استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ متاخرین شعرا نے اسے کاش بھی استعمال کیا ہے لیکن آجکل کاش فصیح ہے

کہیں کہیں ردیف اور مضمونِ شعر میں باہم ربط باقی نہیں رہا مثلاً

وہ کافر آشنا، ناآشنا یوں بھی ہے اور یوں بھی ہماری ابتدا تا انتہا یوں بھی ہے اور یوں بھی

ہم ہرگز "یوں بھی ہے اور یوں بھی" کو یہاں کوئی معنی نہیں پہنا سکتے۔ وہ ناآشنا اس طرح بھی ہے۔ اور اُس طرح بھی کیا مطلب ہوا؟ جب تک اس کی وجہ ظاہر نہ کی جائے۔ کہ وہ اس طرح اور اُس طرح کیوں ناآشنا ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی کہ "یوں، اور یوں" سے کیا مراد ہے؟ کس طرف اشارہ ہے۔ مشارٌ الیہ کیا ہے۔ یہی حال دوسرے مصرع کا ہے۔ "یوں بھی ہے اور یوں بھی" یہاں بھی بے معنی ردیف ہے۔

وہ مجھ سے پوچھتے ہیں ایک مقصد میری ہستی کا بتاؤں کیا؟ کہ میرا مدعا یوں بھی ہے اور یوں بھی

اگر یہاں "یوں بھی ہے اور یوں بھی" کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ سمجھتے ہیں وہ بھی مقصد ہے اور کچھ اور بھی ہے۔ تو یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ مضمونِ شعر خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہوا۔

اس غزل میں صرف مقطع اور دو تین شعر باہم مربوط ہیں ورنہ باقی اشعار بے معنی اور غیر مربوط ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقطع پہلے تیار ہو گیا تھا۔ اور یہی اس غزل کی تکمیل کا باعث ہوا۔

اب آپ مرزا غالب کے اس مقطع کو بلکہ اس تمام غزل کو اگر فرصت ہو تو دیکھئے کہ ردیف مضمونِ شعر سے کس قدر چسپاں ہے۔ اگر ردیف کو علیحدہ کر دیا جائے۔ تو نہ صرف مضمونِ شعر مہمل ہو جائیگا بلکہ شعر میں کوئی جان باقی نہ رہے گی۔

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

یہاں وہ بھی ردیف ہے اور کہوں قافیہ ہے

ایک اور شعر سن لیجئے تاکہ ردیف اور قافیہ کا ربط بخوبی سمجھ میں آجائے

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

الغرض اس غزل کے ہر شعر میں آپ وہ بھی کا مشارٌ الیہ واضح طور پر ہر جگہ پائیں گے۔ برعکس اس کے جگر کی غزل میں مشارٌ الیہ ایک چیستاں بنا ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ایک پختہ کار اور خام کار میں کیا فرق ہے؟"

اسی طرح ایک اور غزل ہے۔

کیا قیامت تھا کسی کا شکوۂ بیداد بھی لب تک آئی ٹکڑے ہو ہو کر مری فریاد بھی

یہاں بھی ردیف ہے۔ جو بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس کو حذف کر دیں۔ تو مضمون شعر بہتر ہو جائے۔ افسوس ہے کہ حضرت جگر اس قسم کی ردیف کو ہر شعر میں نہیں نبھا سکتے۔ صرف ایک یا دو شعر مربوط ہیں مثلاً

دیکھئے کس کی فغاں میں پہلے آتا ہے اثر میں بھی نالے کر رہا ہوں بلبلِ ناشاد بھی

آپ کا فارسی کلام بھی خاصا ہے۔ لیکن ایک آدھ اردو نظم جو آپ نے لکھی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آپ اس کے مردِ میدان نہیں۔ آپ تنگنائے غزل ہی میں جولانی دکھلا سکتے ہیں۔ اور ہم امید کرتے ہیں۔ کہ غزل گوئی میں ابھی آپ اور ترقی کریں گے۔ شعلۂ طور میں تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار ہیں۔ اگرچہ حضرتِ جگر نے اس سے بہت زیادہ کہا ہے۔ جو افسوس ہے کہ ضائع ہو گیا۔ اور یہ مجموعہ بھی چند احباب کی سعی پیہم کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جگر کا لاابالی مزاج اس مجموعہ کو بھی فراہم نہ کر سکتا

ذیل میں آپ کے منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں

ہم نے ناکامیوں کو ڈھونڈھ لیا آخرش کامیاب ہونا تھا

ایک رنگیں نقاب نے مارا حسن بن کر حجاب نے مارا

چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا اس ادائے حجاب نے مارا

موت کیا؟ ایک لفظِ بے معنی — جس کو مارا حیات نے مارا

اُن نگاہوں کے سب کرشمے ہیں — ورنہ یہ اضطراب مبہم تھا

کام آخر، جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا — دل کچھ اس صورت سے تڑپا، اُن کو پیار آ ہی گیا

عرضِ نیازِ غم کو لب آشنا نہ کرنا — یہ بھی اک التجا ہے، کچھ التجا نہ کرنا

زبان خموش، نظر بے قرار، چہرہ فق — تجھے بھی کیا؟ تری کافر ادا نے لوٹ لیا

نشانِ منزلِ جذبِ تمام چھپ نہ سکا — اِدھر فنا ہوا قطرہ، اُدھر حباب اُٹھا

ادب شناسِ محبت، دلِ خراب ہوا — ترا حجاب نہ کرنا بھی، اب حجاب ہوا

محبت نے مجھ کو، مائلِ عصیاں بنا دیا — اک پیکرِ حقیقت عریاں بنا دیا

اپنی نظر کی برق وشی کو بھی دیکھئے — مجھ سے ہی کیا پوچھئے مزاجِ اضطراب کا

صحرا سے جستجو سے، نہ آگے بڑھے قدم — گم اس کی وسعتوں میں ہر اک کارواں ہوا

سنایا جس قدر ہستی کو تصویریں ہوئیں پیدا — ہوئے ہم جس قدر آزاد، زنجیریں ہوئیں پیدا

یہ سب نمود و نمائش ہے تیرے چھپنے سے — جو تو نہ پردے میں ہوتا، تو میں کہاں ہوتا

سب اُن پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں — اشکوں کی آرزوئیں، آنکھوں کی التجائیں

محبت اثر کرتی ہے چپکے چپکے — محبت کی خاموش چنگاریاں ہیں

تغافل ہے اک شانِ محبوب لیکن — تغافل میں پنہاں خبرداریاں ہیں

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی — جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں

خطاؤں سے پہلے پشیمانیاں ہیں — محبت کی معصوم نادانیاں ہیں

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں — ہم اُن میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں

میں اپنی آہ کے صدقے کہ میری آہ میں بھی — تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہیں

محبت کی محبت تک ہی جو دنیا سمجھتے ہیں — خدا جانے وہ کیا سمجھے ہوئے ہیں کیا سمجھتے ہیں

کمالِ تشنگی ہی سے بجھا لیتے ہیں پیاس اپنی — اسی تپتے ہوئے صحرا کو ہم دریا سمجھتے ہیں

مٹ چکے ذہن سے سب یادِ گزشتہ کے نقوش — پھر بھی اک چہرہ ہے ایسا کہ فراموش نہیں

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر — جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز — کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

تری مست نظریں غضب ڈھا رہی ہیں — یہ عالم ہے جیسے اُڑا جا رہا ہوں"

عشق کا پیغام مستی، شوق کی روداد ہوں
زندگی جس سے برستی ہے، میں وہ فریاد ہوں

میری ہستی ہے، مری عرضِ تمنائے دوست
خود میں فریاد ہوں، میری کوئی فریاد نہیں

میری ہستی، جستجو میری حقیقت احتیاج
میں سراپا درد ہوں، میں مستقل فریاد ہوں

اے کاش وہ حسرت زدۂ طور کو ملتی
جس آنکھ سے ہم حسنِ بتاں دیکھ رہے ہیں

کیا آگیا خیالِ دلِ بیقرار میں
خود آشیاں کو آگ لگا دی بہار میں

میں خطا کار، سیہ کار، گنہگار، مگر
کس کو بخشے تری رحمت، جو گنہگار نہ ہو

خود ہے جمالِ دید ہی، وجہِ حجابِ دید
دیکھوں اسے، وہ مجھ کو اگر دیکھتا نہ ہو

سمجھائے کون بلبلِ غفلت شعار کو
محدود کر لیا ہے چمن تک بہار کو

عشق کی دسترس ہو کیا جلوۂ بے پناہ تک
اٹھ نہ سکی نگاہ بھی، کر نہ سکے اک آہ تک

اندازۂ ساقی تھا، کس درجہ حکیمانہ
ساغر سے اٹھیں موجیں، بن کر خطِ پیمانہ

اک شوقِ دید بیحد، سب کچھ دکھا رہا ہے
کوئی نہ آ رہا ہے، کوئی نہ جا رہا ہے

کچھ اس طرح، وہ پسِ پردۂ مجاز رہے
حجابِ ساز میں جیسے نوائے ساز رہے

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پہ
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جہاں تک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں
یہ محفل اور برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے

مجھے ہلاکِ فریبِ مجاز رہنے دے
نہ چھیڑ، او نگہِ امتیاز رہنے دے

ہر جلوہ ہے، بجائے خود اک دعوتِ نگاہ
کیا کیجئے، جو تیری تمنا نہ کیجئے

رعنائیِ خیال کو رسوا نہ کیجئے
ممکن بھی ہو، تو عرضِ تمنا نہ کیجئے

انہیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم
پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

یہ راز سن رہے ہیں اک موجِ تہ نشیں سے
ڈوبیں گے ہم جہاں پر اچھلیں گے پھر وہیں سے

اے حسن اپنی حوصلہ افزائیاں تو دیکھ
مانا کہ چشمِ شوق بہت بے حجاب ہے

جو الٹ دیتی ہے صفیں کی صفیں
اک شکستہ سی آہ ہوتی ہے

ہم سے ایسی چلی، کہ بس توبہ
ورنہ، آپس میں چل ہی جاتی ہے

کچھ اس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے
جب تک ہمارے پاس رہے، ہم نہیں رہے

یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حسن
جب دیکھئے کچھ نیند سی آنکھوں میں بھری ہے

تیرے جلوؤں کو دیکھیں اور تیرے دل کی طرف دیکھیں
کہاں ہیں اتصالِ موج و ساحل دیکھنے والے

مجھے آغوشِ طوفاں ہی جگر آغوشِ مادر ہے — وہ کوئی اور ہونگے امنِ ساحل دیکھنے والے

اللہ تجھے رکھے محفوظ حوادث سے — اے کفر! ترے دم تک آرائشِ ایماں ہے

ہر فتنے کے پیکر ہیں، اک روحِ وفا ڈالی — اپنی ہی سی کُل دنیا عاشق نے بنا ڈالی

ہر طرف بے فائدہ، کیوں سعیِ پیہم کیجئے — تشنگی سے اپنی پیدا، بحرِ اعظم کیجئے

پھر اُس کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں — یادش بخیر! جس نے دیوانہ کر دیا ہے

فکرِ منزل ہے، نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے — جا رہا ہوں جس طرف لیجا رہا ہے دل مجھے

جب سے اُس نے پھیر لیں نظریں، رنگِ تباہی ہے نہ پوچھ — سینہ خالی آنکھیں ویراں، دل کی حالت کیا کہئے

جیتے تک ہیں ہوش کے جلوے آگے ہوش کی مستی ہے — موت سے ڈرنا کیا معنی؟ موت بھی جنسِ ہستی ہے

چلی کچھ ایسی مخالف ہوا زمانے کی — پناہ بجلی نے لی میرے آشیانے کی

تھی شورشِ ہستی ہی تمہیدِ فنا، یعنی — ہنگامۂ محفل ہی، برہم زنِ محفل ہے

زندگی جس سے عبارت ہے جگر — وہ کسی کی اک نگاہِ ناز ہے

پھولوں کا نہ وہ رنگ، نہ بلبل کے وہ انداز — عالم ہے مبدّل مری حیراں نظری سے

ہم اور اُن کے سامنے عرضِ نیازِ عشق — لیکن ہجومِ شوق سے مجبور ہو گئے

برسائی آنسوؤں کی جھڑی چشمِ یار نے — کیا آج کہہ دیا مری خاکِ مزار نے

سب رفتہ رفتہ داغِ الم مٹ گئے مگر — محفوظ ہے وہ زخم، جو پہلی نظر کا ہے

داستانِ غمِ دل اُن کو سنائی نہ گئی — بات بگڑی ہی تھی کچھ ایسی کہ بنائی نہ گئی

ہر سو دکھائی دیتے ہیں وہ جلوہ گر مجھے — کیا کیا فریب دیتی ہے میری نظر مجھے

پھر عشقِ جنوں پیشہ ہوں سلسلہ جنباں ہے — راہیں بھی گریزاں ہیں، منزل بھی گریزاں ہے

بے نقاب آج تو یوں جلوۂ جاناں ہو جائے
جو جہاں پر ہو، وہیں بیخود و حیراں ہو جائے

وحشت

لہ

رضا علی نام وحشت تخلص ہے۔ آپ ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء میں بمقام کلکتہ پیدا ہوئے۔ والد ماجد مولوی شمشاد علی مرحوم باشندۂ شہر ہگلی (بنگالہ) تھے۔ اور دادا حکیم غالب علی مرحوم تھے۔ جنہوں نے ایام غدر میں دہلی سے آکر شہر ہگلی میں سکونت اختیار کی تھی۔

آپ کی تعلیم مدرسۂ عالیہ (بہرۂ انگریزی) میں ہوئی تھی اور شعر و سخن سے ایک فطری مذاق ہونے کی وجہ سے اسکول کی طالب العلمی ہی کے زمانہ میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا ۱۸۹۸ء میں مولوی ابوالقاسم محمد شمس مرحوم تلمیذ حضرت داغ دہلوی و خلف الرشید مولوی عبدالغفور خاں بہادر نساخ کے شاگرد ہوئے۔ طبیعت کا میلان فارسی شاعری کی طرف بھی تھا چنانچہ دیوان میں جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ کچھ فارسی کا کلام بھی موجود ہے۔

۱۹۲۶ء میں جب اسلامیہ کالج کلکتہ قائم ہوا۔ تو آپ اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس سے پہلے آپ امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ کے دفتر فارسی کے "چیف مولوی" تھے ۱۹۳۱ء میں آپ کو سرکار کی طرف سے خطاب "خان بہادر" عطا ہوا ۱۹۳۶ء میں پنشن ہو گئی۔

یہ حالات نہایت اختصار کے ساتھ خود حضرت وحشت نے ہماری درخواست پر لکھ کر بھیجے ہیں۔ افسوس ہے آپ نے اپنی ذہانت و طباعی کی کوئی مثال نہیں لکھی۔ ممکن نہیں کہ عہد طفولیت میں کوئی واقعہ ایسا نہ ہوا ہو جس سے آپ کی آئندہ زندگی پر روشنی پڑتی ہو لیکن آپ نے خودستائی سمجھ کر اسے ترک کر دیا ہے

ہم آپ کو بالکل بنگالی سمجھتے تھے اور حیران تھے کہ غالب کے طرز میں ایک باشندۂ کلکتہ ایسے شعر کیونکر کہہ سکتا ہے لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ غالب بھی دہلی سے بایام غدر میں آپ کے دادا صاحب کلکتہ جا کر آباد ہو گئے تھے ہماری حیرت کا خاتمہ ہو گیا

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں   کعبے سے اِن بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

کلام پر تبصرہ

آپ کے دیوان میں غزلیات، قطعات، رباعیات، مخمسات، مسدسات، سہرے اور جدید طرز کی نظمیں موجود ہیں۔ لیکن غزلیات سب پر حاوی ہیں جن کے اشعار کی تعداد تقریباً گیارہ سو ہوگی۔

آپ کا کلام دیکھ کر تاریخِ ادبِ اُردو کے تین دور یاد آ جاتے ہیں۔ پہلا دور وہ جب میرامّن اپنے دیگر رفقاء کے ساتھ فورٹ ولیم کالج میں بیٹھے ہوئے زبانِ اُردو کی خدمت پر کمربستہ ہیں۔ دوسرا دور وہ جب مرزا غالب اجرائے پنشن کے لئے کلکتہ کا سفر کرتے ہیں۔ اور وہاں کے اہلِ علم حضرات اِن سے دست و گریباں ہوتے ہیں۔ اور یہ حضرت "مثنوی بادِ مخالف" لکھ کر ان کو جواب دیتے ہیں۔ تیسرا دور خود حضرت وحشت کا دور ہے اور بے ساختہ دل سے دُعا نکلتی ہے کہ "اللّٰھم زد فزد" آخر کار میرامّن کی انشاپردازی ایسے دُور دراز خطے میں جہاں کوئی اُردو کا نام بھی نہ جانتا ہو۔ بارآور ثابت ہوئی اور حضرت وحشت اس کے ثمرِ نورس ہیں۔

یہ دیوان وحشت جو ہمارے پیشِ نظر ہے ۱۹۰۹ء میں طبع ہوا تھا۔ راقم خاکسار آپ کی غزلیں رسالہ اُردوئے معلّیٰ علی گڑھ میں پڑھ کر لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ لیکن کبھی دیوان کی زیارت نصیب نہ ہوئی تھی۔ اب ضرورت نے جستجو پہ مجبور کیا۔ تو یہ نسخہ کتب خانۂ وقف منصبیہ میرٹھ سے دستیاب ہوگیا۔ آپ نے دیوان کے آخر میں جو رائے مولانا حالی مرحوم کی درج کی ہے۔ اُس کے بعض حصّے یہاں نقل کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

. . . . یہ عطیہ میرے حصّہ میں اُس وقت آیا جبکہ میں اُس کی قدر کرنے کے لائق نہیں رہا۔

چیدند خوانِ نعمتے چوں از جہاں دِل سیر شد
دادند آبِ زندگی امّا پس از نزعِ رواں

. . . . دیوانِ وحشت کے مطالعہ سے میرے دل میں بلا مبالغہ ایک عجیب کشش پیدا ہوئی ہے۔ اوّل تو آپ کا تخلص مرزا اسد اللہ خاں مرحوم کی صحبت کے ایک اعلیٰ رکن یعنی سیّد غلام علی خاں وحشت کی یاد کو تازہ کرتا ہے جن کی نسبت

مرزا صاحب اپنی ایک اُردو غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :-

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

دوسرے آپ کی طرزِ سخن سنجی دیکھ کر زمانہ کے انقلاب پر ایک مسرت آمیز تعجب کا سماں دل پہ چھا جاتا ہے۔ خدا کی شان ہے۔ کہ جس بزرگ پر اہل کلکتہ کی طرف سے سنین ماضیہ میں دو بار حد سے زیادہ اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی تھی اور نکتہ چینی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا تھا۔ آج کلکتہ کے ارباب فضل و کمال میں سے ایک یگانہ و برگزیدہ شخص اُسی بزرگ کے تتبع پر فخر کرتا ہے . . . . آپ نے مرزا کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کر کے ثابت کر دیا۔ کہ سچائی کا مقابلہ کیسی ہی سختی کے ساتھ کیا جائے۔ وہ آخر کار اپنا نقش لوگوں کے دلوں پر جمائے بغیر نہیں رہتی۔ اگر انصاف سے دیکھئے۔ تو مرزا کا تتبع کرنا درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا۔ مگر آپ نے ہمارا یہ حق ہم سے چھین لیا ہے۔ سچ ہے ؎ "دوران باخبر در حضور و نزدیکان بے بصر دور"۔ تکلف برطرف اگر مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے مستثنیٰ کر لیا جائے۔ تو آپ کے اُردو دیوان کو بے شائبہ تصنع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخل مبالغہ نہیں ہو سکتا . . . ."

مجھے مولانا حالی مرحوم کی رائے کے لفظ لفظ سے اتفاق ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ آپ کے دیوان کے مطالعہ سے مجھ پہ یہی اثر ہوا۔ کہ گویا غالبؔ کا دیوان ہے۔ لیکن جو کیفیت اور ایک قسم کی بے خودی غالبؔ کے کلام میں نظر آتی ہے۔ اس کی کمی کا احساس بھی ساتھ ساتھ ہوا۔ جہاں تک زبان اور اظہار خیال کا تعلق ہے۔ بیشک آپ نے صحیح صحیح نقشہ اُتار دیا ہے۔ لیکن علوئے تخیل اور مضامین کی سربلندی نہ آپ کے قبضہ کی بات تھی۔ اور نہ آپ اُس کو پیدا کر سکتے تھے۔ یہ ایک چیز ما در رائے اکتساب ہے۔ اور تقلید سے بالاتر ہے۔ بہرحال بقول مولانا شبلیؒ "آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالبؔ اور مومنؔ کی ترکیبیں اور طرزِ ادا آپ سے خوب بن پڑتی ہیں۔"

بیسویں صدی کے آغاز سے ہماری شاعری میں ایک طوفانِ انقلاب برپا ہے۔ آج کل پرانی باتیں خواب و خیال ہو گئی ہیں۔ انگریزی تعلیم کے اثر نے ہمیں اپنی غزل گوئی سے بدگمان کر دیا ہے اور ہم خیالی باتوں کی بجائے حقیقی امور کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں لیکن غزل سے متنفر نہ ہونا اس بات

کی دلیل ہے کہ ابھی ہماری زبان میں ایسے شعرا موجود ہیں۔ جو ایک ہی بات دُہرانے اور لکھنے کے باوجود کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان بہم پہنچا لیتے ہیں۔ داغ مرحوم کے بعد ہماری غزل گوئی یقیناً ختم ہو جاتی اگر حسرتؔ اور وحشتؔ جیسے صاحب کمال افق اردو پر جلوہ افگن نہ ہوتے۔ یہ انہی جیسے اصحاب کا صدقہ ہے۔ کہ اردو غزل گوئی کی کچھ نہ کچھ وقعت باقی ہے۔ ورنہ حضرت داغ نے جو روش اختیار کی تھی۔ وہ بالکل ایک ایسے مسلمان امیر کی تھی۔ جو اپنی بے اعتدالیوں اور لاابالیوں سے اپنے بزرگوں کی جائداد کو زیر قرضہ کر رہا ہو۔ اور جب قرضہ کا بار ناقابل ادا ہو گیا تو وہ یہ خیال کر کے کہ ہم کیوں نہ اپنی زندگی آرام سے بسر کر جائیں اور بھی زیادہ اسراف سے کام لے اور اپنی اولاد کو نانِ شبینہ کے لئے محتاج چھوڑ جائے۔ چنانچہ داغ کے بعد اگرچہ ان کے شاگرد ہندوستان کے تمام اکناف و اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور غالباً ان میں سے ہر ایک کو جانشینیِ داغ کا دعویٰ ہے لیکن حقیقتاً یہ اُسی مسلمان امیر کی اولاد کی طرح بلحاظ مضمون و جدت، غزل گوئی میں نانِ شبینہ کو محتاج ہیں اور اگر ہندوستان میں انہی لوگوں کا دَور دَورہ ہوتا۔ تو غزل گوئی اب سے بہت بیشتر صفحۂ عالم سے مٹ چکی ہوتی

یہ سچ ہے کہ اب ہم کو اس صنعت (غزل) کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے کیونکہ غالبؔ و مومنؔ کی تقلید سے بھی کچھ زیادہ فائدہ متصور نہیں۔ تغزل کا چراغِ سحری ٹمٹما رہا ہے۔ اور بزم شب کی دلفریبیاں ختم ہو چکی ہیں۔ آفتابِ عالمتاب نکلنے والا ہے۔ شاعرانِ نکتہ سنج کب تک اس چراغ میں تیل ڈالتے رہیں گے۔ کیونکہ صبح کی روشنی میں شمع کی تابناکی کب تک قائم رہ سکتی ہے؟ آیندہ شعرائے اردو اگر اپنے کلام کی بنیاد اس کمزور صنعت پر نہیں رکھنا چاہتے۔ تو ان کی شاعری ضرور کامیاب ہوگی ورنہ ہمارا خیال یہ ہے کہ آگے چل کر ان کے کلام کو اگر انہوں نے غزل گوئی میں کوئی کمال بھی پیدا کیا۔ جس کی قطعی امید نہیں۔ کوئی شخص ہرگز نہ پوچھے گا۔ قدر دانی تو کجا

ہم کو واقعی مسرت ہے کہ جناب وحشتؔ نے طرزِ غالبؔ کو اختیار کیا۔ اور جہاں تک ان سے ممکن ہو سکا اسی طرزِ خاص میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آپ کے کلام میں بھی وہی یا اسی قسم کی فارسی ترکیبیں پائی جاتی ہیں۔ جو غالبؔ کے نام کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ مثلاً عکس تحیر، شعلۂ بےتابی، ہوائے آستاں بوسی، خرابِ بادۂ الفت، وفورِ اضطرابِ شوق، کافرِ نظری، شیوۂ عجز و تسلیم۔ ذوقِ طلب، بانیِ ذوقِ خرابی، شکر بے کسیہائے تمنا، نالۂ وحشت اثر، کاروانِ درِ کارواں، آتشِ نفس، لبریز صد نشاط، گریۂ بےاختیارِ شوق، بیہودہ دارِ شوق، تغافل صبر آزما،

ہنگامۂ تیرا وش لذتِ جگر، تلخی کشِ نومیدیِ دیدار، حسنِ بہارِ طبعِ رنگین، وحشت آبادِ جہاں، مائل شیوۂ تسلیم و رضا وغیرہ وغیرہ۔

ذیل میں چند اشعار پیشِ نظرِ ناظرین ہیں۔ جن سے دھوکا ہوتا ہے۔ کہ شاید غالب کے ہیں:۔

نہیں آئینِ استغنا، حریفِ عجزِ مشتاقی
دلِ آئینہ محوِ بیقراری ہائے جوہر تھا

شہیدِ انتظارِ جلوۂ دیدار ساقی کو
حریفِ چشمِ وا گردیدۂ مشتاق ساغر تھا

ہے تجھے وصل کو درسِ کارِ فنا کی تعلیم
قطرہ دریا سے گریزاں ہے گہر کیا ہوگا

لے کسی پردہ دارِ درد ہوئی
خیر گزری کہ اپنا گھر نہ ہوا

مَیں سادہ لوح واقفِ رسمِ بتاں نہ تھا
اقرارِ عشق کر کے گنہگار ہو گیا

بسانِ دیدۂ بسمل زیارت گاہِ حسرت ہوں
مری ہر ہر نگہ فریاد کرتی ہے زباں ہو کر

دل گور ہا ہے وقفِ ستم ہائے روزگار
روشن ہے داغِ عشق سے بزمِ انجمن ہنوز

ہے شش جہت خرابۂ اداے شہیدِ عشق
مشہور ہے فسانۂ فرہاد ہر طرف

لے واسطے تیری جستجو لیے ڈالے تیری آرزو
مرگِ تحمل اک طرف خونِ تمنا اک طرف

شوق بہار میں کوئی دیکھے بہارِ شوق
دیوانہ ہوں چمن کا رہے کاروبارِ شوق

پرہے گلِ اُمید سے دامن خیال کا
کتنا نظر فریب ہے نقش و نگارِ شوق

بعض اشعار مولانا حالی کی قدیم غزل گوئی کو بھی یاد دلاتے ہیں مثلاً:۔

وسعتِ فہم سے یاروں کی ہے وحشت آگاہ
اس ستم دیدہ سے اظہارِ ہنر کیسا ہوگا

قدر دانی کی کیفیت معلوم
عیب کیسا ہے اگر ہنر نہ ہوا

لغزش ہے کچھ قدم میں ہیں کچھ بے خبر سے آپ
آتے ہیں میرے تابع مشفق کدھر سے آپ

بدلا ہوا مذاقِ سخن ہے زمانے کا
محوِ غزل ہے وحشتِ رنگیں نوا عبث

برس کتنے گزرے یہ کہتے ہوئے
کہ کچھ کام کر لیں گے اب کے برس

آپ کے یہاں تعلی کے اشعار بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ مثلاً

پیچھے پیچھے تیرے ہوگا اہلِ فن کا قافلہ
وحشت ایک دن تو ہی میرِ کارواں ہو جائیگا

تیرے اندازِ سخن سے ہے یہ ظاہر وحشت
کہ مقدر ہے ترا غالبِ دوراں ہونا

ریختے میں ہے مرے رنگِ ظہوری وحشت
ہر کوئی جن کو سمجھ لے یہ وہ اشعار نہیں

وحشت سخن و لطفِ سخن اور ہی شے ہے
دیوان میں یاروں کے تو اشعار بہت ہیں

ہمسری تیری تو اب ہو نہیں سکتی وحشت　　تو فنِ شعر کا استاد ہے ہم مان گئے

وحشت سخن شناس زمانہ میں اب کہاں　　کیونکر نہ رو بیٹے کہ طبیعت پہ ناز ہے

آپ کے اشعار میں بعض بعض تشبیہات بھی پر لطف ہیں۔

آوارہ جو تیرا ہوا اس کو وطن سے کیا غرض　　بازار میں جب آچکا، گل کو چمن سے کیا غرض

دھواں اٹھتا ہے دل سے کوئی بیٹھا ہے کلیجہ میں　　پتہ یوسف کا دیتا ہے غبار کارواں مجھ کو

جیتے رہیں گے وعدۂ صبر آزما پہ ہم　　عمر اپنی مثلِ وقت گریزاں ہی کیوں نہ ہو

رخِ روشن سے یوں اٹھی نقاب آہستہ آہستہ　　کہ جیسے ہو طلوعِ آفتاب آہستہ آہستہ

عرق آلودہ ہونا اس رخِ رنگیں کا ایسا ہے　　کہ جیسے برگِ گل پہ ہو نمایاں بوند شبنم کی

بعض اشعار میں اخلاق کی تعلیم خوبی کے ساتھ دی گئی ہے۔

دوستی سے ہوئے پشیمان ہم　　سچ ہے دنیا سے اٹھ گیا اخلاص

امیری فقیری کا ہے ایک حال　　زمانے میں حاصل ہے کس کو فراغ

نرالا ہے طریقۂ دوستی کا اس زمانہ میں　　جواب کینۂ دشمن ہے مہرِ دوستاں مجھ کو

نہ ہو جو غم کا طلبگار وہ جگر کیا ہے　　نہ ہو جو حق کی طرف دار وہ زباں کیوں ہو

رسائی عقل کی کیا خاک ہو اسرارِ قدرت میں　　مری دیوانگی اچھی مری آشفتگی اچھی

کہ بیٹھنا کچھ جس کا نتیجہ ہو ندامت　　گفتار کا مضمون و مِ گفتار ذرا سوچ

کبھی بھول کر بھی وحشت نہ کیا خیالِ فردا　　میں رہا اسی سے غافل کہ جو کام تھا ضروری

ہم کو تعجب ہے کہ بیسویں صدی میں بھی اور وحشت جیسے شاعر کے یہاں رکیک اشعار پائے گئے۔ اگرچہ یہ لحاظ درجہ یہ اشعار قدیم شعرا کے مقابلہ میں رکیک نہیں کہے جا سکتے۔ تاہم ان کے رکیک ہونے میں شک نہیں۔ ہم اب اپنی شاعری میں سرمہ، کاجل، سبزِ خط وغیرہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ ذیل میں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ جو رکیک ہیں اور حضرت وحشت کے درجہ سے گرے ہوئے ہیں۔

بہارِ دلکشا کرتی تھی کیا کیا گلشن آرائی　　تصور میں مرے دن رات خطِ سبزِ دلبر تھا

سرمہ کس روز تری چشم کا مقتول نہ تھا　　آئینہ کب ترے رخسار کا حیراں نہ ہوا

مجھے دو بوسہ تم اتنی مروت آ نہیں سکتی　　طلب تم سے کروں میں یہ تقاضا ہو نہیں سکتا

وصال اس سبز خط جواں کا نصیب ہو مجھ ستم زدہ کو　　خزاں سے پژمردہ ہو نہ جائے ہرا بھرا باغ آرزو کا

کنار و بوس میں کچھ ان سے میں ہوا گستاخ — کہ آشنا ہی سے ہوتا ہے آشنا گستاخ

حسب ذیل شعر عشق کے درجے سے گرا ہوا ہے۔ اگرچہ خودداری کا شائبہ موجود ہے:۔

پامال آتے جاتے کریں گے ہمیں رقیب — یارب نہ اُس گلی میں ہمارا مزار ہو

حسب ذیل شعر میں ہم کو دلِ ناکامیاب کی ترکیب پر بھی اعتراض ہے۔ کیونکہ ناکامیاب غلط ہے ناکام ہونا چاہیئے۔

اے نوبہار تازہ کسی دن کو یاد کر — افسردگی کو اس دلِ ناکامیاب کی

نواب یوسف علی خان ناظم والیئے مصطفیٰ آباد عرف رام پور کی ایک مشہور قطعہ بند غزل زبان زدِ خاص و عام ہے۔ جس کا مطلع ہے

میں نے کہا کہ دعویٰ اُلفت مگر غلط — کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

اس کے چند شعر حسب ذیل درج کئے جاتے ہیں۔

تاثیر آہ و زاری شب ہائے تار جھوٹ — آوازۂ قبول دعائے سحر غلط

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے — عشق مجاز و چشم حقیقت نگر غلط

بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہیں — اظہار پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

وہ صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں — احمق نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط

کہنا ادا کو تیغ خوشامد کی بات ہے — سینہ کو اپنے اُس کی سمجھنا سپر غلط

مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی — جانِ عزیز پیش کشِ نامہ بر غلط

پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام — کہتے ہو جان دی ہے سرِ رہگذر غلط

ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا — مرنے کی اپنے روز اُڑانی خبر غلط

آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانئے — ہے نظم و نثرِ اہلِ سخن سر بسر غلط

اسی غزل کو دیکھ کر غالباً جناب وحشت نے بھی دوسری زمین میں طبع آزمائی فرمائی ہے چنانچہ ان کا ارشاد ہے:۔

کہتے ہیں وہ کہ نالہ ہو آتش فشاں غلط — سوزِ درون غلط، غمِ عشقِ نہاں غلط

سب اپنے کاروبار میں دن رات خوش رہیں — عشاق ہی پہ ہو ستمِ آسماں غلط

ہاں سینہ سوزیٔ دلِ آتش نفس دروغ — ہاں دجلہ ریزیٔ مژۂ خوں فشاں غلط

معشوق عاشقوں کو کرے قتل افترا — اور مرتے شائقِ موت سے ہوں شادماں غلط

ہو مثل مرغ اہل سخن کا بھی آشیاں   اور برق کی نظر ہو سوئے آشیاں غلط
ہے شاعروں کا شیوہ شکایت زمانے کی   ملتا نہیں جہاں میں کوئی قدرداں غلط

یا تو اس وجہ سے کہ ناظم کی غزل مرزا غالب کے پرکار قلم کی اصلاح شدہ ہے۔ یا اس وجہ سے کہ وحشت نے سرسری طور پر اپنی غزل لکھ دی ہے ناظم کی غزل کے مقابلہ میں وحشت کی یہ غزل پر لطف نہیں معلوم ہوتی۔ ناظم نے جن باتوں کو معشوق کی زبان سے غلط کہا ہے۔ وہ واقعی غلط ہیں لیکن حضرت وحشت نے اُن باتوں سے بھی انکار کر دیا ہے جو واقعیت کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ سوز دروں اور غم عشق نہاں غلط ہو۔ ہاں یہ صحیح ہے۔ کہ نالۂ آتش فشاں نہیں ہو سکتا۔

ذیل میں جناب وحشت کے کلام بلاغت نظام سے منتخب اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

آئینۂ خیال تھا عکس پذیر راز کا   طور شہید ہو گیا جلوۂ دل نواز کا
دیر ملا تمھارا راہ میں کیجیے کہ ہم نکل گئے   جذبۂ شوق میں دماغ کس کو ہوا امتیاز کا
مصیبت کیسی ہائے شب ہجراں کی کیا کہئے   ہمارے حال پہ رونے کو بس ایک دیدۂ تر تھا
مبارک ہو مجھے موقع فریب تازہ کھانے کا   کیا ہے پھر مرے وعدہ شکن نے وعدہ آنے کا
چلتا رہا ہمیشہ میں ایک طرز خاص پہ   یعنی فریب خوردۂ دیر و حرم نہ تھا
تیرے ہی ذوق جلوہ سے وا ہو گئی ہے چشم   یاں ورنہ امتیاز وجود و عدم نہ تھا
کیا کیا مجھے تغافل ساقی کا تھا گلہ   دیکھا تو میں ہی درخور لطف و کرم نہ تھا
زمیں روئی ہمارے حال پر اور آسماں رویا   ہماری بے کسی کو دیکھ کر سارا جہاں رویا
ہر اک عشوہ بدن ماتم کناں ہے دل کے جانے سے   ہوا یوسف جو گم تو کارواں کا کارواں رویا
ستم ہے شوکت اسلام کا برباد ہو جانا   سنی جس نے یہ اندوہ و الم کی داستاں رویا
عشق کی خانہ خرابی کچھ نہ پوچھ   حسن کا مجموعہ بھی برہم رہا
گھر کے آتے ہی سے ہے ابر کا باراں ہونا   جمع ہونا ہی ہے خاطر کا پریشاں ہونا
دل رفتہ رفتہ خوگر آزار ہو گیا   غم تھا بہت مجھے، وہی غم خوار ہو گیا
زبان بے زبانی کہہ رہی ہے داستاں میری   شکایت سنج ہوں میں کس کے جور بے نہایت کا
جو عیش بے خلل منظور ہے وحشت محبت میں   نہ کرنا یار کے آگے کبھی اظہار الفت کا
اپنا تو دل ہے خون زمانے کے رنگ سے   جس کا شعار عیب میں کل تھا ہنر ہے آج

کنار و بوس میں کچھ ان سے میں ہوا گستاخ   کہ آشنا ہی سے ہوتا ہے آشنا گستاخ

حسب ذیل شعر عشق کے درجے سے گرا ہوا ہے۔ اگرچہ خودداری کا شائبہ موجود ہے :-

پامال آتے جاتے کریں گے ہمیں رقیب   یارب نہ اُس گلی میں ہمارا مزار ہو

حسب ذیل شعر میں ہم کو دلِ ناکامیاب کی ترکیب پر بھی اعتراض ہے۔ کیونکہ ناکامیاب غلط ہے ناکام ہونا چاہئے۔

اے نوبہار تازہ کسی دن کو یاد کر   افسردگی کو اس دلِ ناکامیاب کی

نواب یوسف علی خاں ناظم والئے مصطفیٰ آباد عرف رام پور کی ایک مشہور قطعہ بند غزل زبان زدِ خاص و عام ہے۔ جس کا مطلع ہے

میں نے کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط   کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

اس کے چند شعر حسب ذیل درج کئے جاتے ہیں۔

تاثیر آہ و زاری شب ہائے تار جھوٹ   آوازۂ قبول دعائے سحر غلط

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے   عشقِ مجاز و چشم حقیقت نگر غلط

بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہیں   اظہارِ پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

وہ صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں   احمق نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط

کہنا ادا کو تیغ خوشامد کی بات ہے   سینہ کو اپنے اس کی سمجھنا سپر غلط

مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی   جانِ عزیز پیش کش نامہ بر غلط

پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام   کہتے ہو جان دی ہے سرِ رہگذر غلط

ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا   مرنے کی اپنے رونہ آرائی خبر غلط

آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانئے   ہے نظم و نثرِ اہل سخن سر بسر غلط

اسی غزل کو دیکھ کر غالباً جناب وحشت نے بھی دوسری زمین میں طبع آزمائی فرمائی ہے چنانچہ ان کا ارشاد ہے :-

کہتے ہیں وہ کہ نالہ ہو آتش فشاں غلط   سوزِ درون غلط، غمِ عشقِ نہاں غلط

سب اپنے کاروبار میں دن رات خوش رہیں   عشاق ہی پہ ہو ستمِ آسماں غلط

ہاں سینہ سوزئ دلِ آتش نفس دروغ   ہاں دجلہ ریزئ مژۂ خوں فشاں غلط

معشوق عاشقوں کو کرے قتل افترا   اور مرنے والے موت سے ہوں شادماں غلط

ہو مثلِ مرغِ اہلِ سخن کا بھی آشیاں
اور برق کی نظر ہو سوئے آشیاں غلط

ہے شاعروں کا شیوہ شکایت زمانے کی
ملتا نہیں جہاں میں کوئی قدرداں غلط

یا تو اس وجہ سے کہ ناظم کی غزل مرزا غالب کے پرکارِ قلم کی اصلاح شدہ ہے۔ یا اس وجہ سے کہ وحشت نے سرسری طور پر اپنی غزل لکھ دی ہے۔ ناظم کی غزل کے مقابلہ میں وحشت کی یہ غزل پر لطف نہیں معلوم ہوتی۔ ناظم نے جن باتوں کو معشوق کی زبان سے غلط کہا ہے۔ وہ واقعی غلط ہیں لیکن حضرت وحشت نے اُن باتوں سے بھی انکار کر دیا ہے جو واقعیت کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ سوزِ دروں اور غمِ عشق نہاں غلط ہو۔ ہاں یہ صحیح ہے۔ کہ نالۂ آتش فشاں نہیں ہو سکتا۔

ذیل میں جنابِ وحشت کے کلامِ بلاغت نظام سے منتخب اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

آئینۂ خیال تھا عکس پذیر راز کا
طور شہید ہو گیا جلوۂ دل نواز کا

دیر ملا تھا راہ میں کعبے کو ہم نکل گئے
جذبۂ شوق میں دماغ کس کو ہوا امتیاز کا

مصیبت کیسی ہائے شبِ ہجراں کی کیا کہئے
ہمارے حال پر رونے کو بس ایک دیدۂ تر تھا

مبارک ہو مجھے موقع فریبِ تازہ کھانے کا
کیا ہے پھر سے وعدہ شکن نے وعدہ آنے کا

چلتا رہا ہمیشہ میں ایک طرزِ خاص پر
یعنی فریب خوردۂ دیر و حرم نہ تھا

تیرے ہی ذوقِ جلوہ سے وا ہو گئی ہے چشم
ہاں ورنہ امتیازِ وجود و عدم نہ تھا

کیا کیا مجھے تغافلِ ساقی کا تھا گلہ
دیکھا تو میں ہی درخورِ لطف و کرم نہ تھا

زمیں روئی ہمارے حال پر اور آسماں رویا
ہماری بیکسی کو دیکھ کر سارا جہاں رویا

ہر اک عضوِ بدن ماتم کناں ہے دل کے جانے سے
ہوا یوسف جو گم تو کارواں کا کارواں رویا

ستم ہے شوکتِ اسلام کا برباد ہو جانا
سنی جس نے یہ اندوہ و الم کی داستاں رویا

عشق کی خانہ خرابی کچھ نہ پوچھ
حسن کا مجموعہ بھی برہم رہا

گھر کے آنے ہی سے ہے، ابر کا باراں ہونا
جمع ہونا ہی ہے خاطر کا پریشاں ہونا

دل رفتہ رفتہ خوگرِ آزار ہو گیا
غم تھا بہت مجھے، وہی غمخوار ہو گیا

زبانِ بے زبانی کہہ رہی ہے داستاں میری
شکایت سنج ہوں میں کس کے جذبِ نہایت کا

جو بندش بے خلل منظور ہے وحشت محبت میں
نہ کرنا یار کے آگے کبھی اظہار الفت کا

اپنا تو دل ہے خون زمانے کے رنگ سے
جس کا شمار عیب میں کل تھا ہنر ہے آج

ازل میں دردِ محبت کی جب پڑی بنیاد
ہمارے قلب نے آواز دی "مبارکباد"

اگر کسی نے محبت کی داستاں چھیڑی
مجھے وہیں دلِ گم گشتہ اپنا آیا یاد

حالِ چمن خزاں میں بھی ایسا کبھی ہوا نہ تھا
اپنا جو حال ہو گیا رنگِ بہار دیکھ کر

تغافل کیش میں نے ہی بنایا
اُسے حالِ دلِ شیدا سُنا کر

چمن سے کون نکلا پائمالِ باغباں ہو کر
کہ بوئے گل چلی ہے کارواں در کارواں ہو کر

وہ آئے صبح گلشن میں نسیمِ جانفزا ہو کر
اُٹھی بے ساختہ ہر شاخِ گل دستِ دعا ہو کر

نہ وہ پوچھتے ہیں نہ کہتا ہوں میں
رہی جاتی ہے دل میں دل کی ہوس

نہ خیال ذوقِ وصال کا نہ دماغ بزم نشاط کا
وہی مجھ کو عیشِ دوام ہے جو کسے تو ایک نظر سے خوش

ایک صیدِ ناتواں کی اسیری کے واسطے
بیٹھے ہوئے ہیں گھات میں صیاد ہر طرف

مانا کہ جامِ وصل ہے لبریز صد نشاط
رکتا ہے کوئی گریۂ بے اختیارِ شوق

جنونِ عشق تو مدت ہوئی جاتا رہا پھر بھی
زباں پر نام آتا ہے کسی کا بار بار اب تک

کیا جانے کہاں سے دلِ مضطر میں لگی آگ
کس گھر سے اُٹھی آگ کہ اس گھر میں لگی آگ

اگر فرصت کسی دن دے مجھے آہ و فغانِ دل
سناؤں گا تجھے اے ہمنشیں کچھ داستانِ دل

کچھ کام لے سکے نہ کبھی جستجو سے ہم
شرمندہ ہی رہے ہیں تری آرزو سے ہم

یارب ہمیں نصیب نہ ہو لذتِ خلش
رسوا کریں جو زخمِ جگر کو رفو سے ہم

قسمت میں نا امیدی و حسرت ہے کیا کروں
اُس بیوفا سے مجھ کو محبت ہے کیا کروں

درک و ادراک کی ہے ہم کو حقیقت معلوم
کچھ وہی لوگ ہیں ہشیار جو ہشیار نہیں

ہے جستجوئے مرگ جو اب ہجرِ یار میں
کیا آگ لگ گئی دلِ اُمیدوار میں؟

خیالِ وصل سے تسکیں ہو گیا شبِ ہائے فرقت میں
کہ مجھ کمبخت پر روشن ہے جو لکھا ہے قسمت میں

وہی خورشید ہے جس سے یہ سب ذرے درخشاں ہیں
وہی وحدت کا جلوہ ہے تماشا گاہِ کثرت میں

میں اُسکے لطف کا محتاج اور وہ مجھ سے مستغنی
محبت کا بُرا ہو ڈال رکھا ہے کس آفت میں

کیا کیجئے کرشمۂ صیاد کا بیاں
آزاد بھی نہیں ہیں گرفتار بھی نہیں

ارادہ سیر کا تھا کل گئے تھے کوئے قاتل میں
ہزاروں حسرتیں مرنے کی لے کر آئے ہیں دل میں

عالم پہ ہے چھایا ہوا ایک یاس کا عالم
یعنی کہ تمنا کے گرفتار بہت ہیں

اور عشرت کی تمنا کیا کریں
سامنے ہو تو، تجھے دیکھا کریں

اے کمالِ شوق تیری نا تمامی کیا کہوں — واں حیا آتی ہے اس کو اور شرماتا ہوں میں

ملا کنجِ قفس مجھ کو نہ صحنِ گلستاں مجھ کو — گرایا آسماں بے مروت نے کہاں مجھ کو

اسیری ہے نصیبوں میں اسی دن سے میں سمجھا تھا — کہ مجھ بیخودی کیلئے لگا ذوقِ فغاں مجھ کو

مبارک اے گلچیں ہو کوئی تیرے گلستاں کو — کہ ہم تو یاں سے چنگی لے چلے گلہائے حرماں کو

مرا تو اس کے نالے سے ایمان تازہ ہوتا ہے — خدا رکھے سلامت اس عدوئے دین و ایماں کو

چھوڑ جائے خون میں غلطاں یہ دلِ قاتل میں ہے — وائے وہ اک آرزو جو خاطرِ بسمل میں ہے

اتنا بھی نہیں یاد کہ کس کی ہے مجھے یاد — اے بیخودیِ شوق یہ کیا رنگ ترا ہے

دیر میں اپنا ٹھکانا ہے نہ کعبہ میں پناہ — کفر رنجیدہ ہے، آزردہ ہے ایماں مجھ سے

انداز ہیں، شوخی ہیں، شرارت ہیں، حیا ہیں — واں ایک نہ اک بات نکلتی ہی رہے گی

عذرِ تقصیر ہوا باعثِ تقدیر آخر — جیسے شرمندہ ہم آئے تھے پشیماں گئے

خلقت خدائے صنعتِ خلقت طراز ہے — آئینہ محوِ جلوۂ آئینہ ساز ہے

چشمِ تر آنسو بہانا چھوڑ دے — یار کو رو کر رلانا چھوڑ دے

اُسے نقطہ ناز نکلیں یہ کہ شوخی لے گئی بازی — تبسم نے عجب انداز سے چینِ جبیں پکڑی

بہ رنگِ تیر آنا اور دل کے پار ہو جانا — یہ خو مژگاں کی تو نے اپنے نگاہِ شرمگیں پکڑی

وحشتِ مبتلا خدا کے لئے — جان دیتا ہے کیوں وفا کے لئے

آشنا سب ہوئے ہیں بیگانے — ایک بیگانہ آشنا کے لئے

غالب آئی فراموشی اس کی — وعدہ تڑپا کیا وفا کے لئے

نوید ہے شوقِ قتل و مژدہ اے ذوقِ گرفتاری — دمِ پیدا توئے خوں نکلتی ہے مرے پیچھے

حاجت شراب کی ہے نہ چنگ و رباب کی — بدمستیاں غضب ہیں شبِ ماہتاب کی

گرمی تھی صبحِ حشر غضبِ آفتاب کی — گویا تھی ایک جھلک تری برقِ عتاب کی

مجبور ہم ہیں اور فرشتوں کو دیکھئے — فہرست لکھ رہے ہیں عذاب و ثواب کی

دلِ نازک ترا آلودۂ غم ہو گیا آخر — نہ دی ہوتی مجھے تکلیف تو نے نالۂ غم کی

دام ہے طولِ امل، اس سے رہا ہو جائیے — رفتہ رفتہ یک دلِ بے مدعا ہو جائیے

کوئی نظر مرے دل پہ بھی بار ہو جائے — تری بلا سے اگر بے قرار ہو جائے

ترا وصال کہاں، دل کو ہے یہی بہتر — کہ خوگرِ الم انتظار ہو جائے

کہانی اپنی بھی وحشت عجب کہانی ہے — جسے سنائیے وہ اشکبار ہو جائے

شوق پھر کوچۂ جاناں کا ستاتا ہے مجھے — میں کہاں جاتا ہوں، کوئی لئے جاتا ہے مجھے

مژدہ اے حسرت اندوہ و غم و درد و الم — دل آفت طلب آغوش کشا ہوتا ہے

میں غرور ہوں مجسم کہ ہے ناز خاکساری — میں قصور ہوں سراپا کہ ہے زعم بے قصوری

گرمیٔ بازارئ فریب نہ پوچھ — بس یہی ایک کمال باقی ہے

ہزاروں حسرتوں کا نقش ہے آئینۂ دل پر
مرا سینہ ہے یا اک حیرت آباد تمنا ہے

چکبست

آپ کا نام پنڈت برج نرائن چکبست ہے۔ آپ نے دیگر شعرا کی طرح کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے اور چند سال بعد لکھنؤ چلے آئے۔ یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی سچ یہ ہے کہ اس پیشہ میں کامیابی حاصل کی۔ اور آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکلا میں ہو گیا۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی کے لئے رائے بریلی تشریف لے گئے تھے لکھنؤ واپس جانے کے لئے سہ پہر کو اسٹیشن پر آئے۔ ریل میں بیٹھے تھے۔ کہ دماغ پہ فالج گرا۔ اور زبان بند ہو گئی۔ ہمراہیوں نے یہ حالت دیکھ کر ریل سے اتارا۔ اور ویٹنگ روم میں لٹا دیا۔ ڈاکٹر آئے۔ علاج ہوا۔ مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ سات بجے شام کو اسٹیشن ہی پہ انتقال کیا۔ آپ کے بڑے بھائی رائے صاحب پنڈت مہاراج نرائن چکبست ایگزیکٹو آفیسر لکھنؤ میونسپلٹی گیارہ بجے رات کو آپ کی لاش موٹر میں رکھ کر لکھنؤ لے گئے۔ محشر لکھنوی نے آپ ہی کے مصرع سے تاریخ نکالی

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراہ عزا   موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

آپ کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شاید پہلی غزل نو برس کی عمر میں کہی تھی۔ اس زمانہ سے آپ برابر شعر کہتے رہے۔ آتش۔ غالب اور انیس کے کلام کے شیدا تھے۔ عمر نے وفا کی ورنہ اس فن میں آپ کے جوہر اور نمایاں ہوتے اور کیا عجب ہے کہ آگے چل کر بالغ نظر شعرا میں شمار کئے جاتے۔

کلام پر تبصرہ

جس زمانہ میں آپ نے شعر کہنا شروع کیا۔ اس وقت لکھنؤ کی فضا مانع تھی کہ آپ ایسی شاعری اختیار کرتے۔ جو آپ کے کلام سے ہویدا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ پنڈت بشن نرائن

مختصر یہ اثر کے فیض صحبت سے یہ رجحانِ طبیعت پیدا ہوا۔ اگرچہ خود آپ بھی لکھنؤ کی قدیم شاعری کے دلدادہ تھے لیکن انگریزی کی اعلیٰ تعلیم نے ان کے دماغ کو مغربی خیالات سے بھر دیا تھا۔ اور وہ نیک و بد میں تمیز کر سکتے تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا حالی کا مقدمہ اردو شعر و شاعری پر شائع ہو چکا تھا۔ اگرچہ لکھنؤ میں اس کا خیر مقدم بشکلِ احتجاج کیا گیا۔ اور اڈیٹر اودھ پنچ اور اس کے رفقائے کار نے بہت لے دے کی اور اپنے مضامین تنقیدی کا یہ عنوان قائم کیا کہ :-

اختر ہمارے حملے سے حالی کا حال ہے　　میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

لیکن سچ یہ ہے وہ حیرت انگیز اثر ہوتا ہے۔ کہ آخرکار ان ہی نقادانِ فن نے زبان سے نہ سہی دل سے مقدمۂ حالی کی تائید کی۔ اسی فضا کا یہ اثر تھا۔ کہ چکبست حالی کے کلام کو پسند کرتے تھے اور نسیم پر جو ضمناً اعتراضات اردو مثنوی کے متعلق لکھتے ہوئے اپنے مقدمہ میں مولینا حالی نے کئے تھے ان کے جوابات چکبست نے حتی المقدور دینے کی کوشش کی۔ مگر اپنی شاعری کو اسی سانچے میں ڈھال دیا جو مقدمۂ حالی میں پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں　　عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

آپ نے صنائع و بدائع مثنوی گلزارِ نسیم سے اخذ کئے۔ سلاست و روانی تشبیہات و استعارات میر انیس کے مرثیوں کو بار بار پڑھ کر حاصل کئے۔ آتش کے تغزل نے آپ کی طبیعت میں گرمی پیدا کی۔ غالب کے کلام نے رفعتِ تخیل کا سبق دیا۔ الغرض ان اسباب نے مل کر چکبست کے کلام کو مقبول و پسندِ عام بنا دیا۔ اور آپ نے آزاد کی مندرجہ ذیل نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آپ صرف بزرگوں کے ترکہ سے متمتع ہونے اور کسی قدر اظہارِ اصلیت کو پیش نظر رکھنے پر کامیاب ہو سکے۔ بزرگان بے موقع احاطوں میں بھی محبوس نہ رہے۔ جن سے ہمارے بزرگوں کو کبھی آزادی نہ ملی۔ آزاد فرماتے ہیں :- "عبارت کا زور، مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کے سامان تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئی ہے . . . . ہمیں چاہئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں، سادگی اور اظہارِ اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں۔ لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں . . . ذرا آنکھیں کھول کے دیکھیں کہ فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے ہاتھ طرح ہاتھوں میں لئے حاضر ہیں۔ اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن

اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو۔ جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔"

آپ نے سیاسی، اخلاقی، مذہبی، اصلاحی مضامین اور قدرتی مناظر سب پر نظمیں لکھی ہیں۔ اور دادِ سخنوری دی ہے لیکن بعض نقائص آپ کے کلام میں ایسے پائے جاتے ہیں جن سے شبہ ہوتا ہے کہ آپ حقیقی شاعری سے کافی طور پر آگاہ نہ تھے۔ تقلیداً لکھتے تھے۔ طبیعت میں اُپج نہ تھی۔ حالی اور آزاد کی نظمیں پڑھ کر یہ تو شوق پیدا ہو گیا کہ ان مضامین پر نظمیں لکھنے لگے۔ جو وقتی ضرورت کے لحاظ سے اہم تھے۔ اور ان میں لطائف و صنائع کے پھول بھی بنانے لگے۔ مگر حقائق و واقعات یا سیدھی اور سچی باتوں کو اس طرح بیان کرنے سے قاصر رہے کہ سامعین اثر پذیر ہوتے۔ واہ واہ سب کہتے ہیں مگر آہ کسی کے دل سے نہیں نکلتی۔ وہ اگر مرثیہ لکھتے ہیں تو مرنے والے کے اوصاف ایک ایک کر کے نہیں شمار کراتے۔ بلکہ عام طور پر دلکش الفاظ جمع کرتے چلے جاتے ہیں جن سے ہرگز یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کس کا نوحہ یا مرثیہ ہے۔ اور اگر کوئی سیاسی نظم لکھتے ہیں تو کچھ واقعات ضرور بیان کر جاتے ہیں لیکن اس طرح نہیں لکھتے کہ پڑھنے والا مست و بیخود ہو جائے۔ اور ان کا ہم زبان بن جائے۔ نذرانۂ روح یا مرشد کی محبت کے عنوان سے آپ نے پنڈت بشن نرائن در کے انتقال کے بعد ایک نظم لکھی جو آپ کے مجموعۂ کلام کا سرنامہ ہے۔ پہلا ہی بند یہ ہے

دلِ پُر درد کے ٹکڑے جو کئے ہیں یکجا — تیرے قدموں کے لئے تحفہ یہی میرا تھا
مگر افسوس کہ یہ قرض ادا ہو نہ سکا — اب سرِ لوح پہ ہے نقش یہ پیغام وفا

میرے سودا نے طبیعت کا جدا قصہ ہے
مرنے والے یہ تری روح کا نذرانہ ہے

شاید ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ تیرے فراق میں جو دل پر درد شکستہ ہو گیا تھا۔ اس کے ٹکڑے اس لئے جمع کئے ہیں کہ تیرے قدموں پر نثار کر دوں کیونکہ میں یہی تحفہ پیش کر سکتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اس قرض کو ادا نہیں کر سکا۔ اور اب میری جبین پر یہ پیغام وفا نقش ہے یعنی میری طبیعت میں سودا سما گیا۔ اور جس کا پیچھا ہو رہا ہے۔ وہ تیری روح کا نذرانہ ہے۔ یہ مطلب ہم نے ان اشعار سے نہایت غور کے بعد نکالا ہے۔ ورنہ سیدھی طرح سے یہ مطلب نہیں نکلتا کیونکہ دوسرے مصرع میں پہلے مصرع کے دلِ پُر درد کے ٹکڑوں کو تحفہ کہا گیا ہے۔ اور تیسرے مصرع میں یہ تحفہ دین یعنی قرض بن گیا ہے جس سے بے ربطی کلام ظاہر ہوتی ہے۔ چوتھے مصرع میں سرِ لوح سے لوحِ مزار مراد ہے۔ یا اپنی جبین۔ اور پیغام وفا معلوم نہیں مرنے والے کا پیغام وفا ہے یا شاعر کا پیغام وفا

اپنی قوم کے لئے ہے یا مرنے والے کے لئے ہے جو اس کی جبین پہ نقش ہے۔ اور وہ پیغام وفا کیا ہے؟ سودائے طبیعت ہے۔ اس کو اظہار وفا کہیں یا شاعر کی زبان میں پیغام وفا۔ الغرض عجیب الفاظ میں یہ نذرانۂ روح پیش کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعر کے دل میں کچھ مضامین جوش زن ہیں لیکن وہ ان کو خوبی کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا۔ اسی نظم میں ایک ٹیپ کا شعر ہے جس کو "صبح وطن" کا دیباچہ نگار بھی پسند کرتا ہے۔

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا
دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

خیر ہم کو شاعر کے عقائد سے تو بحث نہیں کہ وہ کسی کامل کی پرستش کو دین قرار دیتا ہے۔ اپنے نزدیک تو ماسوا اللہ کی پرستش کفر ہے لیکن تمنائے وفا میں مرنے سے تو ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شاعر جس کامل کی پرستش کو اپنا دین قرار دیتا ہے۔ وہ کامل معشوق کی طرح بے وفا ہے۔ اور یہ بات اس کے رتبہ سے فروتر ہے کہ وہ بیوفا ہے۔ اور اگر شاعر نے تمنائے وفا سے مراد خود اپنی وفاداری لی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ وفاداری کی تمنا میں مرنا کیا آبرو کا کام ہے میں تو کہتا ہوں۔ کہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

آپ نے بعض بعض جگہ غلط الفاظ بھی استعمال کئے ہیں مثلاً "صبح وطن" کا صفحہ ۱۳ سے

رہا ہے رات کی صحبت میں کیا مزا باقی
نگاہ شوق کو ہے دور نو کی مشتاقی

لفظ مشتاقی اردو میں استعمال نہیں ہوتا۔ اس لئے غلط ہے۔ ع

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے

گمان کو شک کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جو اس مصرع پر ہمارے روزمرہ کے خلاف ہے ہم یہاں شبہ یا شک ضرور استعمال کریں گے لیکن گمان ہرگز استعمال نہ کریں گے پنڈت برج نرائن در کے نوحہ میں ایک مصرع ہے۔ ع

"آدمی کے لئے معراج ہے انسان ہونا"

انسان ہونا آدمی کی معراج ہے ہونا چاہئے۔ جیسا کہ جگر مراد آبادی کا مصرع ہے۔ ع

"یہی انسان کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے"

اسی نظم میں عیاں کا قافیہ چھپاں باندھا ہے حالانکہ لفظ چھپاؤں ہے۔ "وطن کا راگ" اس نظم میں ایک مصرع ہے۔

"خوشی سے قید کے گوشہ کو ہم بسائیں گے"

قید کا گوشہ بے معنی ہے۔ قید خانہ کا گوشہ ہونا چاہیئے۔ دردِ دل کے پہلے بند کی ٹیپ ہے

کیا کہوں کون ہوا سر میں بھری رہتی ہے — بے پیئے آٹھ پہر بے خبری رہتی ہے

اس موقع پہ کون ہوا غیر فصیح ہے۔ کیا ہوا ہونا چاہیئے تھا۔ جلوۂ صبح کا پہلا مصرع ہے۔

"جب رنگِ شب آئینۂ ہستی سے ہوا دور"

ہستی کے بجائے عالم ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ہستی کے معنی زندگی کے ہیں۔ اور آپ کی مراد یہاں دنیا سے ہے۔ "نظم نالۂ یاس" کے آخر میں حسب ذیل شعر ہے

یاس کہتی ہے کہ چھٹنے کا نہیں رنگِ چمن — آرزو کہتی ہے اگلا سلسلہ ٹوٹے نہیں

یہاں سلسلہ ٹوٹے نہیں کے بجائے سلسلہ نہ ٹوٹے ہونا چاہیئے۔ لیکن شاعر ردیف سے مجبور ہو گیا۔ اور اسے روزمرہ کے خلاف چلنا پڑا۔ یہ نظم ۱۹۱۸ء میں لکھی گئی تھی۔ لہذا رنگ نہیں چھٹنے کا کی بجائے رنگ نہیں چھٹے گا لکھنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اس وقت رنگ نہیں چھٹنے کا متروک ہو چکا تھا۔ شاید نظم لکھنے میں ایسی دقتیں حائل ہوتی رہتی ہیں۔ اور اس کو ضرورتِ شعری سمجھنا چاہیئے "کرشن کنہیا والی نظم میں

"دل میں پیوست ہوئی جاتی ہے مردوں کی نوا"

نوا کا دل میں پیوست ہونا کوئی محاورہ ہے۔ اور نہ روزمرہ ہے۔ لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ مردوں کی نوا دل میں پیوست ہوئی جاتی ہے۔ نظم متعلق ہندو یونیورسٹی صفحہ ۸۲ پر آپ نے تحریر کیا ہے

"بہے علوم کی گنگا، پئیں غریب و امیر"

اس مصرع سے یہ مفہوم تشنہ رہ جاتا ہے کہ غریب و امیر کیا پئیں۔ اسی نظم کے ایک بند میں آپ فرماتے ہیں

تمہاری قوم سے دولت ہوئی ہے یوں معدوم — کہ اب ترستے ہیں بہٹنے کو سینکڑوں معصوم

آگے چل کر آپ کا ارشاد ہے

یہ کارِ خیر ہیں کوشش یہ قوم کا ادبار — لگا دو آج تو چاندی کے ہر طرف انبار

اس کے بعد آپ یوں نغمہ سرا ہیں

جو اس طرح ہوا دنیا میں آبرو کا زوال — تو کام آئے گا عقبیٰ میں کیا یہ دولت و مال

جس قوم سے دولت معدوم ہو گئی۔ اس سے یہ کہنا کہ

"لگا دو آج تو چاندی کے ہر طرف انبار"

اس کو نظر انداز کر دیا۔ میر انیس کا خاص جوہر جس کی وجہ سے وہ درحقیقت شاعر کے معزز خطاب سے مخاطب کئے جاتے ہیں۔ یہ ہے کہ انہوں نے ہر ایک شہیدِ کربلا کا پُر انقشہ کھینچا ہے۔ اور اس کی خصوصیات کو قائم رکھا ہے۔ عام صفات بیان کر کے ایک کو دوسرے میں مدغم نہیں کیا۔ ممکن نہیں کہ جو مرثیہ عون محمد کا ہے۔ وہ حضرت قاسم کے مرثیہ پر منطبق ہو سکے اور جو مرثیہ حضرت عباس کے نام ہے وہ حضرت امام حسین کیلئے موزوں ہو سکے لکھنؤ کی فضا صنائع بدائع کی چٹیک لگا دیتی ہے۔ اور دیگر حقائق شاعری کی طرف سے آنکھ بند کر دیتی ہے۔ چنانچہ چکبست بھی اپنے ہم وطنوں کی طرح محض صنائع و بدائع کو شاعری جانتے تھے۔ اور حقیقت شعر سے بہرۂ وافی نہ رکھتے تھے۔ جیسا کہ ان کے مضامین سے بھی ظاہر ہے۔ لہٰذا اس کا پرتو آپ کے کلام پر پڑنا ضروری تھا اور پڑا۔ غزلوں میں آپ نے سیاسی و اخلاقی و اصلاحی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ غزل کے تمام اصطلاحی الفاظ پائے جاتے ہیں لیکن معانی کے لحاظ سے وہ قدیم شاعری سے بالکل علیحدہ ہیں۔ بعض اشعار نہایت خوب ہیں۔ لیکن بعض اشعار میں غلطیاں بھی موجود ہیں۔ مثلاً امتحاں لینے کے بجائے امتحان کرنا لکھتے ہیں ؎

مرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بیوفائی سے وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

علاوہ ازیں پہلے مصرع میں سے کی تکرار بُری معلوم ہوتی ہے۔ یا مر گئے کی بجائے مر چکے باندھا ہے ؎

مر چکے ہم تو زمانہ نے بہت یاد کیا اس کو ناقدریِ عالم کا صلہ کہتے ہیں

ذیل میں آپ کا منتخب کلام ہدیۂ ناظرین ہے۔

(خاکِ ہند)

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

(قوم کا پیامِ وفا)

حکمِ حاکم کا ہے فریاد زبانی رُک جائے دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رُک جائے پر یہ ممکن نہیں اب جوشِ جوانی رک جائے
ہوں خبردار جنہوں نے یہ اذیت دی ہے کچھ تماشا یہ نہیں قوم نے کروٹ لی ہے

اس بند کی ٹیپ میں دونوں مصرعوں میں ہے کو دہرایا ہے۔ اگر آخری مصرع یوں ہوتا:-

"کچھ تماشا نہیں اب قوم نے کروٹ لی ہے"

تو کم از کم ایک ہی شعر میں یہ دوبارہ استعمال نہ ہوتا۔

(فریادِ قوم)

نصیب چین نہیں بھوک پیاس کے مارے ۔۔۔ ہیں کس عذاب میں ہندوستان کے پیارے

تمہیں تو عیش کے سامان جمع ہیں سارے ۔۔۔ وہاں بدن سے رواں ہیں لہو کے فوارے

جو چپ رہیں تو ہوا قوم کی بگڑتی ہے ۔۔۔ جو سر اٹھائیں تو کوڑوں کی مار پڑتی ہے

وطن سے دور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی ۔۔۔ اسیرِ یاس بھی ہیں اور اسیرِ زنداں بھی

تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی ۔۔۔ ہوئے ہیں نذرِ مصیبت کے دین و ایماں بھی

پڑھیں نماز تو اجڑے گھروں کے صحرا ہیں ۔۔۔ اگر نہائیں تو اپنے لہو کی گنگا ہیں

دکھا دو جوہرِ اسلام اے مسلمانو! ۔۔۔ وقارِ قوم گیا قوم کے نگہبانو

ستونِ ملک کے ہو قدرِ قومیت جانو ۔۔۔ جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو

نبی کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم ۔۔۔ عرب کی شانِ حمیت کے یادگار ہو تم

کرو خیال کچھ اسلاف کی حمیت کا ۔۔۔ دیا تھا دشمنِ قاتل کو جام شربت کا

معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزت کا ۔۔۔ یہ فرضِ عین ہے سودا نہیں مروت کا

اگر نہ اب بھی ہوا اسلام کا جگر پانی ۔۔۔ ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی

(گائے)

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار ۔۔۔ بل پڑے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار

مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار ۔۔۔ وہ اترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزہ کا نکھار

ایک ایک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا ۔۔۔ کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

(سیرِ دہرہ دون)

کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے ۔۔۔ یہ سبزہ زار سجایا ہے دستِ قدرت نے

سپردِ ابر کے ہے انتظام پانی کا ۔۔۔ ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی ۔۔۔ جدھر نگاہ اٹھے اس طرف ہے ہریالی

فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے ۔۔۔ بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر ۔۔۔ شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر

(آصف الدولہ کا امام باڑہ)

در و دیوار نظر آتے ہیں کیا صاف و سبک — سحر کرتی ہے نگاہوں پہ تجلیٔ مہتاب
جگمگاتا ہے شعاعوں میں یہ ایوان بلند — جس کی صنعت کا ہے دنیا میں نرالا انداز
پارۂ چوب کے احسان کی ضرورت نہ رہی — خاک اور خشت نے مل کر یہ دکھایا اعجاز
اس کی تعمیر کو آئے نہیں معمار فرنگ — ہے یہ تہذیب اودھ کے لئے سرمایۂ ناز

(گنگا پرشاد ورما)

یوں تو دنیا میں ہمیشہ سے ہے مرنے کا چلن — اپنے بچوں کو نگلتی ہے زمیں کی ناگن
داغ دیتا ہے مگر جب کوئی دل سوز وطن — اُس کے صدمہ سے لرزتا ہے یہ ایوان کہن
چاندنی رات میں جس وقت ہوا آتی ہے — قوم کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

(غزلیات)

رہے گی آب و ہوا میں خیال کی بجلی — یہ مشت خاک ہے فانی رہے رہے نہ رہے
خوشنوائی کا سبق میں نے قفس میں سیکھا — کیا کہوں اور سلامت مرا صیاد رہے
باغباں دل سے وطن کو یہ دعا دیتا ہے — میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے
جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں — مگر یقین ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتے
وہی ہوا وہی کوئل وہی پپیہا ہے — وہی چمن ہے پہ وہ باغباں چمن میں نہیں
پڑی ہیں تیر بن بن کر نگاہیں پارساؤں کی — غزالانِ حرم بھولے ہوئے ہیں شوخیاں اپنی
شفق ہے آسماں پہ لالہ و گل باغ و صحرا میں — دکھاتا ہے شہیدوں کا لہو رنگینیاں اپنی
صدا دیتا ہے یہ میرا گریباں چاک ہونے پر — ہزار دل پیرہن پیدا کریں گی دھجیاں اپنی
دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے — جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی
اذاں سے نعرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا — ابھی کچھ روز تک کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا
زباں سے جوش قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا — اُبلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا
ورق تدبیر پر سر پھوڑنا شیوہ رہا اپنا — وسیلے ہاتھ ہی آئے نہ قسمت آزمائی کے
اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا — نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا
یہ مانا بے حجابانہ نگاہیں قہر کرتی ہیں — مگر حسنِ حیا پرور کا عالم دوسرا ہوتا
نفاق گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر — یہ بُت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

ہوائے تازہ دِل کو خود بخود بے چین کرتی ہے
قفس میں کہہ گیا کوئی بہار آئی ہے گلشن میں

پرانی کاوشیں دیر و حرم کی مٹتی جاتی ہیں
نئی تہذیب کے جھگڑے ہیں اب شیخ و برہمن میں

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

بہار آئی، ترقی پہ ہے سودا دم بدم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا

درِ زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

راحت سے بھی عزیز ہے راحت کی آرزو
دل ڈھونڈتا ہے سلسلۂ انتظار کو

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو

فرشتہ حسن کا بیدار کرنے ان کو آیا ہے
جوانی کی اُمنگیں سو رہی تھیں بے خبر ہو کر

زندگی تلخیِ ایام کا افسانہ ہے
زہر بھرنے کے لئے عمر کا پیمانہ ہے

غنچے عدم سے آئے ہیں پہنے ہوئے کفن
انجام ہے نظر میں دو روزہ بہار کا

دردِ اُلفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے

وارفتگی ہے، فقط نعرہ زنی باقی ہے
مست مجذوب ہیں لاکھوں کوئی منصور نہیں

خود پرستی مٹ گئی قدرِ محبت بڑھ گئی
ماتمِ احباب ہے تعلیمِ روحانی مجھے

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

یہ دِل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی
اس گلشنِ جہاں کی خزاں کیا بہار کیا

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بیکار ہے
طرزِ ہندو دیکھ کر رنگِ مسلماں دیکھ کر

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

زندگی نام تھا جس کا اُسے کھو بیٹھے ہم
اب امیدوں کی فقط جلوہ گری باقی ہے

کیا دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا بدل گئی
واللہ وہ زمیں نہیں وہ آسماں نہیں

عزیز

مرزا محمد ہادی نام اور عزیزؔ تخلص تھا۔ آباؤ اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے مگر اب کئی پشتوں سے لکھنؤ وطن ہے۔ سنہ ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۸۳۵ء میں انتقال فرمایا۔ اکثر مشاہیر علماء و فضلا کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ عربی و فارسی علوم رسمیہ کا اکتساب چودہ برس کی عمر تک جاری رہا۔ اور مولوی شیخ فدا حسین اور آغا حاذق مرحوم کی فیضِ تربیت سے بہرہ اندوز ہوئے لکھنؤ جیسے مقام پر آپ جیسے شخص کو شاعری کا شوق کیوں نہ ہوتا چنانچہ آپ نے شعر گوئی شروع کر دی، اور انیس برس کی عمر میں اچھے شعر کہنے لگے۔ فکر صائب، ذوقِ سلیم، طبیعت خداداد کے ساتھ علوم مشرقیہ سے بہرہ اندوزی شاعری کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئی شروع میں صفیؔ لکھنوی سے اصلاح لی۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ مدت تک جاری نہیں رہا۔ حکیم آشفتہؔ لکھنوی الناظر میں بحوالہ محشرؔ لکھنوی رقم طراز ہیں:-

"۔۔۔ عزیزؔ مرحوم دیر آشنا تھے۔ مگر جس سے ملتے تھے۔ اُس سے زندگی بھر حسنِ اخلاق سے پیش آتے تھے۔ اُن کے سب سے زیادہ پرانے ملنے والوں میں اول محشرؔ ہے اور بعد اس کے اشہرؔ لیکن خود حکیم صاحب کی رائے میں مہدی حسین صاحب ناصری مرحوم اشہر صاحب سے بھی پہلے کے ملنے والے تھے۔"

چودھری رحم علی ہاشمی مقدمۂ گلکدہ میں حضرت عزیزؔ کی پیدائش ۱۸۸۲ء تحریر فرماتے ہیں معلوم نہیں اُن کی صحیح تاریخ پیدائش ۱۸۸۰ء ہے یا ۱۸۸۲ء

کلام پر تبصرہ

جس زمانہ میں عزیزؔ نے شاعری شروع کی۔ اُس وقت لکھنؤ کی قدیم شاعری کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ جلالؔ و تسلیمؔ اپنی شیوا بیانی ختم کر چکے تھے۔ اور صفیؔ میدان میں اتر آئے تھے۔ وہ فرسودہ روش نظروں سے گر چکی تھی۔ حالیؔ اور آزادؔ کی نظموں نے نئے اور نوخیز شاعروں کو "ہشیار باش"

کا سبق پڑھا دیا تھا لیکن طبیعت سے فرضی اور خیالی معشوق کی ادائیں اس قدر جلد محو نہیں کی جا سکتی تھیں۔ ابتداء ہمیشہ غزل سے ہوتی تھی۔ حضرتِ عزیز بھی غزل ہی لکھنے پر آمادہ ہوئے اور بہت جلد اچھے شعر نکالنے لگے۔ رفتہ رفتہ ایک مجموعۂ کلام تیار ہو گیا۔ جو "گلکدہ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ تجدیدِ اصلاحِ غزل میں آپ نے میرؔ و غالبؔ کو اپنا رہبر بنایا۔ اور حضرتِ صفیؔ سے بھی بہت کچھ مدد ملی۔

چنانچہ ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:۔ "لکھنؤ کے جدید طرزِ تغزل میں حضرتِ عزیز کا کلام ہمیشہ شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ میں نے اس وقت سرسری طور پر مختلف مقامات سے گلکدے کے چند صفحات دیکھے کسی صفحہ کو عمدہ اور دل پسند اشعار سے خالی نہ پایا۔"

مولوی عبدالحلیم شررؔ رسالۂ دلگداز میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ لکھنؤ کے موجودہ نامور شعراء میں ہیں۔ جن کا کلام روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ اور وہ اپنی جدت طرازیوں اور اپنے کلام کی خوبیوں سے اس کے مستحق ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ حضرتِ عزیز کے کلام کے شیدا سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔"

مولانا شبلی مرحوم آپ کو رئیس الشعراء کہا کرتے تھے۔ اور حضرتِ اکبرؔ بھی آپ کی رنگِ طبیعت کے مداح و معترف تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ؎

سخن میں اور تو اہلِ تمیز ہی ہیں فقط	شہیدِ جلوۂ معنیٰ عزیز ہی ہیں فقط

آپ کا کلام دیکھنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے۔ کہ غزل کا رنگ لکھنؤ یا خارجی پہلو اگر بالکل معدوم نہیں ہو گیا۔ تو اُس میں بہت کمی آ گئی ہے۔ کنگھی، چوٹی، سرمہ، کاجل، رعایتِ لفظی کا ذکرِ خیر اگر کہیں ہوتا ہے۔ تو جدت کے ساتھ، یا ہیئت و جنازہ آتا ہے تو ایک بانکپن کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

اک جہاں روئیگا بال اُن کے پریشاں ہوں گے	ہائے اک رنج سے گھر میں یہ ساماں ہوں گے
یہ کہہ کے سو گئے دیکھی جو زلف عارض پر	ابھی ہے رات ذرا اور صبح ہو جائے
چشمِ مخمور میں یہ سُرخ پڑے ہیں ڈورے	یا نظر میکدہ میں آتی ہے تصویرِ بہار
تم سے کہتے تھے کہ باندھو نہ کمر میں یوں تیغ	سب کو اصرار ہے ہم بھی ہیں گنہگاروں میں
سونے والوں کو لحد کے وہ جگا کے اُٹھے	جب اُٹھے وہ تو کوئی حشر اُٹھا کے اُٹھے
شبِ غم نزع کی بھی سختیوں کا کر لیں اندازہ	نکل اے آہ یوں سینے سے جیسے دم نکلتا ہے

گرمیٔ حسن پہ شعلوں کی یہ آتش خیزی — مہندی کیا مل کے اُٹھے آگ لگا کے اُٹھے

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

مری لاش پہ فلک نے کئے جمع رونے والے — کوئی نوحہ پڑھنے والا کوئی اشکبار ہوتا

ہم کو تعجب ہے کہ عزیز نے بیسویں صدی میں بھی فارسی جمع کو بغیر اضافت استعمال کیا ہے جو دورِ پنجم کا شعار تھا۔ فرماتے ہیں:۔

ہر داغ دل ہے گویا تاریخ میرے تن میں — جلوے ہیں رفتگاں کے پیدا اسی چمن میں

جہاں کہیں عزیز نے غالب کی غزل پہ غزل لکھی ہے۔ اُس میں عزیز کو ناکامی ہوئی ہے چکبست نے البتہ بعض اشعار ایسی غزلوں میں اچھے نکال لئے ہیں۔ ہم کو عزیز کا صرف حسب ذیل شعر پسند ہے۔ جو غالب کی طرح میں کہا گیا ہے۔

پھانس ہو تو نکال لیں احباب — خلشِ دل کو کیا کرے کوئی

بعض احباب کا خیال ہے کہ عزیز، غزل میں اتنے کامیاب نہیں ہیں جتنے قصائد میں ہیں ہم آپ کا کلام ملک کے نامور رسائل میں دیکھتے رہے ہیں۔ اور قصاید بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں بے شک عزیز قصائد میں زیادہ کامیاب ہیں۔ عزیز کو غزل میں جو شہرت ہوئی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے لکھنؤ کے قدیم رنگ سے بغاوت اختیار کی اور غزل کے داخلی پہلو پہ بہت زور دیا۔ اگرچہ وہ اپنے ہم وطنوں کی چال بالکل نہیں بھلا سکے لیکن اُن کی طبیعت پر غالب و مومن کا اثر بہت زیادہ ہے۔ آپ کے ارشد تلامذہ میں جعفر علی خاں اثر، شبیر حسن خاں جوش اور جگت موہن لال رواں آنجہانی ہیں۔

ذیل میں حضرت عزیز کے بہترین اشعار درج کیے جاتے ہیں:۔

رنگ ہر پھول میں ہے حسن خود آرائی کا — چمن دہر ہے محضر تری یکتائی کا

عہد میں تیرے ظلم کیا نہ ہوا — خیر گزری کہ تو خدا نہ ہوا

نہ ملی داد ضبطِ عشق عزیز — وہ کبھی صبر آزما نہ ہوا

اب کھل رہا ہے نزع میں یہ رازِ حسن و عشق — وہ شوخ دل میں تھا میں سمجھتا تھا درد تھا

ڈرتا ہوں دل کا حال بیاں تم سے کیا کروں — تم اپنے زرد رنگ کا ہے اعتبار کیا

جب وضع احتیاط سے نالہ کوئی رکا — تصویرِ ضبط بن کے مرے دل میں رہ گیا

بے حقیقت دل کی ہستی کو وہ سمجھے تھے مگر — اس لہو کی بوند نے عالم تہ و بالا کیا

میں حشر کی حقیقت اتنی سمجھ رہا ہوں
یہ اپنا اپنا مقدر یہ اپنا اپنا نصیب
کوئی عالم میں با وفا ہی نہیں
جائیں قبروں پہ دوستوں کی کیا
اِس کا کیا ذکر کہ آئندہ تحمّل نہ رہے
وہ نگاہیں کیا کہوں کیوں کر رگِ جاں ہوگئیں
چند تصویریں مری جو مختلف وقتوں کی تھیں
میری خاموشی کی شرحیں لوگ جو چاہیں کریں
ہے خدا جانے خیالاتِ جنوں میں کیا اثر
پہلے آئینہ اک نظر دیکھو
کہہ کے بیمار سے یہ بجھ گئی شمع
دِل کبھی تھا ہمارے پہلو میں
بیکار یہ غصّہ ہے کیوں اس کی طرف دیکھو
اک عمر انتظارِ اجل کر چکا عزیز
دل تابعِ کشش تھا کشش تابعِ جمال
دیکھنا میرا تری جانب عجب ہنگامہ تھا
پھر تقاضا ہے کہ چلئے بزمِ جاناں میں عزیز
حُسن میں اور عشق میں گر ہے تو مشکل ایک ہے
جس طرف جاتا ہوں میں کہتی ہے ناکامی عزیز
دل ترا کیوں کہا کیا میں نے
ہائے مجبوریاں محبت کی
جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے
عزیز اب ضبط سے بھی کام لے کچھ
وقت کم، آرائشِ ہستی بہت
بجلی سی ایک سامنے آ کر نکل گئی

دونوں جہان ہوں گے اُن کا شباب ہوگا
زمانہ بھر کو ہنسائے ہمیں رُلائے بہار
اب کوئی ہم کو پوچھتا ہی نہیں
ہم سے تو کوئی بولتا ہی نہیں
دیکھ سکتے ہیں جو آنکھوں سے ستم دیکھتے ہیں
دِل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہوگئیں
بعد میرے زینتِ دیوارِ زنداں ہوگئیں
دردِ دِل میں کیا کہوں جب ہم زباں کوئی نہ ہو
ڈھونڈتا پھرتا ہوں وہ جنگل جہاں کوئی نہ ہو
پھر مرا دِل مرا جگر دیکھو
رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو
یہ خدا جانے بات ہے کب کی
آئینے کی ہستی کیا تم اپنی طرف دیکھو
ہاں اے نگاہِ یاس بس اب تیری آس ہے
ہاں ہاں محبت آپ سے کی اور ضرور کی
کر دیا تو نے تماشاگاہِ حیرانی مجھے
دیکھئے اب کیا دکھائے دل کی نادانی مجھے
اُس طرف ساری خدائی ہے اِدھر دل ایک ہے
لاکھوں تدبیریں ہوں لیکن سب کا حاصل ایک ہے
ہائے افسوس کیا کیا میں نے
چاہئے جو نہ تھا کیا میں نے
نہ بن پڑتی ہے ہنستے اور نہ روتے
ارے مر جائیے گا کیا روتے روتے
سخت حیرت ہے کہ کیا کیا دیکھئے
کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی

ہر گل میں تو ہے تجھ میں ہزاروں تجلیاں
دیوانہ کر دیا ہے مجھے فصلِ بہار نے

ہجومِ شوق کا بس قصۂ مختصر یہ ہے
کہ میں جو چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا

زبانِ دل کی حقیقت کو کیا بیاں کرتی
کسی کا حال کسی سے کہا نہیں جاتا

آگے خدا کو علم ہے کیا جانے کیا ہوا
بس ان کے رخ سے یاد ہے اٹھنا نقاب کا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے شعلۂ طور
کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا

میرا قصہ ہے جدا اس کا ہے افسانہ جدا
گو کہ ہے پاس مگر ہے دلِ دیوانہ جدا

میں تو بیہوش ہوا ذوقِ نظر سے اپنے
تیری تاثیر تھی اے جلوۂ جانانہ جدا

جنونِ عشق میں کوئی مری رفتار تو دیکھے
وہ چلنا تھوڑی دور اور چلتے چلتے پھر ٹھہر جانا

مرنا کہ زندہ رہنا پروا نہ اس کی کرنا
اے دل رہِ وفا میں اپنی سی کر گزرنا

ہمارے چہرے سے کیا کچھ عیاں نہیں ہوتا
نگہ سے دیکھ لو ہم سے بیاں نہیں ہوتا

ہے ان کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں
کسی کا راز کسی پہ عیاں نہیں ہوتا

اٹھائے جائیے کہاں لطفِ جستجو کوئی
جگہ وہ کونسی ہے تو جہاں نہیں ہوتا

تو نے اس لطف سے دیکھا تھا ازل میں اس کو
مر بھی جاتے تو کبھی دل نہ ہمارا ہوتا

صدا یہی جرسِ کارواں سے آتی ہے
چلو چلو کہ ٹھہرنے کا یہ مقام نہیں

یہ زندگی بھی یاد رہے گی زمانے میں
میں ہوں قفس میں روح مری آشیانے میں

مجبور ہوں کہ وعدہ خلافی پہ چپ رہوں
پہلو سکونِ دل کا ہے ان کے بہانے میں

ہر چند ضبط باعثِ اخفائے راز ہو
یہ بات اب نہیں ہے مرے اختیار میں

پھر حسن و عشق میں تھا بھلا امتیاز کیا
ہوتا اگر یہ دل ہی مرے اختیار میں

جلوۂ حسن دکھانے کو وہ راضی تو ہوئے
مگر اس کو کہ جسے طاقتِ دیدار نہ ہو

سالکِ راہِ فنا صورتِ شبنم ہوں عزیز
دامنِ گل پہ کبھی ٹھہروں تو آہستہ بار نہ ہو

بزمِ مطرب میں کبھی سوز نہ ہو ساز نہ ہو
پردۂ ساز میں گر آپ کی آواز نہ ہو

آج صیاد نے فرمانِ رہائی تو دیا
مگر ان کو کہ جنہیں طاقتِ پرواز نہ ہو

دل میں اک تیر ہے پیوستہ نکالوں کیونکر
ڈر رہا ہوں کہ نگاہِ غلط انداز نہ ہو

آج دیکھوں کششِ غم ہو کدھر سے پہلے
دل سے درد اٹھتا ہے پہلے کہ جگر سے پہلے

آنکھ ملتے ہی دگرگوں جو ہؤا حالِ عزیز
ہائے آگاہ نہ تھا تیری نظر سے پہلے

چند کشتوں کے تڑپنے کا سماں دیکھا ہے
مرنے والوں کو ابھی تم نے کہاں دیکھا ہے

سچ تو یہ ہے کہ جوانی میں کسے ہوش رہا
مَیں نے اپنا وہ زمانہ ہی کہاں دیکھا ہے

کہیں واعظ ہے، کہیں پیرِ خرابات عزیز
اُس کو ہر رنگ میں دیکھا ہے جہاں دیکھا ہے

کیوں ہوس آپ سے ملنے کی ہے دن رات مجھے
خود میسر نہیں جب اپنی ملاقات مجھے

سرِ منبر جو نہیں واعظ نے کہا لا مذہب
نظر آتے ہیں وہی مستِ مئے ذات مجھے

دل پریشان ہے ہر وقت یہ عالم ہے عزیز
نظر آتے ہیں کچھ اُٹھتے ہوئے ذرات مجھے

کوئی کیا اشکِ ندامت کی حقیقت سمجھے
یہ وہ دریا ہے کہ جس کا نہیں ساحل کوئی

پُر خطر راہ اگر ہے تو خدا مالک ہے
بن ہی جائیگا چراغِ سرِ منزل کوئی

دلِ نازک کی قدر ہی کب کی
بات غصے سے اُس نے کی جب کی

دیر و کعبہ میں فرق کیا ہے عزیز
صرف پابندیاں ہیں مذہب کی

کوسوں دیارِ عشق میں آبادیاں نہیں
یادش بخیر جب سے مرا دل نہیں رہا

عشق ہے اِک طلسمِ رازِ بقا
مِٹ گیا دل مگر فنا نہ ہؤا

جو حوصلہ تھا ضبط سے وہ دل میں رہ گیا
دل فکرِ حلِ عقدۂ مشکل میں رہ گیا

دم توڑنے کے بعد بھی مدت تک اے عزیز
کچھ اضطراب سا دلِ بسمل میں رہ گیا

آرزو

۱ نور حسین نام، آرزو تخلص ہے۔ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ شاعری میں جلال کے شاگرد رشید ہیں۔ آپ کے جدّ امجد نواب تہور خاں ہرات سے عالمگیر کے زمانہ میں ہندوستان وارد ہوئے۔ کچھ دنوں اجمیر میں قیام رہا۔ بعدازاں ان کے پوتے نواب سیف الدین خاں اجمیر سے لکھنؤ چلے گئے۔ بحرانِ انقلاب ۱۸۵۷ء میں ریاست بگڑ گئی۔ اور گھر لٹ گیا۔ حضرت آرزو کے والد میر ذاکر حسین دل آرام کی بارہ دری (لکھنؤ) میں قیام پذیر ہوئے اور یہاں ۱۲۸۹ھ میں ہمارے شاعر کی ولادت ہوئی۔

سلسلۂ تعلیم پانچ سال کی عمر ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ فارسی و عربی کی کتابیں لکھنؤ کے مشہور علماء سے پڑھیں۔ فنِ شاعری کو میر ضامن علی جلال سے حاصل کیا۔ کہتے ہیں۔ کہ بارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ استاد کی توجہ اور اپنی محنت سے مہارت حاصل کر لی۔ اور غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، سلام، مرثیے سب کچھ کہہ ڈالے۔

آجکل کلکتہ میں قیام پذیر ہیں۔ اور کئی قابلِ قدر ڈرامے مثلاً متوالی جوگن، دل جلی بیراگن شرارۂ حسن وغیرہ تحریر کر چکے ہیں۔ ایک رسالہ قواعدِ زبانِ اردو، نظامِ اردو . . . کے نام سے بیس سال کی محنتِ شاقہ کے بعد تصنیف کیا تھا۔ اگر ایسی اردو جس میں فارسی عربی کے الفاظ نہ آئیں۔ اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ بھی نہ ہوں دیکھنی مدِ نظر ہو تو حضرت آرزو کی موجودہ غزلیں ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کو خالص اردو کا نمونہ ان کی غزلوں میں جو چار پانچ سال سے معرضِ وجود میں آرہی ہیں۔ بکثرت مل جائے گا۔

کلام پر تبصرہ

آپ کا کلام زیادہ تر رسالہ الناظر (لکھنؤ) میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کلام میں ایک کشش ہے پڑھنے کے بعد شاعر کی عظمت دل میں جگہ کر لیتی ہے۔ آپ کا اندازِ بیان سوتے ہوئے خیال کو بیدار

کر دیتا ہے۔ الفاظ میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے شگفتگی تو نہیں ہے۔ مگر متانت ضرور ہے۔ زبان صاف اور مؤثر ہے۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک کا نام فغانِ آرزو اور دوسرے کا نام جہانِ آرزو ہے۔ جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ایک صاحب الناظر ۱۹۳۶ء میں لکھتے ہیں :۔

"فغانِ آرزو میں کچھ آہیں، کچھ نالے تھے، کچھ دل وجگر کی قاشیں تھیں۔ کچھ صوفیانہ ٹکڑے تھے، کچھ ہجر و وصال کی داستانیں تھیں جن کو قرطاسِ ابیض پہ الفاظ کا رنگیں جامہ پہنا کر پیش کیا گیا تھا۔ غرض آرزو کے بچپن اور شباب کی ساری کائنات . . . . جس کو تخیل نے اُن کے کاسۂ دماغ میں جمع کیا تھا۔ فغانِ آرزو کی صورت میں لٹا دی گئی" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ . . . . جوانی کی امنگوں کا دور دورہ ختم ہونے پر جب دل کو قدرے تسکین ہوئی تخیلات کے سیلاب کا زور کم ہوا۔ دھارے کا بہاؤ رُکا۔ درد کی ٹیس میں کمی ہوئی . . . . اب بڑھاپے کا پاس ہے . . . . اِس لئے جو بات آرزو کے منہ سے نکلتی ہے حکمت میں ڈوبی ہوئی۔ فلسفے سے بھری ہوئی۔ تصوّف میں رنگی ہوئی . . . لیکن زیرِ لب آہیں اب بھی باقی ہیں . . . خود بخود منہ سے نکل جاتا ہے ۔

جمع ہوئے ہیں کچھ حسین گرد مرے مزار کے — پھول کہاں سے کھل گئے دن تو نہ تھے بہار کے

لکھنؤ کی فضا اور جلالؔ مرحوم کی شاگردی کا اقتضا تو یہی ہونا چاہئے تھا۔ کہ آرزو لکھنؤ کے رنگِ قدیم کے علمبردار ہوتے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان دونوں باتوں پر کلامِ غالب و مومن کے مطالعہ نے اپنا غلبہ پا لیا اور آرزو غزل کے داخلی پہلو پہ طبع آزمائی فرمانے لگے۔
آپ ایک پختہ مشق اور کہن سال بزرگ ہیں۔ زمانہ کی مخالفت کہاں تک کرتے؟ قدیم رنگ کا ساتھ دیتا آپ کے دیگر ہمعصر شعراء نے بھی چھوڑ دیا۔ تو آپ ہی کیوں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جُدا بناتے۔ اِس لئے آپ کے کلام میں طرزِ جدید کا اتباع پایا جاتا ہے۔ مثلاً :۔

میں چپ آسرا لگائے اور انہیں یہی بہانہ — کہ یہ منہ سے کچھ تو کہتا جو اُمیدوار ہوتا
یہی حد نہ تھی وفا کی کہ قضا پہ ختم کر دی — ابھی اور کیا نہ کرتے اگر اختیار ہوتا
وہ کہیں کہ آرزو کو مری غفلتوں نے مارا — ابھی ہم یہ بات کہتے تو نہ اعتبار ہوتا

مضامین تو وہی پرانے ہیں۔ لیکن اندازِ بیان نیا ہے۔ جس کی وجہ سے دھوکا ہو جاتا ہے کہ شاید کوئی نئی بات کہی ہے۔

فارسی تراکیب آپ کے یہاں استعمال تو ضرور ہوئی ہیں۔ لیکن نہایت احتیاط کے ساتھ مثلاً

تاخیر کی بنیاد ہے خود عجلتِ بے جا ۔۔۔ جلدی ہے جو لکھنے کی تو رکتا ہے قلم اور

ہاں ہاں بجا ہے پرشِ تیغِ ادا پہ ناز ۔۔۔ لیکن نہ امتحانِ رگِ جاں کیجئے بغیر

مگر صفائی اور سادگی بدستور قائم ہے۔

اِس زمانہ میں ایسی غزل کا لکھنا دشوار ہے۔ جو اپنے تمام موجودہ لوازمات سے پُر ہو۔ اور دوسروں سے بہتر کہی گئی ہو۔ شعرِ معاصر کے شعراء نے غزل کے پایہ کو ضرور بلند کر دیا ہے۔ اور آیندہ نسل سے اندازِ بیان اور حُسنِ بیان کی مختلف صورتیں بھی چھین لی گئی ہیں۔ اور سب کچھ ان لوگوں نے اپنا ہی حصہ کر لیا ہے۔ لیکن دماغِ انسانی مخترع ہے۔ کوئی اور بات پیدا کر لے گا۔ اور غزل گوئی کو خیرباد نہ کہنے دیگا۔ اگرچہ اب نظمیں زیادہ لکھی جاتی ہیں۔ لیکن غزل گوئی کا شوق بھی کم نہیں ہوتا یہ سب جانتے ہیں۔ کہ آجکل غزل میں نام پیدا کرنا سخت مشکل اور بے سود ہے لیکن لکیر کے فقیروں کی بدولت یہ صنف مٹتی نظر نہیں آتی۔ حالانکہ اس کو غدر کے بعد بالکل مٹ جانا چاہئے تھا

آرزو کا نام غزل گوئی کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ ہم کو غزل گوئی کے سوا کسی اور صنف کلام کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ تو ممکن نہیں۔ کہ دیگر اصناف سخن میں حضرتِ آرزو نے کچھ نہ فرمایا ہو۔ لیکن ہماری نظر سے ایسا کلام نہیں گذرا۔ لہذا ہم اس کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتے۔ البتہ غزل گوئی کے متعلق اتنا اور کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اب آپ اِسے ختم کر دیں۔ اور کچھ نظمیں بھی لکھنے لگیں۔ تازہ ترین غزلوں میں ایک خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے۔ کہ آپ ٹھیٹ اردو میں غزل کہتے ہیں جس میں عربی فارسی کے الفاظ نہیں ہوتے۔ اور سنسکرت یا برج بھاشا کے ثقیل الفاظ بھی راہ نہیں پاتے۔ باوجود اس کے فصاحت قائم رہتی ہے۔

ذیل میں آپ کا منتخب کلام نقل کیا جاتا ہے:۔

بے کہے ہوتے لگا ظاہر جو دل کا راز تھا ۔۔۔ خود سکوتِ بے محل، فریادِ بے آواز تھا

وحشت انگیزی میں یکرنگی گریباں گیر تھی ۔۔۔ جتنے دیوانے تھے سب کا ایک ہی انداز تھا

جو درد اٹھتے مجھی کو مٹا گیا ۔۔۔ کیا اُس کا پوچھنا کہ کہاں تھا کہاں نہ تھا

عہدِ ازل میں اصل حقیقت جو پوچھئے ۔۔۔ سب آپ ہی کا قول تھا میرا بیاں نہ تھا

ہم کو اتنا بھی رہائی کی خوشی میں نہیں ہوش ۔۔۔ ٹوٹی زنجیر کہ خود پاؤں ہمارا ٹوٹا

آرزو اشک بن کے ڈوب پسینے کے چلے
اٹھا طوفان جو بہتا ہوا دھارا ٹوٹا

وہ ان کا اک مٹائے ہوئے کو پکارنا
وہ کانپ کر زمین سے اٹھنا غبار کا

بدلی کی چھاؤں سی اِدھر آئی اُدھر گئی
جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا

چمن وسیع ہے محدود قوتِ پرواز
ٹھکانا روز بدلتا ہوں آشیانے کا

پڑے مرے سر کے تھے الزام اگرچہ جھوٹے تھے
پھر آج ہاں کوئی ٹکڑا اسی فسانے کا

جیسی جس کی طینت ہوگی ویسا سب کو نباہیگا
داغی آئینہ جب دیکھوگے دھبا منہ پر آئیگا

کل نہ سہی دیدار کا وعدہ حشر کے بھی کچھ بعد سہی
جا ہی رہا ہے جاتا زمانہ وہ دن بھی آجائیگا

دِل کے ہر ذرہ میں ہے اب پرتوِ برقِ جمال
ایک شیشہ چور ہوکر آئینہ خانہ ہوا

اللہ اللہ حسن کی یہ پردہ داری دیکھئے
بھید جس نے کھولنا چاہا وہ دیوانہ ہوا

رسوائی مزید کا امکاں نہیں رہا
اِن دھجیوں کا نام گریباں نہیں رہا

قریبِ صبح یہ کہہ کر اجل نے آنکھ جھپکا دی
ارے اے ہجر کے مارے تجھے اب تک نہ خواب آیا

بھاگتی ہے ہر قدم میری ہوا سے اڑ کے گرد
اب نکل جائیگی ویرانی بھی ویرانے سے کیا

ایک پہیلی ہے جسے سمجھا کرو بوجھا کرو
بات کچھ، مطلب ہے کچھ پوچھوگے دیوانے سے کیا

وہ جزر و مد ہے کہ جسمیں ہے جوشِ بحرِ حیات
ملال بعد خوشی کے، خوشی ملال کے بعد

شرحِ بربادیِ دِل مجھ سے نہ پوچھ
ہے ترا حسن سراپا موجود

ہے نگاہِ باغباں میں آج بجلی کی چمک
ہمسفیرو اپنے اپنے آشیاں سے ہوشیار

ہے بہ از خود رفتگی قائم تو پھر کیسی دوئی
اپنا دھوکا ہو چلا ہے آپ کی تصویر پر

نکلی شریکِ قسمت بربادیِ نشیمن
تنکے جہاں پڑے تھے نوچے گئے وہیں پر

پھر شام نہ اب دیکھیں گے اے آہِ سحرگاہ
جلنے کا دھواں اور ہے بجھنے کا دھواں اور

دوریِ منزل سے ہے واماندگی بھی شوق بھی
بیٹھتی اٹھتی چلی جاتی ہے دیوانے کی خاک

خود کام کبھی ناکام کبھی اور آرزوئے بدنام کبھی
اللہ پکارے جاتے ہیں اس بزم میں کس کس نام سے ہم

امنگ کتنی یہ جوانی کی یا کوئی آندھی
ملا کے خاک ہیں ہم کو گئی بہار کہاں

پرتو خلوت ہے جلوت کا طلسم "
دوڑی دوڑی پھرتی ہیں پرچھائیاں

چور شیشے پہ نظر پڑتے ہی دل یاد آیا
ٹوٹنے والے تری تصویر لئے بیٹھا ہوں

قید کو توڑ کے سمجھا کہ سہارا توڑا ،،
ہاتھ میں پاؤں کی زنجیر لئے بیٹھا ہوں

مرا ہنسنا ہے دنیا میں چراغِ صبح کا ہنسنا
اُن کی بیجا بھی سنوں آپ بجا بھی نہ کہوں
کٹی چاک اُن کے ہاتوں کیچھ آنسو اپنی آنکھوں کے
جہاں کے انقلابوں سے ہے زندہ میری بیتابی
مٹی ہوئی سی ہوں تصویر اپنی حسرت کی
چاک دامانِ یوسف کو ہوا میں نہ اُڑا
ذکرِ جفا بُرا نہیں گر ہو بطرزِ جوشِ شوق
اوّلِ شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
قید کو نکلا توڑ کے جب میں اُٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
ہاتھ سے کس کے ساغر پڑا موسم کی بے کیفی پہ
تھی گراں زنجیرِ آہن بھی جنوں بھی روبرو
پابندیٔ رسوم کہاں شوقِ دل کہاں
دنیا بدل گئی جو کھُلی بند ہو کے آنکھ
ٹکڑے ابھی جُڑ سکتے نہیں ٹوٹے ہوئے دل کے
اک نیا دوزخ بنا کر جھونک دے یہ سب قبول
اگر آرزو دل اُمنڈ پڑے تو پھر اشک رُک سکے کیا
پستیٔ ہمت اور شے بے بسی اور چیز ہے
مُنہ پہ تو آ کے تھی ہنسی کھینچ گئی دل سے ٹھنڈی سانس
تعلقاتِ چمن قطع کر رہی ہے صبا
یہ ہے دارِ محن اس سے سکونِ دل کو کیا نسبت
خلوت کدۂ دل کا بھرم جائیگا اے شوق
ہاں پاس ہمارے بھی ہے اک حُسن کا معیار
تقدیر میں ناکامِ محبت کی ازل سے
بن گئے سیکڑوں قصّے مری خاموشی کے
حُسنِ بے پروا کا پردا ہے یہی نیرنگی

سنبھالا لیکے جو مرتا ہے اُس مریض کی بحالی ہوں
آخر انسان ہوں میں بھی کوئی دیوار نہیں
دیا ہے جو مقدر نے لئے بیٹھا ہوں دامن میں
ابھی تک کے دٹوں پر کر رہا ہوں گنج مدفن میں
گیا ہوا ترے وعدہ کا اعتبار ہوں میں
کہیں وہ پڑا نہ دے کوئی اسی افسانے کو
اے لبِ شکوہ سنج دیکھ کم نہ وفا کی شان ہو
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یا افسانہ بھی
وحشت عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا ویرانہ بھی
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی
جو کڑی ٹوٹی صدا نکلی مبارک باد کی
اک کشمکش میں ڈال دیا ہے مگر مجھے
آئینۂ ازل ہے یہاں ہر سحر مجھے
شیشہ پگھل جائیگا تو ہاتھ لگا دے
جن سے تو ناراض ہے ان میں نہ کر شامل مجھے
کوئی شے نہیں کہ اُبل چلے تو پلٹ دو شیشے میں جام سے
لوٹ کے بھی نہ تھک سکے پاؤں امیدوار کے
اے لو ہوا سنک چلی آ گئے دن بہار کے
قفس پہ گر رہے ہیں تنکے مرے نشیمن کے
کمی ہونے سے بے چینی کا نام آرام ہوتا ہے
آواز نہ دینا کہ یہاں کوئی نہیں ہے
تم اتنے ہی پیارے ہو نظر جتنی حسیں ہے
آغاز ہی آغاز ہے انجام نہیں ہے
اور جو راز کی تھی بات وہ پھر راز نہیں ہے
ہر جگہ اک نئی تصویر نظر آتی ہے

ہیرا بھی ہے دل تو پتھر ہے یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے
ہاں پانی ہو کر بہ نکلے پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

کیوں وادیِ ایمن کے پھیرے کیوں طور کا آنا جانا ہے
وہ شمع ہے دل ہی میں روشن جس شمع کا دل پروانہ ہے

اب دل ہی کو ہوش میں لے آئے یا اپنے ہوش بھی کھو بیٹھے
دیوانے بنے تو کام چلے دیوانے کو سمجھانا ہے

کیسی اُلٹی دنیا ہے بسی اِن شہر خموشاں والوں کی
اندر اندر ہے آبادی باہر باہر ویرانہ ہے

کشاکش میں حیات و موت کی ہوں سانس کیا ٹھہرے
یہ بےچینی کی گھبراہٹ ہے آنا ہے نہ جانا ہے

اسی شہر خموشاں میں جہاں چھایا ہے سناٹا
کسی دن حشر جاگ اُٹھے گا وہ کہرام ہونا ہے

جذبِ نگاہِ شعبدہ گر دیکھتے رہے
دُنیا اُنہیں کی تھی وہ جدھر دیکھتے رہے

نکلی جو دہلا کے قفس کا نسیم باغ
تادیر تول تول کے پر دیکھتے رہے

پردہ کی جنبشوں میں بھی لہریں تھیں حسن کی
جو دیکھنا تھا اہلِ نظر دیکھتے رہے

آنکھ جھپکی تیور آئے ہٹتے ہی چہرہ سے زلف
اللہ اللہ دھوپ اِس بدلی کی کتنی تیز ہے

آگئی پیری جوانی ختم ہے
صبح ہوتے ہی کہانی ختم ہے

لپٹی ہوئی دستار کو بھی سر سے اُڑی ہے
وہ گرد کہ جو اپنی ہی ٹھوکر سے اُڑی ہے

شب کو بھی میرے داغِ سوزاں میں
روشنی آفتاب کی سی ہے

چمک بجلی کی کہتی ہے کہ ٹکرائے ہیں دو بادل
وہی قصہ ہمارا ہے وہی اُن کی کہانی ہے

اخفائے راز، شانِ وفا، امتحانِ صبر
آج ایک خامشی سے بڑے حق ادا کیے

ہنستے ہو اشک و آہ پہ یہ سوچتے نہیں
کس کس طرح غریب نے مطلب ادا کیے

اِسی چمن میں کہ وسعت ہے جس کی نامحدود
نہیں پناہ کی جا ایک آشیاں کے لیے

یاس و یگانہ

م رزا واجد حسین اور یاس و یگانہ دو تخلص ہیں۔ سنہ ۱۳۰۱ھ میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ ابتدائی تعلیم اور درسیاتِ فارسی کی تکمیل کی۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں غالباً انٹرنس پاس کرنے کے بعد شعر و شاعری کی طرف طبیعت مائل ہو گئی پہلے بیتاب کو کلام دکھایا۔ بعد ازاں شاد عظیم آبادی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں کلکتہ اور مٹیا برج کا سفر کیا۔ اور نواب محمد یوسف علی مرزا اور نواب محمد یعقوب علی مرزا کے اتالیق مقرر ہوئے۔ مگر وہاں کی آب و ہوا نے آپ کی صحت پر ایسا اثر کیا۔ کہ تھوڑے ہی دنوں میں علیل ہو کر عظیم آباد واپس چلے آئے۔ تقریباً ایک سال تک بیمار رہے۔ آخر کار لکھنؤ میں علاج کی غرض سے آئے۔ لکھنؤ کی آب و ہوا اور وہاں کی دلچسپیوں کا اتنا خوشگوار اثر ہوا۔ کہ ترکِ وطن کر کے لکھنؤ میں رہنے سہنے لگے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں مرزا صاحب کی شادی لکھنؤ میں ہو گئی اور شادی کے بعد سنہ ۱۹۱۴ء میں اپنا مجموعۂ کلام نشترِ یاس کے نام سے شائع کیا۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں عروض و قوافی پر ایک رسالہ چراغِ سخن لکھا۔ شہر کے مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ اور اپنی خود پرستی کی تشہیر میں حصہ لیتے رہے۔ اہلِ لکھنؤ آپ کی حرکات و سکنات اور بیجا فخر و مباہات سے تنگ آ گئے اور ناگوار تعلقات کی بنیاد پڑ گئی۔ لکھنؤ الٰہ آباد اور بنارس کے مشاعروں میں ترکِ موالات کی نوبت پہنچی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب لکھنؤ میں آپ کی روزی پر حملہ ہوا۔ تو آپ کو سید انشاء کا یہ مصرع یاد آ گیا۔ ع

روٹی جو کھانی ہووے تو پنجاب جائیے

چنانچہ لاہور تشریف لے گئے۔ اور وہاں اپنا دیوان آیاتِ وجدانی کے نام سے شائع کرایا۔ مدتوں پریشان حالی میں بسر کر کے آخر کار حیدر آباد چلے گئے۔ اور سنا ہے۔ کہ اب وہاں سب رجسٹراری کا کام کرتے ہیں۔

کلام پر تبصرہ

ہمارا خیال تھا۔ کہ مطبع کی ایجاد سے علم و ہنر کی اشاعت میں بیحد ترقی ہوئی ہے۔ اور بنی نوع انسان، خیالات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ لیکن آیاتِ وجدانی کو دیکھ کر معلوم ہوا۔ کہ مطبع کو جہالت و نادانی کی تشہیر کا بھی آلۂ کار بنایا جا سکتا ہے۔ شاعر کے دماغ میں تعلّی کا مادۂ فاسد عجیب عجیب شکلوں میں نشو و نما پاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی انسان نہیں۔ جہاں تک میرے خیالات کی رسائی ہے۔ وہاں کوئی دوسرا شخص نہیں پہنچ سکتا مجھ کو الہام ہوتا ہے۔ اور میری زبان پر وہ اشعار جاری ہوتے ہیں۔ جن کو ملہمِ غیب نے خاص میرے لئے بطور امانت محفوظ رکھ چھوڑا تھا۔ شاعری بلاشبہ ایک عطیۂ الٰہی ہے۔ لیکن جس شاعر نے اِس سے بُرے خیالات کی اشاعت کا کام لیا ہے۔ وہ ضرور قابلِ نفرین و ملامت ہے۔ خود ستائی، انسان کے بدترین عیوب میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ مَیں شاعر ہوں، کوئی عیب کی بات نہیں۔ ایک امرِ واقعہ ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ مجھ سا شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اور میرے خیالات بالکل اچھوتے اور نئے ہیں۔ غلط اور سر تا پا جھوٹ ہے۔ ہماری دنیا روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ ایک ایجاد کے ذریعہ سے دوسری ایجاد کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن پہلی ایجادوں کے افادہ اور فیض رسانی سے انکار نہیں کیا جا سکتا جن کو ایجادِ نو کا سرچشمہ کہنا چاہئے الحمدُ للہ کہ خدائے برتر نے اِن موجدین کے دماغ میں تعلّی کا مادہ نہیں رکھا۔ بلکہ ان کو خاکساری سے مزیّن فرمایا۔ وہ جس قدر ایجادیں کرتے جاتے ہیں۔ اُن پر فخر نہیں کرتے۔ بلکہ سمجھتے ہیں کہ ابھی اور بہت کچھ کرنا ہے۔ مگر جس شاعر کا حوصلہ پست اور ظرف تنگ ہوتا ہے۔ وہ چھلک پڑتا ہے اور کبھی مضمونِ نو کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ اور کبھی ترکیبِ نو کا کبھی اسلوبِ بیان کے نئے ہونے کا اور کبھی بلند خیالی اور عالی حوصلگی کا۔ تعلّی کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہے لیکن وہ ایسی ہے۔ جیسے آٹے میں نمک۔ حضرت یاس و یگانہ نے تمام کھانا نمک بنا دیا ہے۔ بیشک یہ نئی چیز ہے۔ کہ آپ نے اپنے اشعار کی تشریح فرمائی ہے۔ کسی شاعر نے آج تک ایسا نہیں کیا لیکن غالب اور ٹیگور کو ساتھ ساتھ مفضول قرار دینا۔ اور اپنے آپ کو فاضل ماننا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ حضراتِ لکھنو اگر آتش و غالب کے مدّاح ہیں۔ اور آپ سے حسد یا نفرت رکھتے ہیں۔ تو یہ کیا منطق ہے۔ کہ آپ غالب کو بُرا کہیں۔ اور آتش پرست سے خود پرست بن جائیں

جب آپ کا مطمحِ نظر یہ شعر ہے:۔

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے   یاسؔ کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

تو آپ سے راہِ راست پر آنے کی توقع بیکار ہے۔ آپ خود پرستی اور حق پرستی کو ایک شئے سمجھے ہوئے ہیں حالانکہ حق پرستی اور خود پرستی متضاد ہیں اور خود پرستی، ناحق پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ شعر جو آیاتِ وجدانی کے سب سے پہلے صفحہ پر مطمحِ نظر کے تحت میں چھاپا گیا ہے۔ آپ کے دماغ کے عدمِ توازن کی غمازی کر رہا ہے۔ اور اس قابل نہیں۔ کہ اس شعر کو شعر کے مبارک نام سے یاد کیا جائے۔ اور اگر پہلا مصرع سوالیہ ہے۔ اور اس طرح خود پرستی اور ناحق پرستی کو ایک شئے تصور کیا گیا ہے۔ تو شاعر کا یہ مطمحِ نظر اس کی زندگی کے ارتقا سے تطابق نہیں رکھتا۔ اور اس کا مستحق نہیں ہے۔ کہ مطمحِ نظر کے تحت میں یہ شعر چھاپا جائے

جب انسان بھوکا ہوتا ہے۔ تو اس کا دماغ خشک ہو کر رہ جاتا ہے۔ شگفتگی اور توازن کا نام و نشان تک نہیں رہتا۔ حضرت یاسؔ کو لکھنؤ کی فضا میں بھوک کے اشتداد نے سب و شتم پر آمادہ کیا۔ اور آپ کی زبان پر یہ شعر جاری ہوا:۔

لکھنؤ کے فیض سے ہیں دو دو سہرے میرے سر   ایک تو استادِ یگانہ دوسرے داماد ہوں

اگر آپ کی شادی لکھنؤ میں اتفاق سے ہو گئی۔ تو کیا آپ تمام اہلِ لکھنؤ کے داماد ہو گئے؟ ہزاروں اشخاص کی شادیاں لکھنؤ میں ہوتی ہیں، انہوں نے اس کو کچھ فخر نہیں سمجھا۔ تعجب ہے۔ کہ آپ لکھنؤ کی ایسی معمولی بات پر تو فخر کریں۔ اور یہ بھی کہتے جائیں کہ ع

"آبرو سے لکھنؤ خاکِ عظیم آباد ہوں"

آیاتِ وجدانی میں ہر جگہ اہلِ لکھنؤ کے برے سلوک کا رونا رویا گیا ہے۔ اور ان کی شکایت کی گئی ہے۔ لیکن اپنی بد زبانی کی طرف سے آنکھ بند کر لی ہے۔

تین چار سال ہوئے کہ حضرت یاسؔ نے ہمارے پاس خدا جانے کیوں؟ اپنی رباعیات جن میں مرزا غالب کو گالیاں دی گئی ہیں۔ بھیجی تھیں۔ ان کو پڑھ کر ہم نے اندازہ کر لیا تھا۔ کہ جناب یاسؔ نہ صرف بد زبان ہیں۔ بلکہ حقیقی شاعری سے کوسوں دور ہیں۔ کیوں جناب! یہ کیا شاعری ہے؟ ۔

غالب، غالب لئے کہاں کے غالب   غالب کے چچا کے آگے سب ڈھینڈس ہیں

آپ غالب کے چچا بیٹے یا بھتیجے (بلحاظِ سن تو آپ پوتے ہونگے؟) مرحوم کو گالیاں دیجئے یا صلواتیں

سُنایا ہے ہم کو اس سے سروکار نہیں۔ لیکن جناب کا یہ دعویٰ کہ آپ بہترین شاعر ہیں۔ اور
شاعری کے صحیح مفہوم کو سمجھتے ہیں غلط معلوم ہوتا ہے

مرزا غالب نے بقول آزاد "ایسا نقارہ بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دئے۔ کوئی سمجھا
اور کوئی نہ سمجھا۔ لیکن واہ وا اور سبحان اللہ سب کہتے رہ گئے۔"

ایک جگہ وہ خود فرماتے ہیں :-

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اِس سے انکار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ غالب نے اپنا اندازِ بیان سب سے نرالا اور
اچھوتا اختیار کیا ہے۔ جذباتی شاعری کا رواج شعرائے دہلی میں شروع سے چلا آتا ہے۔ لیکن
اپنے جذبات اور احساسات کو نئے نئے اسلوب سے بیان کرنا غالب کی جدت آفریں طبیعت
کا خاصہ تھا۔ سخن فہم حضرات اُن کی زندگی میں بھی اُن کے مدّاح تھے۔ اور اُن کے مرنے کے بعد
جب خواجہ حالی نے یادگارِ غالب لکھ کر اُن کو نئی نسل سے روشناس کرایا۔ تو داغ کا رنگ جو اُن
کے بعد رنگ لایا تھا۔ اور شاگردانِ غالب و مومن کو گوشۂ گمنامی میں بٹھانے کی دھمکیاں دے
رہا تھا۔ رفتہ رفتہ پھیکا پڑنے لگا۔ اور ملک کے ہر گوشہ سے غالب، غالب کی صدا آنے لگی۔
شیفتہ، سالک، مجروح اور حالی وغیرہ تو اسی خوانِ نعمت کے براہِ راست متمتع ہونے والوں
میں تھے۔ لیکن اقبال، وحشت، فانی اور موجودہ دَور کے دیگر شعرا سب کے سب اُن کا
دیوان پڑھ کر اپنے کلام کو غالب کے طرز پر ڈھالنے لگے۔ چونکہ داغ کے زمانہ میں اُردو شاعری
معاملہ بندی، زبان کی صفائی اور بوالہوسی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، اس لئے آنے والے
متغزلین نے داغ کے رنگ کو خیرباد کہا۔ لکھنؤ نے بھی جو ناسخ کے زمانہ سے کنگھی، چوٹی میں
اُلجھا ہوا تھا۔ ایک انگڑائی لی اور غالب و مومن و حالی کو پیشِ نظر رکھ کر شعر کہنا شروع کیا
جس وقت لکھنؤ میں یہ نیا دَور شروع ہوا۔ اتفاق سے حضرتِ یاس بھی وہیں پہنچ گئے چونکہ
شاد عظیم آبادی جیسے عظیم المرتبت شاعر سے نکات و رموزِ سخن حاصل کئے تھے۔ اس لئے ان
کی طبیعت میں داغ اور لکھنؤ کے رنگ سے نفرت اور میر و آتش کے کلام سے محبت ہو گئی
تاہم ہر سالک کو نئے نئے مقام سے گزرنا ہوتا ہے۔ اور دشوار مراحل کو طے کرنا پڑتا
ہے۔ تب کہیں وہ منزلِ مراد پہ پہنچتا ہے۔ حضرتِ یاس کو جو دقتیں پیش آئیں۔ وہ اُن ہی
میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اور یاس سے یگانہ بن کر منزلِ مقصود کو فراموش کر بیٹھے۔ آگے چلنے کا اُن

میں دم نہ رہا اور مرزا غالب کے طرز کا اتباع نہ ہو سکا۔ جب سالک کا مسلک خودی کی وجہ سے خراب ہو جاتا ہے۔ تو وہ گمراہ ہو کر اپنے درجے سے گر جاتا ہے۔ یہی حال یاس و یگانہ کا ہے۔

زیادہ تر افسوس یہ ہے۔ کہ یاس نے خود کلام غالب پڑھ کر بیحد استفادہ کیا ہے۔ ان کے فقرے یاس کے کلام میں موجود ہیں۔ ان کی ترکیبیں یاس نے اختیار کی ہیں۔ ان کے مضامین کو اپنی طرز پر باندھا ہے۔ لیکن دعویٰ یہ ہے۔ کہ کلام غالب میں اس قسم کے مضامین نہیں وہی مثل ہے کہ "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے"۔ احسان فراموشی یاس کے حصہ میں آئی ہے۔ اگر کل غالب نہ پیدا ہوتا۔ تو آج اقبال، حسرت، اصغر، فانی وغیرہم بھی نہ ہوتے۔ یاس کا ذکر کیا؟ کیا غالب کے مخصوص جملے، "قیامت ہے"، "وہ کافر بدگماں ہو جائے گا"، "دل ڈھونڈتا ہے"، "دکھاؤں گا تماشا" وغیرہ اس قسم کی ترکیبیں طاق نسیاں، صبر آزما، اندیشۂ باطل اور خدا نہ کردہ، وغیرہ یاس کے اشعار میں نہیں ہیں۔ بہرحال مرزا غالب کے کلام سے یاس و یگانہ کے اشعار کا موازنہ کرنا در حقیقت ع

"سورج کو چراغ سے دکھانا"

لیکن جب تک ایسا نہ کیا جائیگا۔ چراغ کو یہی مغالطہ رہے گا کہ وہ سورج سے بڑھ کر ہے۔

غالب کی ایک مشہور غزل پر یاس و یگانہ نے ایک غزل کہی ہے۔ لیکن گریباں اور پشیماں کے قافیوں کے سوا، دوسرے قافیے بچا کر باندھے ہیں پشیماں کا قافیہ دو جگہ باندھا ہے۔ فرماتے ہیں:-

نفس سے صلح کا انجام یہی ہونا تھا اپنی ہر سانس پہ رہ رہ کے پشیماں ہونا

دوسرا شعر ہے:-

مٹتی وعدۂ موہوم نے صورت پکڑی بدگمانوں کو مبارک ہو پشیماں ہونا

اب غالب کی جدت طبع اور بلند پروازی دیکھئے:-

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

زود پشیماں کی نہ صرف ترکیب نئی ہے۔ جو یاس و یگانہ جیسے شاعروں کے دماغ میں نہیں آسکتی بلکہ مضمون شعر کس قدر بلند ہے! اور اسی کے ساتھ ساتھ بالکل فطرت انسانی کے مطابق۔ جب کوئی ظالم انتہا درجہ کا ظلم کرتا ہے تو قوت انفعال خود بخود اس کو منفعل کر دیتی ہے۔ غالب کا قتل ایسا ہی اور ہولناک ظلم تھا۔ کہ اس نے آئندہ ظلم کرنے سے توبہ کر لی۔ لیکن غالب کی حرماں نصیبی

دیکھئے کہ توبہ بھی کی تو اُس کے قتل کے بعد۔ زود پشیماں میں کیا کیا خیالات پنہاں ہیں، اس کی تصریح نہیں کی جا سکتی۔ مولانا حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "مرزا غالب کے اشعار میں اکثر کئی کئی معانی نکلتے ہیں" ممکن ہے اس شعر میں بھی ایسا ہو، آجتک اس شعر کا یہی مفہوم سمجھا گیا ہے۔ کہ معشوق کو زود پشیمان طنزاً کہا گیا ہے۔ اور جو مطلب اوپر درج ہوا ہے۔ وہ صحیح ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ شاعر نے زود پشیمان طنزاً نہ کہا ہو۔ بلکہ حقیقتاً کہا ہو۔ اس سے شعر کے دوسرے معنی یہ ہو جائیں گے۔ کہ میرا قتل ایک معمولی بات تھی۔ لیکن وہ اس قدر جلد متاثر ہوا۔ کہ جفا ہی سے توبہ کر لی۔ حالانکہ معشوق اور جفا لازم و ملزوم ہیں۔ اگر جفا نہ ہو۔ تو معشوق نہیں۔ یہ مجھے کیسے گوارا ہو سکتا ہے۔ کہ میرے مرنے کے بعد وہ معشوق نہ رہے۔ اور در پردہ غالب اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے۔ کہ میری جانبازی کو دیکھ کر معشوق کو یقین آ گیا۔ کہ ایسا عاشق اب نہیں مل سکتا لہٰذا وہ سوگوار ہو گیا اور اس نے امتحانِ عشاق بند کر دیا ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

حضرت یاس "دو دو مضمون" تو اپنے شعر میں کیا پیدا کریں گے، اُن سے ایک ہی مضمون ادا ہونا مشکل ہے۔ آپ کے متذکرہ بالا شعر میں جب کوئی شخص نفسِ امارّہ سے صلح کر لیتا ہے تو اس میں قوتِ انفعال باقی نہیں رہتی۔ وہ غلط رستہ پر آنکھیں بند کئے چلا جاتا ہے۔ حالانکہ آپ کہتے ہیں کہ نفس سے صلح کرنے کے بعد ہر سانس پر پشیمانی ہوئی۔ اگر ہر سانس پر پشیمانی ہوتی تو فوراً نفس سے جنگ ہو جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا اور صلح کے لفظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ ہو کر صلح ہوتی ہے۔ لہٰذا قوتِ انفعال کے باقی رہنے کا امکان ہی جاتا رہا۔

دوسرے شعر میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اگر وعدہ پورا ہو گیا۔ تو جن لوگوں کو یقین نہیں تھا۔ اُن سے طنزاً ایسا کہنا کہ آپ کو مبارک ہو وعدہ پورا ہو گیا۔ کیا بات ہوئی! عموماً لوگ اپنے مخالفوں کو شرمندہ کرنے کے لئے ایسا کیا کرتے ہیں۔ لیکن آپ نے جو عین الیقین کے درجہ پر پہنچنے کا دعویٰ کیا ہے۔ اور ان اللہ لا یخلف المیعاد کا حوالہ دیا ہے اس سے متشککین کا پشیمان ہونا صرف آپ کا خیال ہی خیال ہے۔ اور یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ آپ کا یہ ارشاد کہ ع

"معنیٔ وعدۂ موہوم نے صورت پکڑی"

کیسے معلوم ہو کہ صحیح ہے۔ جب تک کہ قیامت برپا نہ ہو۔ آپ کے دلِ آگاہ سے متشککین کی تسلی نہیں ہو سکتی۔ اور اِس وقت کوئی موقع اُن پر طنز کرنے کا نہیں ہے۔ لہٰذا آپ دونوں اشعار

ہیں اپنا پورا مطلب ادا نہیں کر سکے۔ یا یہ کہ مضمون ہی خام خیالی پر مبنی اور ناقص ہے۔
گریبان والے شعر کو آپ نے بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور واقعی غالب کے مشہور مقطع کے سامنے اُس کو پیش کرنا بھی نہ چاہیئے۔

غالب کی ایک دوسری غزل پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ یاس کا مطلع ہے :۔

دل کی ہوس وہی ہے مگر دل نہیں رہا — محمل نشیں تو رہ گیا محمل نہیں رہا

کیا لغو شعر ہے۔ یعنی بڑھاپے میں زندہ دلی تو رہتی نہیں۔ مگر ہوس باقی رہتی ہے۔ اس کو اگر رکیک شعر کہا جائے۔ تو بیجا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں آپ کو محمل کے نہ رہنے کا افسوس ہے۔ اور محمل نشین کے موجود رہنے پر خوشی نہیں۔ حالانکہ محمل بلا سے خاک ہو جائے۔ لیکن محمل نشیں کا صحیح وسلامت رہنا زیادہ اچھا تھا۔ مگر آپ نے ایسی ناپاک چیز یعنی ہوس کو محمل نشیں بنایا ہے کہ محمل اور محمل نشیں دونوں کا فنا ہو جانا ہی اچھا ہے۔

غالب کا مطلع ہے :۔

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

کیا ان اشعار کا جواب کسی سے ممکن ہے ؟

غالبؔ مرنے کی لے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

گو میں رہا، رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

یاس کے بہترین اشعار خود اُن کے نزدیک یہ ہیں :۔

رکھتے نہیں کسی سے تسلی کی چشم داشت — دل تک اب اعتبار کے قابل نہیں رہا

آہستہ پاؤں رکھئے، قیامت نہ کیجئے — اب کوئی سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہا

پروانے اپنی آگ میں جل کر ہوئے تمام — اب کوئی بارِ خاطرِ محفل نہیں رہا

یاد آئی بوئے پیرہنِ یار ناصحا! — اپنا دماغ اب کسی قابل نہیں رہا

یہ معمولی اشعار اور پیش پا افتادہ مضامین حضرتِ یاس کو مبارک ہوں۔ وہ حضرت غالب کا مرتبہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اُن کی شاعری کی دُنیا نہایت محدود اور تنگ ہے۔ اُن کے تخیل کی پرواز لبِ بام تک ہے۔ وہ آسمان کی فضاء سے ناواقف ہیں۔ اس لئے اُن کے تمام دعاوی جو آیاتِ وجدانی میں جا بجا کئے گئے ہیں۔ ایک مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ یاس کے ان تمام اشعار سے تو عزیز لکھنوی کا یہ شعر کہیں بہتر ہے :۔

کوسوں دیارِ عشق میں آبادیاں نہیں　　یاوش بخیر جب سے مرا دل نہیں رہا

یاسؔ کی سخن فہمی غالبؔ کے اس شعر پر محاکمہ کرنے سے ظاہر ہو جاتی ہے:-

غالبؔ، اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں　　پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

فرماتے ہیں "عرفیؔ کے اس شعر کے مقابلہ میں غالبؔ کے شعر کی کیا حقیقت ہے۔

عرفیؔ، حلّہ ہا سوختہ اند اہلِ بہشت از غیرت　　تا شہیدانِ تو گلگوں کفنے ساختہ اند

حق یہ ہے کہ عرفیؔ کے اس شعر میں ایک ایک لفظ کی رنگینی پر صد بہارستانِ معنی صدقے ہیں۔ عرفیؔ کے شعر کے مقابلہ میں غالبؔ کا شعر پانچ فیصدی نمبر پانے کا مستحق نہیں ٹھہر سکتا۔"

ہم پیشتر عرض کر چکے ہیں۔ کہ حضرت یاسؔ مرزا غالبؔ کے اشعار سمجھنے کی قطعاً صلاحیت نہیں رکھتے۔ جو لطف غالبؔ کے اس مصرع میں ہے:-

"پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی" وہ "حلّہ ہا سوختہ اند اہلِ بہشت از غیرت" میں کہاں ہے؟"

عرفیؔ نے اہلِ بہشت کا رشک و حسد سے جلنا ظاہر کیا ہے۔ اور اہلِ بہشت سے مراد حورانِ بہشتی ہیں۔ لہذا ان کا رشک و حسد سے جلنا نہ صرف غلط ہے۔ بلکہ ایسا ہونا ناممکن ہے اگر ممکن ہے تو یہی صورت کہ شہیدانِ عشق پر فخر و ناز کریں۔ اور یہ بات غالبؔ کے مصرعِ آخر سے ظاہر ہے۔ شہید کی رعایت سے خون چکاں کفن کہنا نہ صرف امرِ واقعہ ہے۔ بلکہ سادگی کو ظاہر کرتا ہے۔ عرفیؔ کے یہاں "گلگوں کفن" تصنع سے خالی نہیں ہے۔ اور شہید کی نسبت گلگوں کفن پر نظر ٹھہر جاتی ہے۔ حالانکہ شہید کی بے نذری ظاہر ہونی چاہیئے۔ اسی بنا پر غالبؔ نے کفن کو خونچکاں کہہ کر پہلے اس کی کم مائگی کو ظاہر کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کی بے نذری شہیدانِ عشق کا کفن ہونے کی وجہ سے "کروڑوں بناؤ" کہہ کر ثابت کی ہے۔ لہذا غالبؔ کا شعر عرفیؔ کے شعر سے بدرجہا بہتر ہے۔

ہم کو حضرت یاسؔ کی فارسی دانی سے بحث نہیں ہے۔ اور نہ ہم اُن کے اُردو کلام کے علاوہ فارسی کلام کو دیکھنے کی زحمت گوارا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اُن کی اس رائے سے جو انہوں نے عرفیؔ کے شعر پر ظاہر کی ہے۔ معلوم ہو گیا۔ کہ آپ نے فارسی میں بھی صرف یہاں تک استعداد بہم پہنچائی ہے:-

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز　　لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا"

مرزا یاسؔ کے محاکمہ کے بعد شارح نے آپ کے اس شعر کی

جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا وہ جوبن　　دوڑ کر سب نے کلیجہ سے لگانا چاہا

یہ شرح لکھی ہے۔ ۔ " عرفی و غالب نے تو شہیدانِ عشق کے کفن کی رنگینی کا نقشہ کھینچا ہے
مگر مرزا یگانہ کی جودتِ فکر نے مذکورۂ بالا شعر میں حسینوں کو کفن پہنا کہ اُن کی جامہ
زیبی کی ایسی بہار دکھائی ہے۔ جو اب تک کہیں دیکھنے میں نہ آئی۔ دیکھنے والوں
پر اس جامہ زیبی کا جو اثر ہوا اُسے کس بے ساختگی سے دکھایا ہے:-

دَوڑ کر سب نے کلیجہ سے لگانا چاہا

لفظ چاہا کی بلاغت دیکھنے کے قابل ہے۔ یعنی حسینوں کو اس جامہ زیبی پر دل کا
تقاضا تو یہ ہوا کہ کلیجے سے لگا لیجئے۔ مگر اتنی ہمت نہیں ہوتی۔ رُعبِ حسن اس
گستاخی کی اجازت نہیں دیتا۔

بلاغت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے۔ کہ حسینوں کی جامہ زیبی مرنے کے بعد بھی طرفہ بہار
دکھاتی ہے۔ ایک حسین میّت کے مُنہ پر کفن بھی وہ جوبن وہ بہار دیتا ہے۔ جس کے
نظارے سے دل بے چین ہو جاتا ہے۔ بار بار یہی جی چاہتا ہے۔ کہ دوڑ کر کلیجہ سے
لگا لیجئے۔ مگر میّت کی شان میں یہ گستاخی سوءِ ادب ہے۔ سبحان اللہ کیا اعجاز
بیانی ہے۔ "

اگر یہی اعجاز بیانی ہے۔ تو اللہ پاک اس اعجاز بیانی اور اس شرح سے ہر اُس انسان کو جس
کو قدرت نے ذوقِ سخن عطا فرمایا ہے محفوظ رکھے۔ یہ صرف حضرت یاس کا تخیّل ہے۔ جو
معشوقوں کو مردہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اور ان کے کفن کی تعریف کرتا ہے۔ ورنہ معشوق کے
مر مرنے کے بعد کسی عاشق کو ہوش بھی نہیں رہ سکتا۔ کجا یہ کہ کفن کی جامہ زیبی کا خیال کرے
البتہ بوالہوس سے سب کچھ ممکن ہے۔ کس قدر بے غیرت ہے ایسا شخص جو معشوق کو مرتے
دیکھے۔ اور اُس کے کفن کی جامہ زیبی کو سراہے۔ نہ صرف یہ بلکہ کلیجے سے لگانا چاہے۔ اور اُس
سے چلّو پانی میں ڈوب کر مر نہ جائے۔ ہوسناکی کی یہ انتہائی مثال ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں بدمذاقی اس درجہ پر پہنچ گئی ہے۔ کہ ہر کس و ناکس شاعری
کا ادعا کرتا ہے۔ اور مرزا غالب مرحوم کے مقابلہ میں صف آرا ہونا چاہتا ہے۔ ہمارا ذہن تو
اس قسم کے بے تکے اشعار سے بیجد ابا کرتا ہے۔ اور اگر یاس و یگانہ کے بعض اشعار دوسرے
درجے کے شعراء کی ہمسری نہ کرتے تو اُن کو " خارج از آہنگ " سمجھ کر شاید ہم کو ایک لفظ بھی لکھنے

کی ضرورت نہ ہوتی۔

آپ کے کلام میں نقائص کی کمی نہیں ہے لیکن طوالت کے خیال سے جس قدر لکھا جا چکا ہے۔ اس کو کافی سمجھ کر مزید نکتہ چینی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ عیوب کے ساتھ ساتھ یاسؔ کے کلام کی خصوصیات کا اظہار بھی ضروری ہے۔ عام طور پہ اندازِ بیان قابلِ تعریف ہے۔ کلام کی دلآویزی اور کشش قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ بعض بعض جگہ تخیل معمولی ہے۔ لیکن حسنِ ادا نے شعر کو چمکا دیا ہے اور بعض بعض جگہ دلکش تراکیب اور پروازِ تخیل دونوں مل کر تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ اور یاسؔ کو فطری شاعر ہونے کا خطاب دیتے ہیں

ذیل میں آیاتِ وجدانی سے آپ کے بہترین اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

ہنوز زندگیٔ تلخ کا مزا نہ ملا
کمالِ صبر ملا صبر آزما نہ ملا

بس ایک نقطۂ فرضی کا نام ہے کعبہ
کسی کو مرکزِ تحقیق کا پتہ نہ ملا

سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہگارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا ہر حکم آنکھوں پہ
مگر فرمانِ آزادی بجا لانا نہیں آتا

ہر خوب و زشت آپ ہی اپنی مثال ہے
حدِ کمالِ کاتبِ تقدیر دیکھنا

سنا ہے رنگِ زمانہ کا اعتبار نہیں
بدل نہ جائے یقیں سے کہیں گماں اپنا

خدا کسی کو کبھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے
قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں اپنا

پردۂ غفلت وہی ہے بس نظر کا ذوق ہے
خوابِ زنگار رنگ یا خوابِ پریشاں دیکھنا

ہاں دلِ عاشق مزاج اپنی طرف بھی اک نظر
آئینہ لے کر ذرا چاکِ گریباں دیکھنا

عجب کیا بھول جائے طائرِ خواب آشیاں اپنا
شبِ غم دور کیا ہے راہ کا دشوار ہو جانا

سلسلہ چھڑ گیا جب یاسؔ کے افسانے کا
شمع گل ہو گئی دل بجھ گیا پروانے کا

دورِ آخر میں نہیں کوئی کسی کا آشنا
دیکھتے ہی دیکھتے کیا رنگِ محفل ہو گیا

اک معنیٔ بے لفظ ہے اندیشۂ فردا
جیسے خطِ قسمت کہ پڑھا بھی نہیں جاتا

اشک ٹپکے یا نہ ٹپکے دل بھر آئیگا ضرور
آہ کرنے دیجئے آپ امتحاں ہو جائے گا

عشق کا حسنِ طلب اک معنیٔ بے لفظ ہے
ٹکٹکی بندھ جائیگی مطلب ادا ہو جائے گا

نقشِ باطل ہو چلا خوابِ پریشانِ بہار
دیدۂ حیراں میں کھنچ کر آگئی جانِ بہار

خار و گل دونوں کو اپنے بانکپن پر ناز ہے
دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدانِ بہار

دیکھ لیتا ہوں چمن کو دُور سے دیوانہ وار
یاس مجھ سے کیوں کھٹکتا ہے نگہبانِ بہار

منزل کو اپنے زیرِ قدم جانتے ہیں ہم
اِس توسنِ خیال کی رفتار دیکھ کر

کاش مرا چراغِ زیست قبلِ سحر خموش ہو
آنکھیں نہ جانے کیا دِکھائیں محفلِ یار دیکھ کر

ایسی پلا کہ ساقیا فکر نہ ہو نجات کی
نشہ کہیں اُتر نہ جائے روزِ شمار دیکھ کر

رہے دنیا میں محکومِ دلِ بے مدعا ہو کر
خوشا انجام اُٹھے بھی تو محرومِ دُعا ہو کر

بتاؤ ایسے بندے پر ہنسی آئے کہ غیظ آئے
دُعا مانگے مصیبت میں جو قصداً مبتلا ہو کر

قفس میں بوئے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر
نویدِ ناگہاں پہنچی ہے مرگِ منتظر ہو کر

نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کا دِل دھڑکتا ہے
مبادا رنگ و بُو اُڑ جائے پامالِ نظر ہو کر

فلک کو دیکھتا ہوں اور زمیں کو آزماتا ہوں
مسافر در وطن خانہ بدوشِ رہگذر ہو کر

مبارک نامِ آزادی، سلامت دامِ آزادی
دعائیں دوں کسے یا رب اسیرِ بال و پر ہو کر

عجب کیا وعدۂ فردا پسِ فردا پہ ٹل جائے
کوئی شام اور آ جائے نہ شامِ بے سحر ہو کر

زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر
عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہو کر

زبانِ دل خراش و داستانِ ظلم اُسے توبہ
دہکتا ہے قفس ہنگامۂ زار الاماں ہو کر

خودی کی کیفیت سے چونکتے ہی دیکھتا کیا ہوں
کہ آترا نشۂ ہستی خمارِ جاوداں ہو کر

پیامِ غفلتِ جاوید ہے جلوہ حقیقت کا
سما جائے نہ آنکھوں میں کہیں خوابِ گراں ہو کر

خدا جانے اجل کو پہلے کس پر رحم آئے گا
گرفتارِ قفس پر یا گرفتارِ نشیمن پر

زحمتِ سجدہ ہے فضول بتکدۂ مجاز میں
ہوگی نماز کیا قبول کعبۂ خانہ ساز میں

حُسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں
معنیِ بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

منزل کی دُھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے
شورِ جرس سے دِل نہ رہا اختیار میں

کہتے ہو اپنے فعل کا مختار ہے بشر
اپنی تو موت تک نہ ہوئی اختیار میں

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو
دل میں سوائے یار کسی کا گزر نہیں

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا
کنجِ قفس میں مر رہے یا آشیانے میں

صورت نہ پکڑے جلوۂ بے معنئ حجاب
قطرہ اگر اسیرِ طلسمِ ہوا نہ ہو

احسان کس کا مانئے کس کا نہ مانئے
پردہ میں ناخدا کے کوئی دوسرا نہ ہو

دے کچھ تو دادِ طبعِ ندامت شعار کو
کیا دیکھتا ہے لغزشِ بے اختیار کو

دیدار تو دکھائے کہیں صبحِ منتظر
حاضر ہے سر بھی سجدۂ بے اختیار کو

بیگانہ وار ایک ہی رُخ سے نہ دیکھئے
دنیا کے ہر مشاہدۂ ناگوار کو

سہو و خطا ودیعتِ فطرت سہی مگر
سمجھاؤں کیا ضمیرِ ملامت شعار کو

اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن گُل کھلائیگی
قفس سے چھوٹ کر سر پہ اٹھا لینگے گلستاں کو

مزاجِ حسن بدلے آسماں بدلے زمیں بدلے
سزائے عشق کیا بدلے گی ذوقِ ناپشیماں کو

گناہِ بے حقیقت کو قلم نے کتنا چمکایا
پھڑک اٹھتا ہوں میں جب دیکھتا ہوں فردِ عصیاں کو

اپنی ہستی خود ہم آغوشِ فنا ہو جائے گی
موجِ دریا آپ ساحل آشنا ہو جائیگی

حُسنِ بے تماشا کی دھوم کیا معمّا ہے
کان بھی ہیں نامحرم آنکھ بھی ترستی ہے

خضرِ منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
فکر کی بلندی یا حوصلہ کی پستی ہے

آ رہی ہے یہ صدا کانوں میں ویرانوں سے
کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے

چلتے چلتے تو گلے شمع سے مل بس اٹھ کر
اب سحر ہوتی ہے کہدے کوئی پروانوں سے

آگ میں کود پڑا دل کی لگی وہ شے ہے
آتشِ شوق کو پوچھے کوئی پروانے سے

نظر آئے جب آثارِ جدائی رنگِ محفل سے
نگاہِ یاس بیگانہ ہوئی یارانِ یکدل سے

لپٹتی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے
پلٹ کر اک سلامِ شوق کر لیتا ہوں منزل سے

تصورِ لالہ و گل کا خزاں میں بھی نہیں مٹتا
نگاہِ شوق وابستہ ہے اب تک نقشِ باطل سے

یہیں سے سیر کر لو یاس اتنی دور کیوں جاؤ
عدم آباد کا ڈانڈا ملا ہے کوئے قاتل سے

ہر رات ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

ناخدا کو نہیں اب تک تہِ دریا کی خبر
ڈوب کر دیکھئے تو بیگانۂ ساحل ہو جائے

یہ عیب ہے کہ مٹائے سے مٹ نہیں سکتا
وہ حسن ہے جو سریع الزوال ہوتا ہے

نئی زمین نیا آسماں نئی دنیا
عجیب شے یہ طلسمِ خیال ہوتا ہے

سیکڑوں آوارۂ صحرا نظر آئے مگر
کوئی صورت آشنا بھی صاحبِ محمل کا ہے

خدا پرست ابھی بندے ہیں حسنِ فطرت کے — سمجھ میں آئے نہ راز اس طلسمِ حیرت کے

دور سے اُن کو آج دیکھ لیا — دل کو تسکین ہوئی مگر نہ ہوئی

نگاہِ شوق ہوتی یا نگاہِ واپسیں ہوتی — بہر صورت زبانِ گنگ معنی آفریں ہوتی

جو رو سکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی مل جاتے — شریکِ رنج و غم دامن سے پہلے آستیں ہوتی

ترکِ مطلب سے ہے مطلب تو دعائیں کیسی
صبح تک کیوں دلِ بیمار جگاتا ہے مجھے

جلیل

آپ کا نام جلیل حسن ہے۔ باپ کا نام مولوی حافظ عبدالکریم ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فنِ شاعری میں حضرت امیر مینائی کے شاگرد ہوئے اُس وقت آپ کی عمر بیس سال کی تھی۔ عرصہ تک دفترِ امیر اللغات کے ناظم رہے۔ بعد ازاں اپنے بزرگ اُستاد کے ہمراہ حیدر آباد دکن بھی گئے۔ اور اُن کے انتقال کے بعد وہیں اقامت پذیر ہو گئے۔ حضرت امیر مینائی کے شاگردوں نے آپ کو جانشینِ امیر تسلیم کیا۔ اور اپنے استاد مرحوم کے بعد آپ ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ اور مشورۂ سخن کرتے رہے۔ فارسی اور اُردو کی استعداد اچھی ہے۔ عروض و قوافی میں خاص دخل ہے۔ آپ کو سلطنتِ آصفیہ نے فصاحتِ جنگ کا خطاب بھی عنایت کر دیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جلیل صاحب ایک متین و سنجیدہ بزرگ ہیں۔ اور مزاج میں وہی تہذیب و تقدّس موجود ہے۔ جو آپ کے اُستاد مرحوم میں تھا

کلام پر تبصرہ

آپ کے ایک مختصر دیوان انتخابِ جلیل کے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ گذشتہ دَور کی یادگار معلوم ہوتا ہے۔ وہی خیالات اور وہی اندازِ بیان ہے جو قدیم دلدادگانِ شعر کا تھا یعنی ناسخ اور اُن کے شاگردانِ رشید کا دبستانِ لکھنؤ کی جملہ خصوصیات آپ کے کلام میں پائی جاتی ہیں، رطب و یابس سے پُر ہے۔ قافیہ پیمائی شعر گوئی سے بہتر خیال کی گئی ہے۔ ہر غزل میں اشعار کی تعداد ضرورت سے بہت زیادہ ہے جس شعر کو دیکھئے بھرتی کا شعر نظر آتا ہے۔ اور آدمی بے تتیجہ بھی کچھ کہتا رہے۔ تو ایک ہزار اشعار میں ایک شعر تو کام کا نکل ہی آئے گا۔ افسوس ہے کہ ہماری شاعری نے اِن جیسے اصحاب کے ہاتھوں میں پہنچ کر اپنی کیسی مٹی خراب کی ہے۔

اس دَور کے شعرائے تغزل کے سامنے آپ کا کلام بالکل بے نمک اور بے لُطف معلوم

ہوتا ہے۔ جدت نام کو نہیں۔ رنگِ لکھنؤ کی تقلید اور وہ بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے تعجب ہوتا ہے۔ کہ یہ اصحاب اپنے آپ کو سخن فہم بھی سمجھتے ہیں۔

یہ بات بمنزلۂ اصولِ موضوعہ تسلیم کر لی گئی ہے۔ کہ شاعری، اظہارِ جذبات کا نام ہے۔ اور جس شاعری میں وارداتِ قلب کو نہ بیان کیا جائے۔ وہ شاعری نہیں۔ بلکہ تک بندی ہے۔ اِس لحاظ سے آپ کے اشعار کو دیکھا جائے۔ تو مشکل سے کوئی شعر اِس تعریف کے ماتحت آسکتا ہے۔ ورنہ زیادہ تر رعایتِ لفظی اور دیگر صنائع و بدائع پائے جائیں گے یہ چیزیں عوارض و مستحسنات ہیں۔ لیکن بجائے خود شعر نہیں ہیں۔ اور نہ اُسکی کمی کو پورا کر سکتی ہیں کیا حسبِ ذیل اشعار سے ظاہر نہیں ہوتا۔ کہ اِن کا مصنف واجد علی شاہ کے زمانہ کا شاعر ہے؟۔

زُلف کا عمر بھر رہا سودا　　مثلِ سایہ کبھی جُدا نہ ہُوا

کہتے ہیں پھر رچے گی کیا مہندی　　گر کبھی خونِ مدّعا نہ ہُوا

بولے جھنجھلا کے جب گلا نہ کٹا　　اک مصیبت ہوئی گلا نہ ہُوا

نہ ملا یارِ سروِ قد افسوس　　شجرِ آرزو ہرا نہ ہُوا

اِس آگ کو درکار ہے تلوار کا پانی　　رونے سے تو کم سوزِ نہاں ہو نہیں سکتا

بُرا کیا ہے باندھو اگر تیغ و خنجر　　مگر پہلے اپنی کمر دیکھ لینا

مُنہ دُھونے ہیں کس نے دانت دیکھے　　ہے موتی محل گھر آرسی کا

یہ رات اتنی جو بڑھ گئی ہے سیاہی اتنی جو چڑھ گئی ہے　　کہیں کھلا ہے ضرور جوڑا کسی کے گیسوئے عنبریں کا

بہر حال ہم اِس قسم کی شاعری کے ہرگز مدّاح نہیں ہیں۔ اور خدا کا شکر ہے۔ کہ لکھنؤ کے اصحابِ فہم بھی اِس قسم کی شاعری کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔ جلیل جیسے اصحاب پرانے بزرگوں میں ہیں۔ اور بقول مرزا غالب:۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو　　جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

آپ کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آپ نے اپنے کلام کی بنیاد صرف زبان پر رکھی ہے۔ اور اِس کی مطلق پروا نہیں کی کہ کوئی مضمون بھی ہاتھ آتا ہے یا نہیں۔ شعر بھی شعر کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں۔ فرماتے ہیں

مضمون تازہ ہو کہ نہ ہو لیکن اے جلیل　　ایسا کہو کہ حرف نہ آئے زبان پہ

لہٰذا آپ کے کلام میں اگر کچھ لطف ہے۔ تو صرف زبان کا۔ چند اشعار بطورِ نمونہ نقل کئے جاتے ہیں

اچھی کہی دل میں نے لگایا ہے کہیں اور — یہ عیب ہو کہ تم سا ہو زمانے میں حسیں اور

کل شیخ کو میخانہ میں اس حال سے دیکھا — دستار کہیں جبہ کہیں آپ کہیں اور

لاکھوں تڑپ کے مر گئے تیور وہی رہے — قربان جائیے تری اس آن بان پر

رکھوں چھپا کے یوں گُلِ داغِ جگر کو میں — آئے تو وصل ہوا بھی نہ بادِ سحر کو میں

رعایتِ لفظی کی مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:-

تم نے زلفوں کو بنا کر ہمیں دیوانہ کیا — کیا بگڑتا تھا تمہارا نہ بنایا ہوتا

بیڑیاں زلفوں کی دیوانوں کو پہنانا تھا — قید خانہ کو پری خانہ بنایا ہوتا

عارض و ابرو و خال آپ کے کیا چمکے ہیں — مہر بن کر مہِ نو بن کے ستارا بن کر

پڑھ گیا حسنِ سماعت سے مرے شعر کا حسن — کان ہیں اُن کے بڑا کان کا بالا بن کر

کرامت نام اس کا ہے اسے اعجاز کہتے ہیں — سنائیں تلخ باتیں یار نے شیریں زباں ہو کر

بیمارِ چشمِ یار کو شاید مفید ہو — پوچھیں کسی طبیب سے بادام کے خواص

کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ والوں کے یہاں نوحہ خوانی کے مضامین بکثرت ہیں۔ آپ کا کلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:-

کلیجہ چاہیئے عشاق کی تربت پہ آنے کو — وہ بیٹھے فاتحہ خوانی کو اُٹھے نوحہ خواں ہو کر

زیرِ لحد چمکتے نہیں میرے داغِ دل — منہ پھیرے نفس رہی ہے نہیں آسماں پر

ہمیں وہ ہیں کہ مر کر بھی نہ چھوٹے بےقراری — کبھی ہے لاش مدفن پہ کبھی ہے لاش مدفن میں

تھکا ہوا ہوں نکیرین سے کہو دم لیں — ابھی نہیں میں سوال و جواب کے قابل

تمہارے ناتواں پر کیا لحد میں سختیاں ہوتیں — فرشتے آئے لیکن خاک کچھ پایا نہ مدفن میں

آپ کے یہاں رکیک اشعار بکثرت ہیں۔ مثلاً چند شعر لکھتا ہوں:-

یہ رات ہے وصل کی مری جاں بھرے ہیں دل میں ہزار ارماں — نہیں نہ نکلے زباں سے یار ہاں اب یہ موقع نہیں نہیں کا

تم گل سے گال قبر پہ رکھتے تو بات تھی — کیا فائدہ جو پھولوں کا انبار کر دیا

پڑھتے جب نیل لب پر میرے بوسوں کے تو فرمایا — یہ کیا کرتے ہیں آپ اس لال کو لالہ بناتے ہیں

نمودِ سبزۂ رُخ پر سکوت اُن کو ہوا — یہ خط وہ آیا ہے جس کا کوئی جواب نہیں

ذیل میں آپ کے کلام سے بہترین اشعار درج کئے جاتے ہیں:-

کلیم طور پہ جانے کی کیوں کریں تکلیف — کہو کہ دیکھ لیں آکر جمال احمد کا

غم دیا تم نے داغ ہجر دیا
سچ ہے کیا کیا تجھے عطا نہ ہوا

جان لینے کی تھی ادا کیا کم
میں تو منت کش قضا نہ ہوا

یا رب کچھ اس انداز سے نالاں ہو مرا دل
وہ بھی یہ کہیں ضبطِ فغاں ہو نہیں سکتا

در پردہ گری برقِ نظر خرمنِ جاں پر
وہ آگ لگی جس میں دھواں ہو نہیں سکتا

حق نے پیدا ہی تجھے ایسا کیا
جس نے دیکھا بس تجھے دیکھا کیا

غیر شاکی ہو تو ہو وہ غیر ہے
تم نے کس دل سے مرا شکوا کیا

مرے جذبۂ دل کا اثر دیکھ لینا
تم آؤ گے تھامے جگر دیکھ لینا

فغاں میں درد، دعا میں اثر نہیں آتا
جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا

لکھا ہے نخلِ تمنا کی پتی پتی پر
یہ وہ نہال ہے جس میں ثمر نہیں آتا

شرابِ عشق کی مستی عجیب مستی ہے
گیا جو ہوش تو پھر عمر بھر نہیں آتا

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
جلیل شعر کا فن عمر بھر نہیں آتا

یہ رنگ گلاب کی کلی کا
نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا

بلبل کی بہار میں نہ پوچھو
منہ چومتی ہے کلی کلی کا

کچھ بول کے اس نے باغ میں آج
منہ بند کیا کلی کلی کا

منہ پھیر کے یوں چلی جوانی
یاد آ گیا روٹھنا کسی کا

جوش ہوا ایسا کہ میں آپے سے باہر ہو گیا
یار کا ملنا نہ ملنا سب برابر ہو گیا

کی جفا تم نے تو معشوقوں کو زیبا ہے جفا
آسماں کو کیا ہوا یہ کیوں ستمگر ہو گیا

ادھر صبا نے یہ گل کھلایا چمن میں کلیوں کو گدگدایا
ادھر کسی نے ستم یہ ڈھایا کہ تشنہ لب ہی چمن [illegible]

جو دیکھ لے اس کی صورت انساں اگر ہو کافر تو لائے ایماں
جمال کیا ہے بت حسیں کا کمال ہے صورت آفریں کا

کوئی حسیں ہو مجھے اک نگاہ کر لینا
جگر کو تھام کے چپکے سے آہ کر لینا

کھلا یہ حشر میں منظور اس کو خود نمائی تھی
دکھانے کو یہ پردہ ڈال رکھا تھا قیامت کا

خدا ہی ہے جو منہ کھلنے پہ کوئی زندہ رہ جائے
نقابِ رخ پہ آئی ہے کہ پردہ ہو قیامت کا

تم اگر پھر تو دیکھو ہمارے دیدۂ تر کی
کہ موتی ہیں لیے رہتا ہے آنچل [illegible] محبت کا

یار تک پہنچا دیا بیتابیِ دل نے ہمیں
اک تڑپ میں منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

آنکھیں دکھا کے اور ہی عالم دکھا گیا
اک مست تجھ کو بنا پیالہ پلا گیا

کہتا ہے نازِ حسن یہ اُن سے دمِ خرام — رکھیے قدم زمین پہ دماغ آسمان پر

کرتے ہیں گلہ چرخ سے غنچے بھی چٹک کر — برہم زنیِ صحبتِ احباب کہاں تک

موسیٰ پہ ہے اسے جلوۂ جاناں عبث الزام — بجلی جو گرے لائے کوئی تاب کہاں تک

رہنے دو جلیل اب کوئی سنتا نہیں اس کو — افسانۂ دردِ دلِ بیتاب کہاں تک

کچھ اور وہ تڑپا گئے یوں دے کے تسلی — بیتابیِ دل اے مرے بیتاب کہاں تک

انہیں رخصت ہوئے مدت ہوئی پھر بھی نہیں اب تک — گلے مل کر وہ کہنا تو خدا حافظ ہے جاتے ہیں

ہنسے دیتے ہیں قاتل کی ادا پر " — کہیں پھر منہ نہ زخموں کے سئے جائیں

حسیں ہیں کیسے کیسے نرم نازک — یہ پھول آنکھوں میں چٹکی لے کے سلتے جائیں

بادِ بہار کان میں کیا چھو کے کہہ گئی — پھولے نہیں سماتے شگوفے نہال ہیں

جو تڑپانے کی باتیں تھیں وہ ہیں سب انکی چتون میں — اثر آئے تو اب آئے کہاں سے تیرے شیون میں

چمن میں آشیاں تو باندھتے ہیں سب — مزا جب ہے کہ اسے بجلی ہوا باندھ جائے گلشن میں

گریباں چاک پھولوں کو جو دیکھا ہم نے پہچانا — ترے وحشی ہوا کھانے نکل آئے ہیں گلشن میں

بہار دیتا ہے چمن چمن کے نورِ چہرہ کا — سرِ نقاب ہے جو کچھ ترا نقاب نہیں

جلیل سے بھی ملو گے تو خوش بہت ہو گے — خراب حال تو ہے آدمی خراب نہیں

دل میں سکت نہیں کہ وہ اشکوں کو روک لے — الزام کہیں نقص پہ دوں چشمِ تر کو میں

اچھا نہیں کہ ہو رخِ محبوب بے نقاب — پردہ اٹھے تو ڈال دوں اپنی نظر کو میں

غنیمت ہے جو پہلو میں دلِ ناشاد باقی ہے — ابھی اس میں خدا رکھے کسی کی یاد باقی ہے

مٹے جھگڑا کہیں یہ بھی نصیبِ یاس ہو جائے — جو تھوڑی سی تمنا ہے دلِ ناشاد باقی ہے

مسل کر رکھ دیا ہاتھوں نے دل کو غربت میں — کہیں منہ سے یہ نکلا تھا وطن کی یاد باقی ہے

پوچھتا ہے جو کوئی حالِ دلِ بسمل کا — آنکھ سے خون کی اک بوند ٹپک جاتی ہے

قتلِ عشاق کو ہر چند زمانہ گزرا "
دستِ قاتل سے ابھی خون کی بو آتی ہے

جوش

شبیر حسن خاں نام، جوش تخلص ہے۔ ملیح آباد ضلع لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ نواب فقیر محمد خاں گویا کی اولاد میں سے ہیں۔ جو شاہی زمانہ میں افواج اودھ کے رسالدار تھے۔ اور حسام الدولہ تہور جنگ کے خطابات سے مخاطب تھے۔ جوش کے باپ اور دادا بھی شاعر تھے اور صاحب دیوان تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جوش نے نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ عجب نہیں کہ ایسا ہوا ہو۔ اس عمر میں تک بندی ہو سکتی ہے اس کو شعر کہنا غلطی ہے۔ کیونکہ شعر تو آدمی سن رشد کو پہنچ کر بھی کہنے لگے تو بڑی بات ہے۔ ابتداء میں جوش نے عزیز لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ اور یہ سلسلہ چار سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد خود اپنے کلام کو نظر غور و تعمق سے دیکھنے لگے۔ اور کسی استاد کی اصلاح ضروری نہ سمجھی

جوش نے گھر پر اردو فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر انگریزی سیکھنے کے لئے سیتا پور اسکول، جوبلی اسکول لکھنؤ کے علاوہ سینٹ پیٹرز کالج آگرہ اور علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے اور پڑھتے رہے۔ لیکن تکمیل کہیں کسی بات کی نہ کر سکے۔ مقدمہ نگار "نقش و نگار" نے صاف نہیں لکھا۔ لیکن مطلب یہی ہے کہ حضرت جوش میٹرکولیشن بھی پاس نہیں ہیں۔

۱۹۲۴ء میں حیدر آباد دکن کے دار الترجمہ میں ملازم ہو گئے اور ۱۹۳۴ء تک اس خدمت پہ مامور رہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کی علمی صحبتوں کی بدولت جوش میں بالغ نظری پیدا ہو گئی ہے روح ادب، حیدر آباد جانے سے قبل ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہاں سے واپس آکر دہلی سے "کلیم" ایک ماہوار ادبی رسالہ بھی جاری کیا۔ اور اپنے کلام کے دو مجموعے "نقش و نگار" اور "شعلہ و شبنم" بھی شائع کئے۔ ایک اور مجموعہ فکر و نشاط کے نام سے حال ہی میں چھپ کر اہل ذوق و شوق کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔

افسوس ہے مقدمہ نگار مذکور نے جوش کی تاریخ پیدائش نہیں لکھی۔ لیکن "مختصر تاریخ ادب" میں لکھا ہے۔ کہ آپ ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے آپ کی عمر پچپن برس کی ہوئی

راقم الحروف نے حضرت جوشؔ کو بیسیوں کئی بار دیکھا ہے۔ اور خود اُن کے کلام کو اُن کی زبان سے سُنا ہے۔

بہرحال مقدمہ نگار کی رائے میں "جوشؔ اصطلاح صوفیا میں سچے رند ہیں اور رندانہ مسلک ہونے کے باوجود اُن کی روح معصوم ہے۔" کلام سنانے میں تکلف و تصنع روا نہیں رکھتے، اور آگے پیچھے پڑھنے کا رکیک جذبہ اُن میں کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ مزاج میں فیاضی اس قدر اور دل اتنا غنی رکھتے ہیں کہ آبائی ورثے اور جائداد کا بہت بڑا حصہ عزیزوں کو دے بیٹھے بیسیری نرکے ہیں ملی ہے۔ اور شرافت و مروت کا احساس ان کی نظم "آتے ہوئے جھگڑے" سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔ سخت زود آشنا ہیں اور آزادہ روی کا یہ عالم ہے کہ نئے پرانے احباب میں فرقِ مراتب کم رکھتے ہیں یا ایسے کہ رکھ نہیں سکتے۔ لاابالی پن کا یہ حال ہے کہ اُن کے دوستوں کو اُن کے متعلق بعض وقت "آنکھ سے دور دل سے دور" کا شبہ ہونے لگتا ہے۔" خیالات کا رجحان زیادہ تر دہریت کی طرف ہے لیکن حقیقتاً پکے شیعہ ہیں، اگرچہ آباؤ اجداد سنی المذہب تھے۔

کلام پر تبصرہ

بعض لوگ مذاقِ شعر نہیں رکھتے۔ لیکن اُن کو علمی طور پر شعرائے جلیل القدر کے نام معلوم ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے ایک آدھ سطر اُن کے موضوعِ کلام کے متعلق پڑھ لی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے دوست یا دل پسند شاعر کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اُس کو اُن کی صف میں ممتاز جگہ پر بٹھا دیتے ہیں اُن کو ہرگز یہ کہنے میں باک نہیں ہوتا کہ "دنیا میں جتنے الہامی شاعر ہوتے ہیں، سب اپنا ایک مستقل پیام لے کر دنیا میں اُس کی تبلیغ کے لئے آئے تھے، حافظ، عمر خیام، غالب، ٹیگور، اکبر وغیرہ کل پیمبرانِ سخن اپنے اپنے پیام (فلسفۂ حیات) کو دنیا کے کانوں تک پہنچا چکے ہیں۔ جوشؔ کے الہامی شاعر ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ . . . . ایک مستقل پیام کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں"۔ یہ "روحِ ادب" کے ایک نقاد[1] کے الفاظ ہیں۔ جبکہ جوشؔ کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس ۲۵ سال ہوگی۔ ایک صاحب نے اُسی زمانہ میں "نقد التنقید" کی ضرورت محسوس کی چنانچہ وہ رقمطراز ہیں :-

"میں روحِ ادب پر کوئی تنقید کرنا نہیں چاہتا۔ ایسی بے جا کاوشوں کے لئے وقت چاہئے

---

[1] محمد شبیر اقبال الہ آبادی علی انصاری مرحوم بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل۔

اور وہ وقت جو اہم مسائل کے نقد و بحث میں صرف نہ کیا جاسکے۔ البتہ "نقد التنقید" کی ضرورت محسوس کرتا ہوں، اور صرف اس غرض سے کہ مذاقِ عامہ گمراہ نہ ہونے پائے۔ عبد الماجد صاحب کی گمراہ کن تنقید سے مرعوب ہو کر بہت سے نادان جوشؔ کو غالبؔ اور اقبالؔ کی طرح "الہامی شاعر" اور "ترجمانِ حقیقت" سمجھتے ہیں۔ ایسی غلط فہمیاں اندیشہ ناک ہیں۔ خیالات کا توازن اگر اسی طرح بگڑتا رہا، بلند و پست کا معیار فنا ہو جائیگا"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ شاعری پر تنقید کے لئے صرف ذوقِ صحیح کی ضرورت ہے، فلسفۂ خشک فلسفۂ تر کی صحیح تنقید نہیں کر سکتا۔ یہی باعث ہے کہ مؤلف "فلسفۂ جذبات" رموزِ شاعری سے ناآشنا رہتا ہے"۔ . . . عمر خیام کے پیام سے نیاز کو جوشؔ کے پیام سے وہی نسبت ہے جو فرشتوں کی حمد و تسبیح کو ایک گنہگار انسان کی "ہرزہ سرائیوں" سے" عبد الماجد صاحب شاکی ہونگے۔ کہ میں نے اپنے دعوے کی کوئی دلیل نہیں پیش کی، مذاقِ لطیف میری پہلی اور آخری دلیل ہے"۔ اس کے بعد سجاد علی مرحوم لکھتے ہیں کہ . . . "جوشؔ کی شاعری فلسفیانہ نتائج سے بری ہے۔ انہوں نے فلسفہ طرازی کی جد و جہد میں اکثر حسنِ خیال اور حسنِ اظہار کا لحاظ نہیں رکھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہر ناسب میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ میر انیس سے مقابلہ کرنا چاہا ہے۔ "نیچرل شاعری" پر بھی طبع آزمائی کی ہے، خلاصہ یہ کہ شاعری کی ہر مملکت کو فتح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مصرع

"عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا" "ان تمام معرکہ آرائیوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلا"

میں یہ نہیں کہتا۔ کہ جوشؔ کی شاعری قطعاً ناقابلِ توجہ ہے۔ میں تو اس مبالغہ کا شاکی ہوں جس نے جوشؔ کو ان کی سطح سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ جس سطح پر تھے ان کو وہیں رہنے دیا جاتا۔ ایسی تنقید جس سے مذاقِ عامہ کی گمراہی کا اندیشہ ہو، بذاتِ خود ایک جرم ہے" "بلاشبہ جو لوگ حسِ تناسب نہیں رکھتے۔ اور توازن کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ ان کو میدانِ تنقید میں قدم نہیں رکھنا چاہئے۔ کیا جوشؔ کو ایک بلند پایہ شاعر صرف اس لئے مان لیا جائے۔ کہ حضرت اکبر مرحوم نے ان کی مدح سرائی کی ہے؟ بقول سجاد علی مرحوم "اگر کسی بدصورت کو کوئی حسین عورت خوبصورت کہہ دے، عبد الماجد صاحب کی اس منطق کا اصرار ہوگا۔ کہ اُسے خوبصورت مان لینا چاہئے"۔ . . . "روحِ ادب" کی اشاعت کے بعد "مخبرِ خیال" کے مصنف نے حضرت اکبر کو ایک خط لکھا جس کا ایک جملہ یہ بھی تھا "جناب نے جوشؔ کی مدح و ستائش میں انتہائی مبالغہ کو دخل دیا ہے۔ خدا کرے یہ سب کچھ آپ نے ظریفانہ انداز سے لکھا ہو۔ یا محض حسنِ اخلاق،

کے اصرار پر۔ ورنہ ہر اُس شخص کو افسوس ہوگا جو آپکے ایسے نکتہ سنج قلم کو ایسی غیر ذمہ دارانہ جنبشوں میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔" اس کے جواب میں اکبر مرحوم لکھتے ہیں کہ ۔ ۔ ۔ "خدا جانے کیا دیکھا، کیا سمجھا، کیا لکھ گیا ۔

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم — گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

رنگِ تصوف مجھے پسند ہے۔ وہ کوشش بہتری کی کرتے ہیں ۔

شیخ کی منطق بنا چشمِ فسوں سازِ بتاں — سیدھا سادہ ہوں مجھے گمراہ ہو چاہے کیسے

وہ میرے عنایت فرما ہیں، میں اُن کا خیر طلب ہوں۔ خاموش رہیے۔ اللہ اللہ کیجیے۔ خدا ہم سب کی عاقبت بخیر کرے۔" یہ عبارت کسی تشریح کی محتاج نہیں۔"

العرض یہ سفارشات کا طریقہ (ہم کسی اور جگہ بھی لکھ چکے ہیں) نہ صرف مذموم ہے۔ بلکہ گمراہ کُن بھی ہے۔ پبلک کو خود موقع دینا چاہیئے۔ کہ وہ کسی شاعر یا مصنف کی بابت اپنی رائے کا اظہار کرے۔ دوستوں اور بزرگوں کے دیباچوں، مقدموں، تبصروں اور تنقیدوں سے احتراز کیا جائے۔ تاکہ اُن کے کلام یا تصنیف کے متعلق صحیح رائے قائم ہو سکے۔

صاحب محشر خیال فرماتے ہیں:- "پیام کی اہمیت، جس کی بنا پر جوش کو الہامی شاعر کا گراں مایہ خطاب عطا کیا گیا ہے۔ غور طلب ہے۔ ۔ ۔ ۔ خیالات زریں، دنیا، طوفان بے ثباتی وغیرہ کے عنوان سے دنیا کی بے ثباتی کا فلسفہ بندشوں کی دلآویزیوں سے محروم، طرز ادا کی جدتوں سے بے بہرہ، ایک خشک، غیر دلچسپ اور غیر شاعرانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس پر ستم ظریفی کہ عمر خیام اور جوش کا نام ایک ساتھ لیا جاتا ہے! اگر اسی پیام کی تبلیغ معیار شاعری قرار دی جائے تو زہر عشق کا مصنف بھی ایک الہامی شاعر تھا۔"

"صحیح معنوں میں شاعر وہی ہے جو فلسفۂ حیات اور حقائق عالم کو اس طرح نظم کر دے کہ ہر حقیقت لطیفہ بن کر روحِ انسانی میں محو ہو جائے۔ ساز حقیقت کی ایک موج ترنم ہے اسے شاعری کہئے یا موسیقی، مفہوم ایک ہی ہے۔ جو شاعر فلسفۂ لطیف سے محروم ہے، وہ شاعر ہی نہیں۔ شاعر کسی لطیف خیال کو نظم کرے۔ یا بادۂ کہنہ کو ساغر نو میں پیش کرے۔ اگر ان دونوں میں سے ایک خصوصیت بھی نہ ہو، تو شعر کہنا ایک ناقابل عفو جرم ہے، جس کی سزا مذاقِ صحیح کی بے اعتنائی کے ذریعے سے ہونی چاہیئے۔"

سخن ہائے گفتنی کے عنوان سے "نقش و نگار" کے مقدمہ نویس لکھتے ہیں۔ "جوش کی شاعری

کی ابتدا تقلید سے ہوئی جب اُن کے اشعار میں تصوّف کی جھلک زیادہ ہوتی تھی . . .
"روحِ ادب" میں ایسا کلام بھی بہت ہے۔ جو جوشؔ کی آیندہ شاعری کی عظمت و بلندی کا نشان دہ
ہے۔"

۱۹۲۰ء کی تنقیدِ "روحِ ادب" اور ۱۹۳۶ء کے مقدمہ "نقش و نگار" میں کس قدر بُعد ہے
اوّل الذکر ابتدا کو انتہا اور ثانی الذکر ابتدا کو انتہا کا صرف نشان دہ بتلاتا ہے گیا اب بھی تنقید نگار "روحِ ادب" کو
کسی مزید تنبیہ کی ضرورت باقی ہے؟

"نقش و نگار" کا نگار خانہ دیکھنے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ ہمارے قصرِ تغزل کو جوشؔ کے
نگار خانے سے وہی نسبت ہے۔ جو بلبل کو بھونرے سے ہے۔ کہاں بلبل کی نغمہ سرائیاں اور کہاں
بھونرے کی گونج۔ لیکن خیال یہ تھا کہ لوگ تغزل کو خیرباد کہہ کر جس نوعِ شاعری کی ہمارے
یہاں کمی ہے۔ اس کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اب معلوم ہوا۔ کہ تغزل کے دلدادہ کسی
نہ کسی طرح اپنے دل کا بخار نکالنے کے لئے نیچرل شاعری کو بھی زیرِ بارِ احسان کرنے سے باز نہ
رہیں گے جو خیالات "نگار خانہ" میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ اُردو نظم کو اس بارِ گراں سے
مرہونِ منت نہ کیا جاتا۔ ان سب نظموں میں "اشکِ اولیں" غنیمت ہے۔ ورنہ ہر نظم ایسی ہے
ہے۔ جس کو پڑھنے کی زحمت نہ دی جائے۔ یہ کیا شاعری ہے؟"

"جھڑانی اک نظر آئی تجھے کل راہ میں"

بیا

اللہ کرے وہ صنم دشمنِ ایماں   مجھے کسی شب جوشؔ کے پہلو میں دو بانا

بیا

ہائے یہ کافر مناظر جوشؔ میں رکھتے نہیں   جوشؔ ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ جوشؔ ایک فطری شاعر ہے۔ اس کی شاعری کسی باغ کا خوشنما
پودا نہیں ہے۔ بلکہ ایک جنگل کا درخت ہے۔ یعنی اس کی شاعری کی تربیت کسی باغبان کی گلکاری
نے نہیں کی۔ بلکہ وہ ایک خودرو پیڑ کی طرح ہے۔ اُس کی شاخیں آسمان کی فضا میں پھیلی ہوئی ہیں
اُس کی جڑیں زمین کے اندر دھنس گئی ہیں۔ وہ ایسے [illegible] سپید [illegible] شجرِ سایہ دار
ہے۔ ممکن ہے کہ بادِ مخالف کبھی وقت اُس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے لیکن اس وقت وہ اپنی
شادابی کی بدولت قائم ہے۔ وہ رس جو اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ ممکن ہے آیندہ چل کر کم ہو

کی وجہ سے خشک ہو جائے۔ اور یہ ہرا بھرا درخت کھوکھلا ہو کر کسی طوفانِ باد کی نذر ہو جائے۔

الفاظ کے استعمال میں بے پروائی۔ خیالات کی دوڑ دھوپ احساساتِ قلب کی فراوانی جوشؔ کے لاابالی مزاج کی غماز ہیں۔ وہ ہرگز یہ خیال نہیں کرتا، کہ بعض الفاظ متروک ہو چکے ہیں۔ ان کو نظم نہ کیا جائے۔ مثلاً انکھڑیاں یا کیجے بجائے کیجئے ع

سعیٔ اخفائے حقیقت میں نہ کیجے اہتمام

یا توکہے بجائے گویا ع

تو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

کھڑا۔ واں بجائے وہاں وغیرہ۔ جب سے ان صاحبان کو یہ علم ہو گیا ہے۔ کہ الفاظ کا فصیح و غیر فصیح ہونا اُن کے استعمال و عدم استعمال پر منحصر ہے۔ یہ حضرات متروک الفاظ کو از سرِ نو جاری کر رہے ہیں۔ اور اس بات سے سمجھتے ہیں۔ کہ زبان میں وسعت ہو گی۔ اگر یہ اصحاب ایک لمحہ کے لئے غور فرمائیں کہ ان الفاظ کے ترک کرنے کی بھی کوئی وجہ ضرور ہے۔ تو شاید ان میں یہ جذبہ نہ پیدا ہو۔ کہ ہر متروک لفظ کو استعمال کیا جائے۔

بعض تراکیب اور بعض الفاظ جوشؔ کے خود ساختہ ہوتے ہیں۔ اکثر صفات ان کی اپنی ہوتی ہیں۔ اردو اُن کے سمجھنے سے عاری ہے۔ مثلاً ایک نظم میں جو شعر کی تنقید کے متعلق ہے اور ایک صاحب کے نزدیک اس میں سجاد علی انصاری مرحوم سے خطاب ہے۔ ایک شعر ہے

نطق سے خدمت کبھی ممکن نہیں جذبات کی ۔۔۔ یہ نوک تفسیر ہے باریک محسوسات کی

"باریک محسوسات" عجیب بے معنی ترکیب ہے۔ اس جگہ "نازک محسوسات" یا کوئی اور صفت آتی تو بہتر ہوتا۔ لیکن فکر و نشاط میں شعر کو خارج از آہنگ کر دیا گیا ہے۔

"کھو کھلے نغمے" نئی ترکیب ہے جس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ شعر

جن کے جاں پرور اثر سے دل ہیں سینے کے ہرے ۔۔۔ کھوکھلے نغمے ہیں وہ الفاظ میں جکڑے ہوئے

ع "شاعری کا خانماں لفظوں کا ہے ٹوٹا ہوا"

کیسا بھونڈا مصرع ہے۔ دو جگہ "کا کا" اس طرح اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اور تعقید کی وجہ سے مطلب سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ اب شاعر نے اس کو اس طرح بدل دیا ہے۔

"شاعری کا خانماں ہے نطق کا لوٹا ہوا"

نظم سرِ شام میں ایک شعر ہے:۔

جب موجِ ہوا ہیں نفسِ شام کی بُو آئے　　　حسرت ہے کہ اُس وقت مرے سامنے تو آئے

اس موقع پر حسرت کی بجائے "آرزو" ہونا چاہئے۔ کیونکہ "حسرت" مایوسی کے موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ اور یہاں "خواہش" مراد ہے۔ جو ممکن ہے۔ پوری ہو جائے۔

اداؤں کا پہلو بدلنا، نگاہوں کا کروٹ لینا۔ ہوا کی لو کا تھرتھرانا۔ یہ سب قوتِ بیان کی جدّت ہے۔ اور قابلِ تعریف ہے لیکن حدِ اعتدال سے بڑھ کر یہی خوبی ذم کا پہلو اختیار کر لیتی ہے مثلاً ع

"قمر کے خواب آفریں جہاں میں دکنے والا ہے مہرِ تاباں"
جھکا رہا ہے نظر دھندلکا، سحر نگاہیں اُٹھا رہی ہے

مہرِ تاباں کی صفت "چمکنا" ہے نہ کہ "دکنا" "دکنا" روزمرہ کے خلاف ہے۔ جو چیز آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ اُس کی آب و تاب کو "دمک" کہہ سکتے ہیں۔ مگر جس چیز پہ نظر نہیں ٹھہر سکتی۔ یا اُس کو دیکھ کر آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ اس کے لئے "چمکنا" استعمال ہوتا ہے۔ جھکا رہا ہے نظر "دھندلکا" کے معنیٰ شرمانے کے ہو سکتے ہیں۔ مگر غائب ہونے کے نہیں ہو سکتے۔ جو یہاں مراد ہیں۔

"گھنیری زلفیں" ع

"سنک سنک کر ہوائے عشوہ گھنیری زلفیں ہلا رہی ہے"

"گھنی زلفیں" ہونا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے خود دوسری جگہ باندھا ہے۔ ع

"اور آنچل پہ گھنی زلفیں ہیں لہراتی ہوئی"

آپ کا شعر ہے ؎

ہائے یہ کھنچتی ہوئی نوعمر جامن والیاں　　　عاقبت اندیش دہقانوں کی سمجھائی ہوئی

آپ نے واحد اور جمع کا بھی فرق اُڑا دیا۔ "سمجھائی ہوئی" کے بجائے "سمجھائی ہوئیں" ہونا چاہئے۔ اور اس ترمیم سے ردیف بدل جائے گی۔

"یکایک کھنچ گیا دل میں تخیّل کچھ ادائی کا　　　لبوں پر آچلا کچھ کچھ تبسّم دلربائی کا"

کچھ ادائی کا تخیّل کھنچ گیا خدا جانے جوش نے کیا مراد لی ہے۔ یہ ایک فطری شاعر کے لئے غیر فطری اندازِ بیان تعجب خیز ہے۔

یہ اُبلتی عورتیں، اِس چلچلاتی دھوپ میں　　　سنگِ اسود کی چٹانیں، آدمی کے رُوپ میں

معلوم نہیں اُبلتی عورتیں کس مطلب کو ظاہر کرتی ہیں

الاماں آنکھوں کی نیم افسردہ سی افسوں گری　　　ایک دُھندلا سا تبسّم، اک تھکی سی دلبری

خدا جانے تھکی سی دلبری سے کیا مراد ہے

پہلو میں کچھ اس طرح مچلتی ہے تمنّا   آغوش میں لے جائے ہوئے بن نہیں پڑتا

"لے جاتے ہوئے" کی بجائے "بن جاتے ہوئے" ہونا چاہئے۔ کیونکہ "بے" فارسی علامت نفی ہے اور "بن" ہندی۔ ہندی لفظ کے ساتھ اگر ہندی علامت نفی بھی ہو۔ تو زیادہ اچھا ہے

"ان دنوں کی ایک ہی شب لے جوانی پھیرتے"

پھیرنا، دیہاتی زبان ہے جس کے لکھنے کا آپ کو بہت شوق معلوم ہوتا ہے۔ ع

لے داغ جب زمیں ہو اور آسمان کورا

یہاں کورا کی بجائے صاف ہونا چاہئے تھا

"شعلۂ و شبنم" میں بھی یہی حال ہے۔

صفحہ ۷۴ رنگ و بو میں گھانس غلط لفظ ہے۔ گھاس ہونا چاہئے۔ مگر آپ نے گھاس کو سانس کا قافیہ باندھ دیا ہے۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کہتے ہیں :۔

اتفاقاً ایک پودا اور گھاس   باغ میں دونوں کھڑے ہیں پاس پاس

صفحہ ۷۴ رنگ و بو میں، خوابناک کی ترکیب غلط ہے۔ خواب آلود صحیح ہے۔ صفحہ ۴۳ رنگ و بو میں بے اماں کو بے پناہ کی جگہ استعمال کیا ہے۔ جو ہمارے روز مرہ کے خلاف ہے۔ صفحہ ۱۰ رنگ و بو، ع   "صیاد کمینوں میں ہیں ناوک ہیں کماں ہیں"

کمیں کی بجائے کمینوں استعمال کیا ہے۔ جو بالکل غلط ہے۔ کمینوں کے معنے رذیلوں کے ہیں۔

غالب فرماتے ہیں :۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں   گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

ع   اب تک رسنِ سبحہ و زنّار نہ چھوڑی

رسن غلط ہے، رشتہ ہونا چاہئے

صفحہ ۶۹ ع   رکھ رہا ہوں بولتے ذرّوں پہ رک رک کر قدم

ذرّوں کے لئے بولنا استعمال کرنا غلط ہے۔ کیونکہ چلنے میں کنکر، کوڑا کرکٹ پاؤں کے نیچے آجانے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ لیکن "ذروں" سے آواز پیدا نہیں ہوتی۔ صفحہ ۷۰، ؂

مرد ہی ہوتے تو کرتے بیکسوں کا احترام   مرد ہی ہوتے تو رہ سکتے تھے یوں بنکر غلام

"ہی" کی بجائے "گر" ہوتا تو بہتر ہوتا۔ صفحہ ۷۲، ع

"کانپی نگاہ، رونگٹے سب چھن سے ہو گئے"

رونگٹے کا چھن سے ہونا آپ ہی کی ایجاد ہے۔ رونگٹے کھڑے ہونا بولا جاتا ہے۔ صفحہ ۷۷، سے

جا بجا سے پیڑیاں دیوار کی چھوٹی ہوئی — دھنیاں گنتی کی تھیں ان میں بھی کچھ ٹوٹی ہوئی

پہلے مصرعہ میں "سے" زائد ہے۔ دھنیاں معلوم نہیں کسے کہتے ہیں۔ چھوٹی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی کی بجائے چھوٹی ہوئیں اور ٹوٹی ہوئیں ہونا چاہئے۔ صفحہ ۲۴، رنگ و بو کوندا بے معنی لفظ ہے

ع — ہاں لپک اٹھا وہ کوندا سا دل سرشار میں

صفحہ ۲۵، رنگ و بو — اے گلابی گھٹاؤ ساون کی

گھٹاؤ کی بجائے گھٹا ہونا چاہئے۔

صفحہ ۲۵، رنگ و بو" "دیکھ پروائی دل نہ کمھلا جائے"

پروائی عوام کی زبان ہے۔ فصحا پروا ہوا بولتے ہیں۔

صفحہ ۳۵، رنگ و بو" بوندیوں کی جگہ بوندوں ہونا چاہئے۔

صفحہ ۵۰، رنگ و بو" دوزخ نکالے گا زباں کی بجائے دوزخ نکالے گی زباں ہونا چاہئے، دوزخ مونث ہے نہ کہ مذکر۔

صفحہ ۵۸، رنگ و بو" سن کے تیرا نام اجڑ جائے گا بوڑھوں کا خضاب

خضاب اجڑ جانا کیا محاورہ ہے؟

صفحہ ۶۷، رنگ و بو" سہمی روشنی بجائے سہمی ہوئی روشنی استعمال کیا ہے۔ مگر معنی ندارد اس سے لرزاں روشنی بہتر تھا۔ کچھ معنی تو پیدا ہو جاتے۔

صفحہ ۱۳۹، رنگ و بو" پہلو سے زمیں بدل رہی ہے

دنبتوں سے ونڈک نکل رہی ہے — "ونڈک کیا معنی؟"

صفحہ ۶۴، آتش کدہ (مقتل کانپور) ع

کس کو کھا کر آ رہا ہے او وبائے کائنات

وبا مؤنث ہے مذکر نہیں۔ "آرہا ہے" کی بجائے آرہی ہے ہونا چاہئے

الغرض کہاں تک اس قسم کے الفاظ اور تراکیب پیش کی جائیں۔ آپ کی نظمیں ان سے پر ہیں شاید آپ ان کو خوبی سمجھتے ہوں۔ اور آپ کے مداحین اس کو جدت و ندرت خیال کرتے ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اس قسم کی بے راہ روی شاعر کو گمراہ کر دیتی ہے۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی ۔۔۔ کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

جوش، نظیر اکبر آبادی کے پیرو معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال میں دونوں بے پروا ہیں، نظیر کے یہاں اگر مبتذل اور سوقیانہ اور بعض اوقات نامہذب الفاظ آجاتے ہیں تو آپ کے یہاں نامہذب الفاظ نہ سہی خیالات کم از کم بیحد رکیک ہوتے ہیں۔ نظیر اگر لفظوں میں نقشہ کھینچتے ہیں۔ اور بیانیہ شاعری کے استاد ہیں۔ تو آپ معاملہ بندی بھی کر جاتے ہیں۔ کہیں کہیں صاف کہہ جاتے ہیں۔ اور کہیں کہیں پردہ میں کہتے ہیں۔

جوش کے یہاں جوش ہے، روانی ہے، شگفتگی ہے۔ کیف ہے۔ مگر متانت نہیں ہے۔ وطن پرستی کا بھی جذبہ ہے۔ تشبیہات و استعارات بھی ہیں۔ دلکشی بھی ہے۔ مگر کوئی خاص پیغام یا مسلک نہیں ہے۔ سب کچھ کہتے ہیں۔ کسی صنعت میں بند نہیں ہیں۔ لیکن مرکزیت نہیں ہے۔ آپ کے کلام میں اعتدال مفقود ہے۔ جب کسی چیز کی برائی یا بھلائی میں کچھ کہتے ہیں۔ تو شدت کے ساتھ اس کو برا یا بھلا ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً مقتل کا نپور میں جو تصویر دکھلائی ہے۔ اور جنگجویوں کی بری طرح خبر لی ہے۔ اس میں الفاظ بھی نہایت کریہہ استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک شاعر کو اپنا غصہ اس طرح ظاہر نہ کرنا چاہیئے۔ کہ وہ مضحکہ خیز ہو جائے۔ غصہ اور نفرت کا اظہار درد انگیزی کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ الفاظ ملائم ہونے چاہئیں۔ تاکہ ان کا اثر گہرا ہو۔ اور یہ خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ شاعری بالکل خطابت نہ بن جائے۔ نیز خطابت میں بھی کچھ اصول کی پابندی ضروری ہے۔

"فکر و نشاط" کی نظموں کے متعلق جامعہ ملیہ دہلی کے ایک صاحب "کتاب نما" میں لکھتے ہیں:۔

"یہ نظمیں . . . شاعر کے زبردست غور و فکر اور طویل مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ ہر شعر میں مسائل حیات اور دنیا کے رنگارنگ واقعات پر نہایت رنگین تبصرہ کیا ہے۔ اور اپنے پیام کے ذریعے اپنے مخاطب کو فکر کی پیچ در پیچ گھاٹیوں میں بھٹکتا ہوا چھوڑ نہیں دیا ہے۔ بلکہ اسے نشاط کی سرسبز وادیوں کی بھی سیر کرائی ہے۔" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔ کہ ان نظموں میں رومان کو دخل نہیں ہے۔ بلکہ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ حقائق و معارف کو شائستہ اور شاعرانہ طرز بیان میں پیش کیا ہے۔" شاید ایسا ہی ہو۔ مگر یہ صاحب جوش کی "فکر و نشاط" کی فروخت سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ کتاب جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کی ہے۔ لہذا یہ رائے ایک کتاب فروش کی رائے سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔

نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

انگیٹھی

از

(از نقش و نگار)

بچپن کی اے اداس انگیٹھی خدا گواہ — کیا کہئے تجھ پہ آج پڑی کس طرح نگاہ
تو، اور خاکِ سرد پہ یوں مثلِ سوگوار — افسوس اے زمانۂ طفلی کی یادگار
میری ہی طرح کیا ترا پہلو بھی سرد ہے؟ — کیا تیرے آئینے پہ بھی ماضی کی گرد ہے؟
افسوس وہ نشاط کے موسم، وہ زمزمے — جاڑوں کی دلفریب وہ راتیں، وہ چہچہے
شعلوں سے تیرے ہائے وہ اٹھتا ہوا دھواں — وہ قہقہوں کی گونج وہ شیریں پہیلیاں
خوشبو وہ تیری آنچ کی جاں بخش و دل نواز — وہ تیرگی میں رنگ ترا، دل میں جیسے راز
شعلے وہ سرخ سرخ، دلوں میں تلے ہوئے — وہ سرخیوں میں نرم تبسم گھلے ہوئے
شعلوں کے بار بار وہ اندازِ دلنشیں — دم بھر میں زرد نگار، تو دم بھر میں سرمگیں
ڈوبی ہوئیں ہیانت میں تیری وہ گرمیاں — وہ گرمیوں میں لطف کے قصوں کی نرمیاں
وہ سادگی کی بزم میں بجتے ہوئے ستار — کلیوں کا کوئلوں کی چٹکنا وہ بار بار
وہ غنچگی کا عہد وہ گل باریاں تری — اڑتی ہوئی ہوا میں وہ چنگاریاں تری
وہ نرم نرم جسم وہ تیری حرارتیں — وہ ذمہ داریوں سے مبرا شرارتیں
وہ چھوکرے ادب سے دروں میں کھڑے ہوئے — دایاؤں کے سروں پہ وہ آنچل پڑے ہوئے
ماماؤں کی صفوں میں وہ مغلانیوں کی شان — رکھا ہوا وہ تخت پہ چاندی کا پاندان
وہ تیرے گرد و پیش بصد شانِ افتخار — آوازِ پاندان کے کھلنے کی بار بار
شایانِ آفریں وہ خواتین کا شعار — شوخی کے رنگ میں بھی وہ اک نوع کا وقار
وہ ہیکلیں گلوں میں لبوں پر وہ لالیاں — ہلتی ہوئیں وہ کانوں میں سونے کی بالیاں
وہ لونڈیوں کے رخ پہ نشاں خاک دھول کے — جوڑے وہ اونچے اونچے وہ موباف تول کے
وہ مرد و زن لحافوں کے اندر گھٹے ہوئے — رعب آفریں دروں میں وہ پردے چھٹے ہوئے
وہ نچلے بیٹھنے سے طبیعت کا انتشار — پہلو رضائیوں میں بدلنا وہ بار بار
ہلکی رضائیوں کی وہ افسانہ باریاں — اطلس کی سبز گوٹ پہ وہ سرخ دھاریاں
وہ ایک بادشاہ کی بیٹی کا ذکرِ خیر — وہ ولولے جنوں کے، وہ پریوں کا شوقِ سیر

وہ مرحمت میں غرق بڑی بوڑھیوں کی ذات وہ کاٹنا ڈلی کا کہانی کے ساتھ ساتھ
وہ اک عجیب شانِ طرب سے ملی ہوئی شیریں حکایتوں میں سروتوں کی راگنی
کیوں اب بھی یاد ہیں وہ لڑکپن کے زمزمے؟ اے شمعِ خوابگاہِ فراغت جواب دے!
جن کو بھلا رہی ہیں ہماری جوانیاں
اب اُن میں تجھ کو یاد ہیں کتنی کہانیاں

علی گڑھ کالج کی پنجاہ سالہ جوبلی

یہ نہ پوچھو کہ ہم نے کیا دیکھا جوبلی میں وہ ماجرا دیکھا
قوم سے جس نے کر دیا بیزار بن گئے ہم تو نقش بر دیوار
اتنے بہروپئے نظر آئے اپنی آنکھوں میں اشک بھر آئے
پوششیں مغربی اماموں کی صورتیں مشرقی غلاموں کی
پینٹ میں ہاتھ اور منہ میں سگار شانے ہلتے ہوئے دمِ گفتار
طاقِ دل میں چراغ انگریزی سر کے اندر دماغ انگریزی
چال انگریزی ڈھال انگریزی جسم کا بال بال انگریزی
جسمِ ہندی میں جان انگریزی منہ کے اندر زبان انگریزی
گفتگو میں بنی ہوئی آواز خمِ گردن میں مغربی انداز
اپنے لہجوں سے ہاتا پائی تھی حلق کی ساخت سے لڑائی تھی
چھل رہا ہے گلا تو چھل جائے لہجہ "صاحب" سے اپنا مل جائے
جوش! پنجاہ سالہ جوبلی کا آپ سمجھے کہ مدعا کیا تھا
یہ جتانا تھا دیکھو بڑھ گئے ہم سوئے نصرانیت پچاس قدم
آنچ گم، ہر طرف دھواں ہی دھواں
وائے بر سعیِ سید احمد خاں

مردِ انقلاب کی آواز

اگر انساں ہوں دنیا کو حیراں کر کے چھوڑونگا میں ہر ناچیز ذرے کو گلستاں کر کے چھوڑونگا

تری اس زلف کی سوگند اے لیلائے رنگینی
کہ ارضِ خار و خس کو سنبلستاں کر کے چھوڑونگا

وہ پنہاں قوتیں جو دل کے زنگ دیتی ہیں دنیا کو
انہیں آپس ہی میں دست و گریباں کر کے چھوڑونگا

سرِ تقلید کو مغزِ تفکر سے جلا دے کر
چراغِ مردہ کو مہرِ درخشاں کر کے چھوڑونگا

شعارِ تازہ کو بخشونگا آب و رنگِ جمعیت
رسومِ کہنہ کی محفل کو ویراں کر کے چھوڑونگا

چراغِ اجتہادِ نو بہ نو کی جلوہ ریزی سے
سرِ راہِ خرد مندی چراغاں کر کے چھوڑونگا

مسلط ہیں ازل کے روز سے جو ابنِ آدم پہ
میں ان اوہام کو سر در گریباں کر کے چھوڑونگا

ترے اس پیچ و خم کھاتے دھوئیں کو شمعِ حق بن کر
فرازِ عقل پہ ابرِ خراماں کر کے چھوڑوں گا

جو انساں آج سنگ و خشت کو معبود کہتا ہے
اس انساں کو الوہیت بداماں کر کے چھوڑونگا

قناعت جس نے کر لی ہے عناصر کی غلامی پہ
میں اس کو کردگارِ باد و باراں کر کے چھوڑونگا

قسم کھاتا ہوں اے کوہِ الم! دستِ زلیخا کی
کہ داماں کو ترے یوسف کا داماں کر کے چھوڑونگا

پکاروں گا حکیمِ نو کو طورِ عصرِ حاضر سے
جو کچھ کہہ دوں گا اس کو دین و ایماں کر کے چھوڑونگا

مری حکمت، بشر کو دعوتِ نو دے کے دم لے گی
میں اس بھٹکے ہوئے انساں کو انساں کر کے چھوڑونگا

اگر یہ کفر ہے جو کچھ زباں پہ میری جاری ہے
تو میں اس کفر کو کلبانگِ عرفاں کر کے چھوڑونگا

اگر عصیاں ہی پر موقوف ہے انساں کی بیداری
تو میں دنیا کو غرقِ بحرِ عصیاں کر کے چھوڑوں گا

"فریبِ ہستی"

چمن کی خاک نے تا دیر کی عرق ریزی
کہ گھٹ کے آرزوئے تخمِ گل نہ رہنے پائے

مٹا کے نقشِ دوئی، صیدِ رنگ و بو کے لئے
حسین جال سے بُن کر زمیں کی تہ میں بچھائے

کثافتوں میں لطافت کی شمعِ روشن کی
نمو کے ظلمت افسردہ میں چراغ جلائے

گھٹا کی جیب تراشی، فضا پہ ڈالے دام
قدم پہ شمس کے تڑپی، قمر کے ناز اٹھائے

گذشتہ زہرہ جبینوں کے دلنشیں ذرات
نفس کی لو پہ بڑے اہتمام سے پگھلائے

دیئے گئے تھے نباتات کو جو روزِ ازل
کمالِ حسن و لطافت سے وہ سبق دہرائے

جمالِ خاک نشیں کو دکھائی راہِ فلک
جمودِ زیرِ زمیں کو تپش کے راز بتائے

تری زمیں سے لی، آسماں سے گرمی
صبا سے عطر نچوڑا کرن سے رنگ چرائے

بھگو کے رنگ میں قرات کی بنائیں پتیں — اور ان پتیوں میں تکلف کے ساتھ نقش بٹھائے

گرہ لگائی پھر اک ہشت پہل نرگس مخمور

اور اس طرح کہ ہواؤں کی رو میں کھلتی جائے

اور ان تمام مراحل کے بعد ایک کلی — چمن فروز ہوئی پتیوں سے منہ کو چھپائے

اور اس کے بعد جو دیکھا تو شام کے ہنگام

پڑی ہوئی تھی سرِ خاک ناوکِ غم کھائے

یہ کیا نظام ہے معبود! باغِ ہستی کا — کھلے جو صبح کو وقتِ غروب کمھلا جائے

جب ایک پل میں ہو تعمیر، ماہ و سال خراب — تو کس امید پہ کوئی فریبِ ہستی کھائے

بیا کہ قصرِ امل سخت سست بنیاد است

بیار بادہ کہ بنیادِ عمر بر باد است

جوہر

م حمد علی نام اور جوہر تخلص تھا ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ اور لنکن کالج آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ریاست ہائے بڑودہ و رامپور میں ملازم ہوئے۔ اور نہایت خوش اسلوبی سے فرائض منصبی انجام دئیے۔ ترک ملازمت کے بعد کلکتہ کی سکونت اختیار کی۔ نواب صاحب جاورہ نے بھی قلمدانِ وزارت پیش کیا۔ لیکن آپ نے اُس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

کلکتہ سے کامریڈ اخبار جاری کیا۔ آپ کی قابلیت، انشاپردازی اور ذہانت طبع کی وجہ سے یہ اخبار ہندوستان اور بیرون ہند میں نہایت مقبول ہوا۔ اُردو کی قابلیت بھی مسلمہ تھی۔ اس لئے عوام کی خاطر کو پیشِ نظر رکھ کر ہمدرد کے نام سے روزانہ اخبار اُردو میں جاری کیا۔ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے وضوخانہ کو سڑک تعمیر کرنے کی غرض سے بلدیہ کانپور نے متولیوں کی رضامندی سے منہدم کرا دیا جس پر تمام ملک میں ہیجان اور جوش پھیل گیا۔ اور مسلمانانِ ہند نے صدائے احتجاج بلند کی۔ مولانا نے اپنے ممتاز جریدہ میں مضامین لکھے۔ اور ولایت بھی گئے۔ آخر کار اس قضیہ کا فیصلہ مسلمانوں کی حسبِ خواہش طے ہوا۔

۱۹۱۴ء میں برطانوی پالیسی کے برخلاف مضمون لکھنے پر آپ کو نظربند کر دیا گیا۔ پھر اس جرم کی پاداش میں کہ مولانا نے بمقام چھندواڑہ اتحادِ اسلام کے موضوع پر تقریر فرمائی تھی وہ بیتول جیل کی نذر کر دئے گئے۔

بالآخر ۱۹۱۹ء میں مولانا کی رہائی نے مردہ جسموں میں رُوح پھونک دی۔ اور تحریکِ خلافت کے معاملہ میں مسلمانوں نے اِن کا ساتھ دیا۔ بلکہ اِن کی قیادت میں سیاسی زندگی میں ترقی کی۔ پھر مسٹر گاندھی کی معیت میں ملک کی آزادی اور تحریکِ خلافت کی تنظیم اور تبلیغ کی غرض سے تحریکِ موالات میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ تحریکِ عدمِ تعاون کے زمانہ میں مولانا نے اِس ضرورت کو محسوس کیا کہ ہندوستان میں کسی ایسی درسگاہ کا قیام ضروری ہے جس کا تعلق حکومت سے نہ ہو۔ اور ملک

کے نوجوانوں کو ایسے جذبہ کے ماتحت تعلیم دے جو ان کی مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور صنعتی حالت کو فروغ دینے میں مفید اور کار آمد ثابت ہو۔ لہٰذا آپ نے جامعۂ ملیہ کی بنیاد ڈالی۔ جو آپ کے کار ہائے نمایاں کی زندہ مثال ہے۔

اس قومی تحریک کے انہماک نے مولانا کو پھر نذرِ زنداں کر دیا۔ اور آپ ۱۹۲۳ء میں رہا ہوئے اسی سال کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ مولانا نے ہندو مسلم اتحاد کی بہت کوشش کی اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن بعض کانگریسی ہندو اپنی مہاسبھائی ذہنیت سے مجبور ہیں۔ اور دونوں قوموں میں اتحادِ عمل مشکل نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علی جیسا آدمی بھی زیادہ دنوں تک ایسے اصحاب کے ساتھ کام نہ کر سکا۔ اور آخر کار اُس کو بھی کانگریس سے علیٰحدگی اختیار کرنی پڑی۔

آخرِ عمر میں آپ کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ لیکن قومی درد سے مجبور ہو کر آپ بیماری کی حالت میں گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے عازمِ انگلستان ہوئے۔ اور وہاں پہنچ کر حقِ نمائندگی ادا کیا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز مشہور انگریزی مصنف نے آپ کی نسبت یہ گوہر افشانی کی ہے۔ کہ "محمد علی کی زبان برک کی زبان تھی۔ اس کا قلم مکالے کا قلم تھا۔ اور دل نپولین کا۔" آخر کار ۱۹۳۱ء میں ملک و ملت کی قربان گاہ پر اپنی بیش قیمت زندگی کا نذرانہ پیش کیا اور چشم زدن میں ہمیشہ کے لئے منہ موڑ کر راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ اور آپ کی لاش بیت المقدس لائی گئی۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔ آپ سنی المذہب تھے۔ اور مذہبی معتقدات میں پختہ تھے۔

کلام پر تبصرہ

مولانائے مرحوم خاص قابلیت کے انسان تھے۔ اگرچہ انگریزی لکھنے میں وہ فقید المثال اور عدیم النظیر سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اردو نثر اور نظم میں بھی انہیں کافی مہارت تھی۔ سیاسی مفکرین میں اُن کا شمار تھا۔ اور غالباً غزل لکھنے کی طرف انہیں اسی وجہ سے رغبت ہوئی کہ وہ اس صنفِ شعر میں اپنے دل کا بخار اشارات اور کنایات کے ذریعہ سے نکال لیا کرتے تھے۔ اُن کا کلام دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو کچھ اُن پر گذرتی تھی۔ وہ غزل کی زبان میں ادا کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جب انہوں نے کانگریس سے علیٰحدگی اختیار کر لی تھی۔ تو اس علیٰحدگی کے اسباب اور معاملات سیاسی پر "ہمدرد" میں ایک مضمون لکھا۔ اور اس میں تمام حالات من وعن بیان کئے اور جا بجا اپنے اشعار درج کئے۔ جو اُن کے ذہنی مطالب کو بخوبی ظاہر کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ پرچہ اب مجھ کو دستیاب

نہیں ہو سکا۔ ورنہ آپ کے کلام کے متعلق رائے زنی کرنا زیادہ آسان ہو جاتا۔ بہر حال اِس امر سے بھی یہ بات عیاں ہے۔ کہ وہ سیاسی مقاصد اور سیاسی معاملات کو پیشِ نظر رکھ کر غزل لکھا کرتے تھے ان کی غزل میں دراصل خیالی معشوق کی جلوہ گری نہیں ہے۔ وہ حکومت اور اس کے مظالم کو غزل کی زبان میں معشوق کا جور و ستم کہتے ہیں۔ اور اپنی تحریکات اور سرگرمی کو وفا سے تعبیر کرتے ہیں وقس علیٰ ہذا غزلیات میں وہ شگفتگی تو نہیں ہے۔ جو ایک مشاق اور پختہ کار شاعر کے یہاں نظر آتی ہے۔ لیکن درد اور اثر کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ متانت و رزانت بھی آپ کے کلام کا حصّہ ہے۔ اور جب یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ ان اشعار میں اپنا درِدِ دل بیان کیا گیا ہے۔ تو اشعار کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے شاعری اکتسابی شے نہیں ہے آپ کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعری کا ملکہ روزِ ازل سے ودیعت کیا گیا تھا۔ ورنہ آپ کی زبان سے ہرگز ایسے عمدہ اشعار نہ نکلتے۔

راجہ غلام حسینؒ کا مرثیہ" مرتب کرتے ہیں مولانا محمد علی کے دستِ راست تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا۔ اور یہ پُر ملال خبر مولانا کو معلوم ہوئی۔ تو آپ نے کس سادگی کے ساتھ اپنے دردِ دل کا اظہار ان چند شعروں میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جیتے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے
اے مرے رند بادۂ حق کے — ابھی دو چار خم پیئے ہوتے
تم تو دِل بھی فگار کر کے چلے — زخم ہائے جگر سئے ہوتے
یوں نہ دامن چھڑا کے چل دیتے — تم گر اس بزم کے لئے ہوتے
تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا — چند نعم البدل دئے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
تو بتا کتنا بہشت کا رستہ — ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے
تم ہی زندہ ہو، لو ہے یہ خیال — چند دن اور بھی جئے ہوتے
آج جوہر ہیں دِل کے قاش فروش — کاش کچھ اور قاشئے ہوتے

ذیل میں آپ کے اشعارِ آبدار صفحۂ قرطاس پر مزین کئے جاتے ہیں ؎

کیوں نے پرست دیکھ کے مدہوش ہو گئے — شیشہ میں مے بھری تھی کہ اللہ کا نور تھا
خوش قسمتی کے آگے جھکایا کبھی نہ سر — اِس خانماں خراب کو کتنا غرور تھا

قید اور قید بھی تنہائی کی   شرم رہ جائے شکیبائی کی
کر گئی زندۂ جاوید ہمیں   تیغِ قاتل نے مسیحائی کی

یقین آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں پر   تری آنکھ اے بتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
یہ قتل کی نکالی ہے انوکھی ترکیب   ظلم کا نام ستمگر نے حیا رکھا ہے
جنوں باقی ہے اب تک گو تری محفل میں بیٹھا ہے   کہ رہ رہ کر خیال آتا ہے جوہر کو بیاباں کا

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی   اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر   ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد   ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے   میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں   آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا، سزا کے بعد
قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے   اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

عزمِ عاشق ہے خود اپنی کامیابی کی دلیل   نام بھی لینا نہ ہرگز کوششِ برباد کا
آج تک ہے ایک کنعانی سے شہرت بزم کی   فیض سے حسرت[۱] کے ہوگا نام فیض آباد کا
ہوگئے جوہر یہ کیسے بندۂ دامِ فریب   شور سنتے تھے بہت ہم حسرتِ آزاد کا

اس شانِ امتیاز کو دیکھو کہ اہلِ کفر   مومن سمجھ رہے ہیں ہمیں خوار دیکھ کر

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور   جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور
مستِ مئے الست کہاں اور ہوس کہاں   طرزِ وفائے غیر ہے اپنے چلن سے دور
ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب   یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور
شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی   اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزا ہے   قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ
یہ نورِ خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا   کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ تو بھی بجھا دیکھ
ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا   ہو صدقِ طلب، پھر اثرِ آہِ رسا دیکھ
سونے کا نہیں وقت یہ، ہوشیار رہو غافل   رنگِ فلکِ پیر، زمانہ کی ہوا دیکھ

نورِ حق وہ شمع انور ہے جو بجھ سکتی نہیں   ہے خدا حافظ چراغِ رہگذارِ باد کا

---

[۱] مولانا حسرت موہانی اس زمانہ میں فیض آباد جیل میں مقید تھے۔ تنہا

تیرِ نگہ نے کر دیا دونوں کا فیصلہ
باہم دل و جگر میں یہ تکرار دیکھ کر

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہرؔ آپ کے جوہر کھلے

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہرؔ
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

تم یونہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابنِ علی کو
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لئے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

ہے ظلم بہت عام ترا پھر بھی ستمگر
مخصوص یہ اندازِ جفا میرے لئے ہے

ہیں یوں تو فدا ابرِ سیہ پہ سبھی میکش
پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لئے ہے

ہوں لائقِ تعذیر یہ الزام ہے جھوٹا
مجرم تو ہوں بیشک پہ خطا اور ہی کچھ ہے

خود خضر کو شبیرؑ کی اس تشنہ لبی سے
معلوم ہوا آبِ بقا اور ہی کچھ ہے

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہرؔ
لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

شدتِ غم سے زباں گر بستہ ہے
تو ہی کہہ دے چشمِ گریاں الوداع

کیا ڈھونڈتے ہو فصلِ خزاں میں بہار کو
اب وہ چمن کہاں ہے وہ رنگِ چمن کہاں

فرصت کسے خوشامدِ شمر و یزید سے
اب ادعائے پیرویِ پنجتن کہاں

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بیٹھا ہوا تو مہر کی تو خیر منایا کر
ٹلتی نہیں یوں جوہرؔ اس دیس کی برساتیں

پھر ہو رہا ہے شورِ صلائے نبردِ عشق
ہاں اے دہانِ زخم جوابِ الاماں نہ ہو

سنتے ہی جس کے خلق میں کہرام مچ گیا
جوہرؔ وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ہمت نہ ہار دے کوئی منزل کے سامنے
پروردگار یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ　　اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ
کیا عشقِ ناتمام کی بتلاؤں سرگزشت　　دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

پیامِ مرگ ہے، پیغامِ یار و مژدۂ وصل　　وہ کام اجل نے کیا جو صبا سے ہو نہ سکا
قید ہے، قیدِ غلامی، دو برس کی قید کیا　　دیکھو کب ہو خاتمہ اس قیدِ بے میعاد کا

رہے گی اُٹھ کے یہ اک دن نقاب[1] دیکھو تو　　ہمارے رب ہو ہمیں سے حجاب دیکھو تو

اس دردِ لا دوا کی دوا ہو تو جانیے　　دستِ مسیح میں یہ شفا ہو تو جانیے
ہر شے کو لے کے شکر کیا بھی تو کیا کیا　　جاں دیتے وقت شکر ادا ہو تو جانیے

مہمانِ قفس کیا ترے فریاد کریں گے　　اتنی بھی نہ اب خاطرِ صیاد کریں گے
جو دشت کہ آرام گہِ سبطِ نبی ہے　　اس دشت کو لاکھوں ابھی آباد کریں گے

عشقِ مجنوں کے لیے ناقۂ لیلیٰ کے سوا　　شرط یہ بھی ہے کہ اک وادیِ پُرخار بھی ہو

ہم نے یہ مانا کہ یاس کفر سے کمتر نہیں　　پھر بھی ترا انتظار دیکھیے کب تک رہے
سب کو یہاں ہے فنا، ایک تجھے ہے بقا　　یہ ستمِ روزگار دیکھیے کب تک رہے

جان دیتا ہے، عیشِ فانی پہ　　بس، اسی زندگی پہ مرتا ہے
جس کو دنیا نے نامراد کہا　　وہی ناکام، کام کرتا ہے
اس قدر احتیاط اے صیاد　　کہ قفس میں بھی پر کترتا ہے

جوہرؔ، مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ چیز　　اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا

ہرگز نہ ہو اے دل، غمِ جاناں کی شکایت　　کرتا ہے بھلا کوئی بھی مہماں کی شکایت
ہیں عشق کے بیمار بھی دنیا سے نرالے　　ہے درد کے بدلے انہیں درماں کی شکایت

غافل خدا کے قہر سے دیتی نہیں پناہ　　سدِّ سکندری ہو کہ دیوارِ چین کی

دے نقدِ جاں تو بادۂ کوثر ابھی ملے　　ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ شے ادھار دے

ہے رشک ایک خلق کو جوہرؔ کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

---

[1] نقاب مذکر ہے۔ مگر مولانا نے مونث باندھ دیا ہے۔ رہیگی کی جگہ رہیگا پڑھ سکتے ہیں۔ شاید کاتب نے اصل کی نقل میں غلطی کر دی ہو۔ تنہا

ثاقب
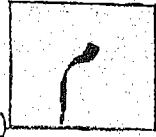
مرزا ذاکر حسین نام اور ثاقب تخلص ہے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ حاجی علی قزلباش (ماژندرانی) تھے۔ جو علی قلی خاں شاملو کے لقب سے تاریخ عجم میں مشہور ہیں۔ اور شاہِ طہماسپ صفوی کے معتمد علیہ تھے۔ تغیراتِ زمانہ نے آبائے کرام کو بسلسلۂ تجارت ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ اور تقریباً دو سو برس سے یہاں سکونت پذیر چلے آتے ہیں۔ مرزا صاحب آگرہ کے محلہ گلاب خانہ میں ۱۹ ر ماہِ مبارک صیام ۱۲۸۵ھ شبِ شنبہ مطابق ۲ جنوری ۱۸۶۹ء کو چار بجے صبح عالمِ وجود میں آئے۔ اسی سال آپ کے والد مولوی آغا محمد عسکری قزلباش المعروف بہ مرزا محمد حسین وکیل مرحوم بوجوہ چند سکونتِ اکبرآباد ترک کر کے لکھنؤ چلے گئے۔ اور اس طرح ثاقب صاحب نے لکھنؤ میں نشو و نما پائی۔ چونکہ آپ کے والد کا سلسلۂ ملازمت الہ آباد سے وابستہ تھا۔ اس لئے الہ آباد میں بھی رہنا سہنا ہوا۔ اور پھر جب بڑے مرزا صاحب بھوپال چلے گئے۔ تو وہاں بھی آپ کا قیام رہا جب وہ ۱۸۹۰ء میں بھوپال چھوڑ کر لکھنؤ میں مستقل سکونت کے ارادہ سے واپس آئے۔ تو ثاقب صاحب بھی اُن کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے اور وہیں رہنے لگے۔ بڑے مرزا صاحب کو شاعری کا شوق نہ تھا اور وہ چاہتے تھے۔ کہ ان کا بیٹا بھی اس بیکار مشغلہ میں نہ پڑے۔ لیکن قدرت کو یہی منظور تھا۔ کہ ثاقب صاحب ایک سخن گو مشہور ہوں۔ چنانچہ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ شاعری کا شغل جاری رہا۔ اکثر برجستہ اور قلم برداشتہ شعر کہنے کا اتفاق ہوا۔ اور یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ راہ روی میں بھی داہنے بائیں کسی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا قسم ہوگیا۔ ہر وقت فکرِ سخن میں منہمک رہنے لگے۔ اکثر و بیشتر ایسے سانحات پیش ہوئے کہ اس استغراق کی بدولت سخت صدمات اُٹھانے پڑے۔

مرزا صاحب فطرۃً نہایت با اخلاق، متواضع، صاحبِ مروت، سیر چشم ہیں۔ طبیعت میں ایثار کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اپنی خواہشوں پر دوسرے لوگوں کی خواہش کو مقدم سمجھتے ہیں۔ عجز و انکسار بھی آپ کی خاص صفت ہے۔ اوّل اوّل مرزا صاحب نے ۱۸۹۶ء میں ایک مدراسی تاجر کی معیت میں سلسلۂ کاروبارِ تجارت شروع کیا۔ ابتدا میں تو فائدہ کثیر ہوا۔ لیکن بعد ازاں

سخت نقصان ہوا حتیٰ کہ کل اثاث البیت اس تجارت کی نذر ہو گیا۔ چندے پریشان حالی میں گزری ۱۹۰۶ء میں کلکتہ کا سفر پیش آیا، وہاں سفارت خانۂ ایران میں ملازم ہو گئے۔ اور نومبر ۱۹۰۸ء سے مہاراجہ محمود آباد نے وظیفہ مقرر کر دیا۔ جو ماہ بماہ ملتا رہتا ہے۔ آپ کو فارسی میں اعلیٰ اور عربی اور انگریزی میں بقدرِ ضرورت مہارت حاصل ہے۔

عرصہ ہوا راقم آثم سے جامعہ دہلی کے کسی جلسہ کے موقع پر ملاقات ہو گئی تھی منکسر المزاج ہیں اور فنِ شاعری کے اصول سے باخبر ہیں۔ اگرچہ زیادہ تر غزل ہی آپ کا میدان ہے۔ تاہم اسی محدود فضا میں بعض شعر خوب کہتے ہیں۔

کلام پر تبصرہ

ثاقب کے کلام میں پختگی ہے۔ مگر کشش نہیں ہے بعض بعض جگہ مضامین نو پیدا کئے ہیں۔ مگر شاعر کی نسبت فلسفی کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں یہ نقص حضرت ناسخ کی بدولت پیدا ہوا۔ اگر ابتدا میں یہ حضرت میر کو اپنا رہبر بنا لیتے یا کم از کم آتش ہی کا تتبع کرتے تو آگے چل کر ان کی شاعری میں دل آویزی پیدا ہو جاتی۔ لیکن ناسخیت نے ان کو کہیں کا نہ رکھا پھر میر و غالب کی تقلید کچھ کام نہ آئی۔ خشک فلسفہ شاید ایک فلسفی کے لئے موزوں ہو۔ مگر شاعری سے تو اسے دور کی بھی نسبت نہیں ہے

اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ میر کی تقلید میں اچھے شعر بھی نکل آئے ہیں۔ مثلاً :-

بزم میں ہے مری طلب نا وہ کبھی سرورِ عیش کی	ڈھونڈتے ہو تم جہاں حیف کہ میں ادھر نہیں
گوشۂ لحد کا ڈھونڈیں اب کیا کریں جی کے	جب موت سے ہیں بدتر اوقات زندگی کے
عشق میں دل گنوا کے حال یہ ہے	کچھ کہیں کھویا ہوا سا رہتا ہوں
پرسشِ حال اس نے کی تو مجھے	یہی کہتے بنا کہ اچھا ہوں
یکایک دل پہ بجلی سی گری تھی	اٹھا تھا کچھ دھواں جب آشیاں سے
یہ ہے بہتے ہوئے دریا کی آواز	وہیں جانا ہے آئے تھے جہاں سے
دل کے قصے کہاں نہیں ہوتے	ہاں وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے

لیکن زیادہ تر کلام پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ یا کم از کم وہ دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ جو چھپن ۵۶ سالہ خدمتِ شاعری کی بدولت ہو جانی چاہئے تھی۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی شاعری میر و غالب کی

پیروی نہیں خیال کی جا سکتی۔ بلکہ وہی ناسخیت ہے:۔

جہاں میں حادثاتِ ناگہاں سے ۔۔۔ کہیں خود بھی خطر میں ہے مکاں سے

ڈوبے لہو میں، قتل ہوئے تیغِ کیں سے ہم ۔۔۔ سر کے نہ امتحانِ وفا کی زمیں سے ہم

لاغری سے اک ورق ہوں دفترِ تاثیر میں ۔۔۔ جان پڑ جائے جو کام آئے تری تصویر میں

کشفِ رازِ عالمِ باطن ہے حصۂ عشق کا ۔۔۔ حضرتِ یوسف کو کتنا دخل تھا تعبیر میں

شمع کا سر کاٹ کر اچھا نہیں ظالم کا حال ۔۔۔ اک دھواں سا اُڑ رہا ہے چہرۂ گلگیر پر

دل کے چھوٹے، تھم نہیں سکتے بسیطِ خاک پر ۔۔۔ جو گرا آنسو، وہ تارا ہو گیا افلاک پر

آپ کے کلام میں کہیں کہیں سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ کچھ عرصہ سے آپ میرؔ و غالبؔ کی پیروی کر رہے ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے خواجہ میر دردؔ کا اردو اور فارسی کلام نہایت غور سے پڑھا ہے۔ اور اس طرح توارد خیال نے سوزش و گدازی پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ آپ کے بعض تبصرہ نگاروں نے بیسیوں ہم مضمون اشعار میر دردؔ کے لکھے ہیں اور پھر ثاقبؔ کا اندازِ بیان دکھایا ہے۔ یہاں صرف ایک دو مثال ہمارے اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔

دردؔ: اگر آہ بھرئیے اثر شرط ہے ۔۔۔ وگر ضبط کیجے جگر شرط ہے

ثاقبؔ: پھول سا قلب ہے اور صبر کی سِل رکھتا ہوں ۔۔۔ جب تو کہتا ہے زمانہ کہ میں دل رکھتا ہوں

دردؔ: بے تو جالے بہم رسید مرا ۔۔۔ گریہ سر کرد سر کہ دید مرا

ثاقبؔ: نہیں معلوم میں کس حال میں ہوں باغِ عالم میں ۔۔۔ قفس والے بھی مجھ کو دیکھ کر فریاد کرتے ہیں "

دردؔ: بختِ برگشتہ من بیں کہ یکایک از دور ۔۔۔ در پہلوں دید مرا، یار زرہ برگرد ید

ثاقبؔ: نہیں معلوم پائے سعی میں کانٹے کہاں کے ہیں ۔۔۔ مرادیں ہٹ کے چلتی ہیں نکلتا ہوں جدھر ہو کر

بعض بعض جگہ آپ کے کلام میں تسامحات بھی نظر آتے ہیں مثلاً

فروغِ حُسن آنکھوں میں ہے پھر چھپنے سے کیا حاصل ۔۔۔ ذرا سی اوٹ باقی ہے نہ حائل ہے نہ پردا ہے

لفظ حائل اس طرح استعمال کرنا ہمارے روزمرّہ کے خلاف ہے۔ یہاں "نہ کوئی حائل ہے" ہونا چاہئے

ہے بعدِ مرگ بھی وہی آہ و فغاں ہنوز ۔۔۔ لگتی نہیں ہے تالو سے اپنی زباں ہنوز

پہلے مصرع میں لفظ ہنوز جو ردیف ہے۔ زائد معلوم ہوتا ہے۔

نگاہ واپسیں بھی اب تجھے جواب دے چکی ۔۔۔ بس اپنے گھر سدھارئے، فسانہ ختم ہو چکا

محبوب سے یہ تخاطب کہ "اپنے گھر سدھارئے" عاشق کے لئے شرمناک ہے۔

چشمِ گریاں سے اُتر کر، سیرِ دل فرمائیے مدتوں دیکھا کہ دریا اور ساحل اور آپ
یہ اور کی تکرار ناگوارِ طبع ہوتی ہے۔

مرزا صاحب کے اشعار تخمیناً ساڑھے تین ہزار ہونگے اگر آپ تعداد صرف ایک ہزار اشعار بعد انتخاب شائع کرتے تو آپکے کلام کی نسبت اس سے کہیں بہتر رائے قائم ہوتی افسوس ہے کہ آپ لوگوں نے صرف منتخب کلام چھاپنے کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔

اب ہم ذیل میں آپ کے منتخب اشعار درج کرتے ہیں:۔

جلوۂ حسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا — میں نہیں سمجھا مگر ہاں، دل تڑپ کر رہ گیا
مری قسمت کا دلِ شکن ماجرا سمجھا — بہار آئی تھی، آشیاں بن چکا تھا
مجھ کو یقین وعدۂ فردا ضرور تھا — مشکل یہ آپڑی تھی کہ دل ناصبور تھا
گلچیں برا کیا جو یہ تنکے جلا دئے — تنہا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا
قوتِ غم دیکھ، زورِ ناتوانی پر نہ جا — زمانے عالم میں تجھے، جب دل مرا بیتاب تھا
خود اُن کا حسن میری داد خواہی اُن سے کرتا ہے — وہ آئینہ لئے ہیں اور مجھ کو یاد کرتے ہیں
ہماری داستانِ غم رُلاتی ہے زمانے کو — وہ ہم ہیں جو زبانِ غیر سے فریاد کرتے ہیں
جوابِ زخمِ جگر ہے رہا ہے ہنس ہنس کر — وہی تو دل ہے کہ جو خوش رہے مصیبت میں
یہ جادوہائے عشق ہیں، انہیں کا میں اسیر ہوں — نہ حال پوچھئے مرا، لکیر کا فقیر ہوں
اُس کے نیرنگ کا تماشا ہوں — جز فریبِ نگاہ میں کیا ہوں
چشم و جبیں ہیں باہم کیوں ہے تنازع بیجا — مطلب نیاز سے ہے در ہو کہ آستاں ہو
دل کے قصے کہاں نہیں ہوتے — ہاں وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے
یہ ایک وادیِ پُر خارِ عشق تھی ثاقب — اُلجھ کے رہ گئی ہر دل میں گفتگو میری
ہاتھ اُٹھے تھے مجھی پر اسے اب سمجھا میں — روح کو کھینچ لیا ہے تری انگڑائی نے
اُس کی رحمت پر گرے پڑتے ہیں عصیاں والے — حشر کا ہنگامہ ہے، اک جلسۂ رندانہ ہے
روزِ محشر کے اُجالے میں کھلا میرا لہو — تم تو تم دشتِ بلا ہے دامانِ شبِ فرقت پہ بھی
بہت سی عمر مٹا کے، جسے بنایا تھا — مکاں وہ جل گیا، تھوڑی سی روشنی کے لئے
صدائیں دے کے ہم نے ایک تنہا آنا دیکھی — یہی سنتے چلے آئے، بڑھا آگے یہاں کیا ہے
مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن — زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

قیدِ غم بھی دل لگی ہے ہنسنے والوں کے لئے — عندلیب اک قفس میں اک تماشا ہو گئی

وہی رات میری وہی رات اُن کی — کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے

لوٹنے والے ہماری نیند کے — رات بھر کس چین سے سوتے رہے

اندھیرے میں وہ سوجھی، یہ نہ سوجھی — تری شب ہے، مری شب کچھ نہیں ہے

غمِ زندگی جا بجا ہو رہا ہے — ارے مرنے والو یہ کیا ہو رہا ہے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ہچکیوں سے رازِ اُلفت کھل گیا — آگئی منہ پر جو دل میں بات تھی

سو گیا بالائے بستر جاگ کر — خواب میں قسمت مری بیدار تھی

جو ایک طرح تھی تابِ حسنِ دوست تو کیوں — تمام بزم میں میرا ہی دل تپاں ہوتا

جو آنکھ ہو تو دیکھئے نہ پوچھئے کہ کیا کیا — چراغ بزم ہو گیا، جلا کیا، ہنسا کیا

کس کو شوقِ دید بیتابی نہیں — دل نہ ٹھہرا اک تماشا ہو گیا

کہنے کو مشتِ پر کی اسیری تو تھی مگر — خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی — میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

تھا اشتباہ درد، کھٹک زندگی کی تھی — اے دم ترے نکلتے ہی آرام ہو گیا

کیا دیکھتا آثارِ سحر میں شبِ فرقت — وہ جوش پر آنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

اے کردگارِ عشق کدھر جا رہا ہوں میں — ہر سمت یہ صدا ہے کہ دیوانہ ہو گیا

مدہوش تیری یاد میں کب دل نہیں رہا — تھی بیخودی، مگر کبھی غافل نہیں رہا

شبِ غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو — جدھر دیکھتا تھا خدا ہی خدا تھا

ہجر نے کونسا پیوند لگا رکھا تھا — راستہ مل گیا خنجر کو گزر جانے کا

سونے والے کو کیا خبر اے ہجر — کیا ہوا ایک شب میں کیا نہ ہوا

نزع اک عہد ہے رشتے ہوئے وہ آئے ہیں — اے دلِ زار یہی وقت ہے مر جانے کا

یاس و اُمید کے مابین ہوئی ختم حیات — ایک نے شاد کیا، ایک نے ناشاد کیا

خوفِ محشر کس لئے، آنکھوں کو دھوکا ہو گیا — ایک ہی صورت کے ہونگے میرا قاتل اور آپ

ہے روشنی قفس میں، مگر سوجھتا نہیں — [illegible] گلزار دیکھ کر

کہتے ہیں دل لگی مری شامِ فراق کو — [illegible] دیکھ کر

جہاں تھا تنگ جس دل الم کے پھیل جانے سے — [illegible] وہ قصہ مختصر ہو کر

ثاقب ملال اہل حسد بھی ہے ناگوار
کیا خوش ہوں اپنی طبع سخن آفریں سے ہم

اس دفتر ہستی میں تعلیم بہت کم ہے
دو حرف نظر آئے دیباچۂ ابجد میں

بتلائے رہے گی شمع کس طرح حجاب میں
یہ کیا سمجھ کے حسن کو چھپا دیا حجاب میں

تڑپا دیا ہے دل کو شاباش ہم صفیرو
یونہی پھر اک صدا دو، ٹوٹا قفس چلا میں

وہ نزع کی خموشی، جام جہاں نما تھی
اک عمر کی کہانی، دم بھر میں کہہ گیا میں

ملا کے دست دعا ظرف اک بنایا ہے
لئے ہوں ہاتھ میں کاسہ خدا کرے بھر جائے

بڑھائی جس نے تری نیند مجھ کو تڑپا کر
وہ میری عمر گزشتہ نہ تھی کہانی تھی

میں رو رہا ہوں جو دل کو تو بیکسی کے لئے
دگرنہ موت تو دنیا میں ہے سبھی کے لئے

دامن یوسف جنہوں نے مصر میں دیکھا نہ تھا
کیا نظر آیا جو اس کی دھجیاں دیکھا کئے

فرقت کا بزم الفت پر کچھ اثر نہیں ہے
او جانے والے دل ہے یہ رہگزر نہیں ہے

چراغ عقل بھی گل ہے، شب غم کی سیاہی ہے
نہ میں معلوم ہوتا ہوں نہ تو معلوم ہوتا ہے

یہ کتنے زخم تھے کھٹکے چمن کو داغ کہتے ہیں
ہر اک جا دامن دل پر رفو معلوم ہوتا ہے

اک نیا دل ظلم سہنے کو بنانا چاہئے
ہو تو سکتا ہے مگر اس کو زمانہ چاہئے

اب کچھ نہیں بن پڑتا آنکھوں کا نہ آنکھوں میں
بیٹھا ہوا جاتا ہے دل جنبش ساغر سے

ڈھونڈتے ہیں سب تجلی گاہ دوست
قمریوں کی ورنہ کو کو کس لئے

خواہش دنیائے عشق و حسن ہے
ورنہ پھر میں کس لئے تو کس لئے

ہنسنے والا رو رہا ہے آفریں اے وقت نزع
کچھ کہا شاید مری ڈوبی ہوئی آواز نے

گلشن کی طرف منہ کئے بیٹھا ہوں قفس میں
شاید کوئی دمساز نکل آئے ادھر بھی

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

مختار ہے بندہ کوئی مجبور نہیں ہے
پھر کیا ہے جو دل پر مرا مقدور نہیں ہے

برگشتہ ہوئی دنیا ہم دردِ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

عدم سے آ کے اس دار فنا میں خوب پچھتایا
یہ اک عالم کدہ نکلا میں سمجھا تھا کہ محفل ہے

شب کو زنداں میں مرا سر پھوڑنا اچھا ہوا
آج کچھ کچھ روشنی آنے لگی دیوار سے

اضافہ کچھ نہ ہو اپنی بیخبری میں
اگر اٹھ جائے پردہ درمیاں سے

جفا اٹھانے کی عادت پڑے تو کیونکر جائے
ستم سہے مگر اتنے کہاں کہ جی بھر جائے

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے ہیں میری منزل سے

ظفر علی خاں

آپ ۱۲۹۰ھ میں کوٹ میر مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کا نام تاریخی ہے اور اس سے سنہ پیدائش نکلتا ہے۔ آپ کے والد کرم آباد تحصیل وزیر آباد (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ مولوی سراج الدین احمد خاں نام تھا۔ اور ۱۹۰۳ء میں "زمیندار" ہفتہ وار اخبار جاری کیا تھا۔ ظفر علی خاں نے ابتدائی تعلیم وزیر آباد اور پٹیالہ میں حاصل کی۔ پھر علی گڑھ کالج سے بی اے پاس کر کے بمبئی چلے گئے۔ اتفاق سے مولانا شبلی نعمانی موجود تھے ان سے ملاقات ہو گئی اور حیدرآباد کے حالات سن کر وہاں جانے کا شوق پیدا ہو گیا۔ ان دنوں مرزا داغ مرحوم حیدرآباد میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے چنانچہ آپ ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ اور اصلاح لیتے رہے۔ آپ نے ریاست میں ملازمت اختیار کر لی۔ اور دکن ریویو کے نام سے ایک علمی و ادبی رسالہ بھی جاری کیا۔ ترکِ ملازمت کے بعد زمیندار کی اڈیٹری سنبھالی اور پنجاب ریویو کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کیا۔ جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ لیکن زمیندار اخبار جو پہلے ہفتہ وار تھا۔ اس کو روزنامہ بنا دیا۔ اس وقت آپ کا مستقل شغل اخبار نویسی ہو گیا۔ اور اس اخبار کو اتنا فروغ دیا کہ ہر طرف سے قبولِ عام کی سند ملی۔ کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ اخبار زمیندار کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ اور فوراً پبلک نے دس دس ہزار روپیہ کی رقمیں جمع کر دیں لیکن اخبار کو بند نہیں ہونے دیا۔

مولوی ظفر علی خاں کا کوئی تخلص نہیں ہے لیکن شعر خوب کہتے ہیں۔ نظموں میں مذہبی اور سیاسی عنصر غالب ہے۔ ہنگامی نظمیں خوب لکھتے ہیں۔ آپ کے کلام کا ایک مجموعہ بہارستان کے نام سے اور دوسرا نگارستان کے نام سے شائع ہوا ہے۔ قوم و ملک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے آپ نے معاشرتی اصلاح کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سے مضامین لکھے۔ اور کارآمد ترجمہ کر کے مغربی مصنفین کے خیالات کو بھی اردو جامہ پہنایا۔ اس سلسلہ میں آپ کی تصنیف "معاشرت" قابلِ دید

ہے۔

آپ کا تعارف راقم الحروف سے ۱۹۱۱ء میں سب سے پہلے میرٹھ میں ہوا۔ جہاں آپ
اتفاق سے اسی روز پہنچ گئے تھے جبکہ جنگ طرابلس کے لئے عیدگاہ میں چندہ وصول کرنے
کا جلسہ کیا گیا تھا۔ اس جلسہ میں آپ نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ اور نہایت عمدہ تقریر کی تھی۔ جب
سے لاہور آیا ہوں۔ دو تین مرتبہ نیاز حاصل کر چکا ہوں لیکن اب مولانا نہایت ضعیف ہو گئے
ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو تادیر سلامت رکھے۔ اب بھی کبھی کبھی اچھی نظم کہہ لیتے ہیں۔

کلام پر تبصرہ

آپ کا کلام پختہ ہے۔ اور قافیوں کو عمدگی کے ساتھ چسپاں کیا گیا ہے۔ نیز قافیوں میں
جدت طرازی بھی آپ کا شیوہ ہے۔ لیکن اکبر الہ آبادی کی تقلید میں ظرافت سے کام لیتے
ہیں اور بعض اوقات یہ ظرافت تمسخر کی حد میں داخل ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے عام طور پر یہ
گمان ہوتا ہے۔ کہ آپ کا کلام متانت سے خالی ہے۔ حمد و نعت کے اشعار میں بھی قافیوں کی
جدت یا کمی نے اپنا یہ رنگ ظاہر کر دیا ہے۔ جس طرح حضرت انشا اپنی طبیعت سے مجبور تھے
اور قصائد میں بھی ظرافت و تمسخر سے باز نہیں آتے تھے۔ یہی حال ظفر علی خاں کا ہے۔ حمد و نعت ہو
یا متین نظم ہو وہ اپنی اس عادت سے مجبور ہیں۔ اور ایک آدھ شعر یا ایک آدھ قافیہ ہر نظم میں ایسا
ضرور ملتا ہے۔ جو تمام نظم کے چہرہ پر ایک بدنما داغ نظر آتا ہے۔ اور اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے
بہارستان کو آپ شروع سے آخر تک پڑھ جایئے ظفر علی خاں کی اسلام سے محبت ہویدا
اور نمایاں ہے۔ اگر ہم سے دریافت کیا جائے۔ کہ آپ کے کلام میں کیا خصوصیت ہے یا آپ
کا کیا پیغام ہے۔ تو ہم بلا تامل اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں۔ کہ ظفر علی خاں اسلام سے حقیقی
محبت رکھتا ہے۔ اور یہی پیغام وہ دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس کی سیرت میں ہزار برائیاں ہوں
لیکن کوئی شخص اس کے کلام کو پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس کا وہ جذبہ محبت جس پر اسلام احاطہ
کئے ہوئے ہے۔ کسی اور جذبہ سے مغلوب ہو کر رہ گیا ہے۔ سیاسیات ہو یا اسلامیات دونوں میں
یہ بات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے

مولانا حالی نے ظفر علی خاں کے متعلق جنگ طرابلس کے زمانہ میں چند اشعار کہے تھے۔ جو تقریب
کے نام سے بہارستان کے شروع میں درج کئے گئے ہیں۔ ان میں سے دو تین شعر یہاں لکھے جاتے
ہیں:-

اے صدق و صفا کی زندہ تصویر — اے شیر دل اے ظفر علی خاں
پنجاب کو تجھ پہ ہو اگر فخر — ہے اُس کو یہ فخر و ناز شایاں
زندہ ہے وہ ملک اور ملّت — ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں

ہم کو مولانا حالی کے ان اشعار سے کلّی اتفاق ہے۔

بہارستان کی نظموں میں بعض بعض جگہ تاریخ درج ہے لیکن بعض جگہ ندارد ہے۔ اگر پڑھنے والے کو نظم لکھنے کا زمانہ معلوم ہو جاتا ہے۔ تو اُس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ نظمیں درحقیقت اُس عہد کی زندہ تاریخ ہیں جس زمانہ میں یہ لکھی گئی ہیں۔ بلاشبہ شاعر کے تاثرات کو بھی ان میں دخل ہے لیکن یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔ کہ اُس وقت ملک کی فضا کیا تھی۔ اور سیاسیات میں ہمارا وطن کیا سرگرمی دکھا رہا تھا۔

ایک صاحب کا یہ خیال ہے کہ ظفر علی خاں کو شعراء کی فہرست میں داخل نہ کرنا چاہیئے کیونکہ نہ وہ خود شاعری کا ادّعا کرتے ہیں۔ اور نہ درحقیقت وہ اُستادانِ فن میں شمار ہو سکتے ہیں۔ وہ صرف ہنگامی شاعر ہیں۔

آپ کا کلام پڑھ کر اس رائے کی ایک حد تک تصدیق ضرور ہوتی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ اُس وقت کی ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا ہے۔ لیکن یہ کوئی بُرائی کی بات نہیں ہے۔ بلکہ ہم تو اس کو بیحد مناسب اور ضروری خیال کرتے ہیں۔ شاعر کا دماغ اگر خیالی اور فرضی باتوں ہی میں اُلجھا رہے تو ہم اُس کو اس دنیا کا شاعر نہیں کہہ سکتے۔ اُس کو اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہونا چاہیئے۔ اور یہ تاثر لمحاتِ شاعری میں تبدیل ہو کر دوسروں کے کانوں تک پہنچانا چاہیئے۔

تمام کلام پڑھنے کے بعد اور تمام عیوب و محاسن کو پیشِ نظر رکھ کر ہماری یہ رائے ہے۔ کہ ظفر علی خاں دوسرے درجہ کے شعراء میں داخل ہیں۔ ان کو بلحاظ تقلیدِ اکبر و انتشار، اکبرِ صغیر یا انشائے صغیر بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہم نے اوّل اوّل آپ کی ایک نظم موسیٰ ندی کے طوفان پر دیکھی تھی۔ جو حیدرآباد دکن میں ۱۹۰۸ء میں آیا تھا۔ اور جس کے بے پناہ آب رواں نے حیدرآباد کی سنگین عمارتوں اور بہت سے انسانوں کو اپنے تموّج میں لے کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ نہایت اچھی نظم تھی۔ لیکن بہارستان باوجود ۴۲۸ صفحات کی ضخامت کے اُس سے خالی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ ناقابلِ معافی فروگذاشت کیوں کر

ہوئی؟ بہر حال ہم اس نظم کو پڑھ کر اس قدر متاثر ہوئے۔ کہ ہم ظفر علی خاں کو ایک اچھا شاعر تسلیم کرنے لگے۔ نیز دکن ریویو، پنجاب ریویو اور "زمیندار" کی عبارتوں میں بھی جو آپ نے تحریر فرمائیں۔ ہم نے کہیں اُردو کے محاورے یا روزمرہ سے گریز نہیں پایا۔ ہمارے یو۔ پی کے زباندانوں کے اور آپ کے لب و لہجہ میں کہیں فرق نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے طرز سے کوئی شخص یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ کہ آپ پنجاب کی پیداوار ہیں۔ لیکن جس طرح ایک مصنف کا عجمی ہونا "اُقتلُ سراجُ" کے کہنے سے ظاہر ہو گیا تھا، اسی طرح آپ کے بعض الفاظ سے جو کہیں کہیں نظموں میں پائے جاتے ہیں آپ کا پنجابی ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً بہارستان صفحہ ۱۶ ع

ٹھاٹھیں مار رہا ہے سمندر اور ہیں موجیں برقِ بلا

یہ ٹھاٹھیں مارنا کیا معنی؟ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کوئی پنجابی محاورہ ہے۔ اور نامعلوم طریقہ پر ایک پنجابی شاعر کی زبان سے ادا ہو گیا ہے۔ یا غمی کی جمع غمیاں بنائی گئی ہے۔ جس کو اہلِ زبان کبھی نہیں بولتے۔ یہ جمع محض قیاسی ہے۔ اور شاید اس وجہ سے کہ خوشی کی جمع خوشیاں استعمال ہوتی ہے، اپنے شعر میں اس طرح کھپانے کی کوشش کی ہے۔ بہارستان صفحہ ۷۰

تیرا جدا نصیب، مقدر مرا الگ　　　غمیاں ہیں تیرے واسطے خوشیاں مرے لئے

آپ نے ایک جگہ تلک استعمال کیا ہے۔ جو متروک ہو چکا تھا۔ صفحہ ۵۱۵

لکھنؤ کی کسی کٹھیارن نے بھی آج تلک　　　غریب ہو گا شرف [illegible]

کہیں نہ کہے۔ مگر آپ نے موشہ باندھا ہے۔ شعر

جو اپنی [illegible] زمیندار کو کھلائے　　　دودھوں نہائے ڈاکٹر اقبال کی دہ گائے

نظم آوازۂ حق میں ایک مصرع ہے:۔ ع "گوشۂ چشمِ عنایت مجھ پہ ہو جو ہیمبر کا سبب دل"

یہاں گوشۂ چشمِ عنایت ہونا چاہئے۔ حالانکہ فکِّ اضافت کے بعد بھی عنایت کی عین، الف پڑھی جاتی ہے۔ اس نظم کے اکثر مصرعے زحافات سے پُر ہیں۔ اگرچہ اُستادانِ فن نے زحافات کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی خوبی نہیں ہے۔ بلکہ شاعر کی کمزوری ہے۔ جو اس جواز سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کانوں کو یہ زحافات سخت ناگوار گزرتے ہیں۔ اور ان سے احتراز ہی لازم ہے۔ ورنہ اس قسم کی بحروں میں کچھ کہنا ہی نہ چاہئے۔

اس موقع پر آپ کے قافیوں کی جدّت طرازی کے متعلق چند شعر لکھے جاتے ہیں:۔

چلی لندن سے اک آندھی چمن میرا اُڑانے کو　　　غضب ہے اس میں کرزن کا بگولا بن کے بو لانا

چڑھا کنٹر بری کا پادری تو اپنے منبر پہ " کدھر ہیں آپ مولانا، جو تھے بالفضل اولانا
کہیں میں جا ھُو واکے نعرے سے تم کو نہ لرزا دوں مرا خوں گرم ہے پہلے ہی اور اس کو نہ کھولانا

مغربی تہذیب کے پتلے

سنو اچھی طرح اے مغربی تہذیب کے پتلو کہ ہم اتنا ہی اُبھریں گے، دباؤ گے ہمیں جتنا
سنبھل کر ڈالئے گا ہاتھ صاحب صنفِ نازک پہ کہیں محشر نہ بن جائے یہ عورت ذات کا فتنہ

یہاں چند ایسے اشعار جو تمسخر کی حد میں آگئے ہیں اور متانت و رزانت کے خلاف ہیں۔ درج کئے جاتے ہیں:

بہارستان صفحہ ۲۴۴ ، ہوئی پتلون ڈھیلی آبری کی
دیا گھوڑے کو جب انور نے کاوا

" " ۳۴۴ ، درّانیوں کی فوج جو میداں میں ڈٹ گئی
سقّے کی مشک ایک ہی ٹھوکر میں پھٹ گئی

" " ۳۴۴ ، خود کوہ دامنی ہی گرے اس پہ ٹوٹ کر
اچھا ہوا کہ جوتیوں میں دال بٹ گئی

" " ۶۱۹ ، شرع میں بھی ٹانگ اڑانے سے نہیں ڈرتے ذرا
ہم میں ایسے ایسے گستاخ اور نڈر پیدا ہوئے

آپ کے کلام ظرافت التیام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

چو کی لفظی تحقیق

(شیخ اور برہمن کی جھڑپ)

اشنان کرنے گھر سے چلے لالہ لال چند اور آ گئے آگے لالہ کے اُن کی بہو گئی!
پوچھا جو میں نے لالہ، للائن کہاں گئیں نیچی نظر سے کہنے لگے وہ بھی "چو" گئی
میں نے دیا جواب انہیں از رہِ مذاق کیا وہ بھی کوئی چھت تھی کہ بارش سے چو گئی
کہنے لگے کہ آپ بھی ہیں مسخرے عجیب اب تک بھی آپ سے نہ تمسخر کی خو گئی
"چو" ہوشیار پور میں ندی سے ہے مراد بی بی تمیز بھی وہیں کرنے وضو گئی
میں نے کہا کہ "چو" سے اگر ہے مراد "جو" پھر یوں کہو کہ تا بہ لبِ آبِ جو گئی
کیوں اینٹھتے ہیں ماش کے آٹے کی طرح آپ دھوتی سے آپ کی، نہیں ہلدی کی بو گئی

لطفِ زباں سے کیا ہو سروکار آپ کو — دامن کو آپ کے نہیں تہذیب چھو گئی
ہندی نے آ کے "جیم" کو "چے" سے بدل دیا — "چو" آئی کوہسار میں گلشن سے جو گئی
لہجہ ہوا درشت زباں ہو گئی کرخت — لطفِ کلام و شستگیٔ گفتگو گئی
معنی کو ہے گلہ کہ ہوا بے حجاب میں — شکوہ ہے لفظ کو کہ مری آبرو گئی
افسوس ملک میں نہ رہی فارسی کی قدر — مستی اڑی شراب سے پھولوں سے بو گئی

مالوی جی کی یاد میں

دیکھ کے حال ملک کا آ گئے یاد مالوی — رہبرِ عناد مالوی، جانِ فساد مالوی
جن کو لقب دیا گیا پوجیہ پاد مالوی
تفرقہ کی زمین میں بغض کا بیج ڈال کر — فتنہ کے کھیت کیلئے بن گئے کھاد مالوی
پوجیہ پاد مالوی، پوجیہ پاد مالوی
لاد کے اپنی پیٹھ پر حربۂ سنگ و خشت کو — مسلمِ خستہ سے چلے کرنے جہاد مالوی
پوجیہ پاد مالوی، پوجیہ پاد مالوی
کی ہے کھڑی مہاسبھا تاکہ ہو کانگریس تباہ — مانگ رہے ہیں قوم سے کام کی داد مالوی
پوجیہ پاد مالوی، پوجیہ پاد مالوی
دوست سے دوست ہے الگ بھائی سے بھائی ہے جدا — ملک میں پھوٹ ڈال کر کیوں نہ ہو شاد مالوی
پوجیہ پاد مالوی، پوجیہ پاد مالوی
نہرو دیدہ ور نے گر بات کوئی کھری کہی — اس پہ وہیں برس پڑے کور سواد مالوی
پوجیہ پاد مالوی، پوجیہ پاد مالوی
گائے کی دم ہلائیے، ماش کی دال کھائیے — ہم کبھی کہیں پھر آپ کو پوجیہ پاد مالوی
پوجیہ پاد مالوی، پوجیہ پاد مالوی

فاعتبروا یا اولی الابصار

نظر آتے ہیں اب تک بھی مسلمانوں کی محفل میں — کہیں شاعر کہیں بھڑوے کہیں بھانڈ اور کہیں رنڈی
حریفِ گرم رو گوگل سے چڑھ دوڑا مدینے پر — مگر ان کے لئے ہے "یا تو بتی" یا سڑک ٹھنڈی

خدارا اِن کی آنکھیں مولوی احمد علی کھولیں " دکھادیں سنگٹھن کی ان کو لہراتی ہوئی جھنڈی
پھر اُن کو لے چلیں شدھی کے بنیوں کی دکانوں پہ چلن جن کا ہے سودا تولنا اور مارنا ڈنڈی
خبیثیں اور خبیثات آجکل ہیں خوب زوروں پہ اگر ہے سنگٹھن سنڈا تو شدھی بھی ہے مشٹنڈی
جنہیں لینی ہو گالی، لے لیں "پرتاب" ایک آنہ میں کہ سستا کر چکی ہے بھاؤ اپنا کفر کی منڈی
خدا محفوظ رکھے، اِن دیانندی حریفوں سے قیامت کی ہے چال ان کی، بلا کے ہیں یہ پاکھنڈی

آپ کے منتخب اشعار ذیل میں درج ہیں :-

ضبطی

زمیندار مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۲۷ء کے تمام پرچوں کی ضبطی پر جس میں ذبیحۂ بقر پر مقالۂ افتتاحیہ شائع ہوا تھا -

دل ضبط، زباں ضبط، فغاں ضبط، قلم ضبط دنیا میں ہوئے ہونگے یہ ساماں کہیں کم ضبط
آنسو مری آنکھوں کے گئے پہلے ہی سے سوکھ تھے ورنہ وہ اِس فکر میں ان کا بھی ہو نم ضبط
پنجاب میں یوں ضبط ہوا آج زمیندار بنگال میں جس طرح ہوا کرتے ہیں بم ضبط
آزادیٔ اسلام کی ضبطی پہ ہے خوش تو ہو جائے کہیں یوں ہی نہ تیرا بھی دھرم ضبط
برطانیہ کا شیوہ نہ اگر یہی کچھ روز سن لو گے عزیزو کہ ہوئے دیر و حرم ضبط

آریہ اخباروں کے مسلمان قلم کاروں کا ترانہ (۷ نومبر ۱۹۲۷ء)

لڈو ہمیں کھلوا دو ٹھرّا ہمیں پلوا دو جانا ہے تھیٹر تک کچھ پیسے بھی دلوا دو
پھر کرنے کو حاضر ہیں ہم ہجو پیمبر بھی
اور حملہ خدا پر بھی ہم پیٹ کے بندے ہیں
کعبہ کو مٹا دیجے قرآن جلا دیجے اسلام کی خاکستر گنگا میں بہا دیجے
اُجرت ہمیں ملتی ہے جب آریوں کے گھر سے
"پرتاب" کے دفتر سے روٹی کے یہ دھندے ہیں
ناموس عرب کیسا یثرب کا ادب کیسا بے مایہ جو ہوا ایسا کعبہ کا وہ رب کیسا
ہم رہتے ہیں بھارت میں لچھمی کا جو زیور ہے
کانِ گہر و زر ہے چاندی کے یہ پھندے ہیں

ہم بھوکے ہیں روٹی کے　محتاج لنگوٹی کے　روزی کے لئے مضمون　لکھ دیتے ہیں چوٹی کے
اسلام کے بے فکرے　چلاتے ہیں چھلا کر
اور ماتھے پہ بل لا کر　مضمون یہ گندے ہیں　گالی کے پلندے ہیں

آموختہ

کیا حکومت نے چند دن کے لئے جو زنداں میں بند تجھ کو
تو شکرِ حق کر کہ راہِ حق میں پہنچ رہا ہے گزند تجھ کو
جس آزمائش میں پڑنے والے حیاتِ جاوید پا چکے ہیں
اُس امتحاں کے لئے کیا ہے ترے خدا نے پسند تجھ کو
جو تجھ کو صیاد چھوڑ دیتا سمجھ کے صیدِ زبوں تو کیا تھا
کشاں کشاں لے گئی حرم تک مگر خود اُس کی کمند تجھ کو
حسینؑ کا سر ہے آسماں پر کہ رہ چکا تھا کبھی سناں پر
تو کم سے کم سر بکف تو ہو جا جو سر ہے کرنا بلند تجھ کو
بھرا ہوا زہر کا پیالہ جو آگے آئے تو اس طرح پی
کہ گھول کر دے رہا ہے گویا حریف ساغر میں قند تجھ کو
زمیں کو لرزا، فلک کو چکرا، عرب کو گرما، عجم کو تڑپا
ملا ہے فطرت کی ارجمندی سے دل اگر دردمند تجھ کو
وہی ہو انداز بسملی کا جو شیوۂ ترکِ نیم جاں ہے
اگر کٹانا پڑے محمدؐ کے نام پر بند بند تجھ کو
یہ چند نکتے ہیں اس سبق کے جو تو کئی بار پڑھ چکا ہے
وہی بھلائی ہوئی حقیقت سکھاؤں پھر تا بچند تجھ کو

بھارت کی دو بلائیں

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر، اک گاندھی ہے
ایک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

لب پہ ہے صدا آزادی کی اور دل میں ہے شوق غلامی کا
اُکھڑی تھی ہوا انگریزوں کی، اِن دونوں نے پل کر باندھی ہے

سرنگاپٹم

(سلطان ٹیپو کے مزار پر دو آنسو)

اے سرنگاپٹم، اے گنجِ شہیدانِ کرام — آخری وقت میں اسلام کی غیرت کی نمود
تیری آنکھوں میں ہے اپنوں کا عروج اور زوال — تو نے دیکھا ہے پرایوں کا ہبوط اور صعود
کام میں لا نہ سکی تھی جسے خاکِ دہلی — تیرے ذرّوں نے دکھا دی وہ حجازی بارود
کشورِ ہند کا رنگ اور ہی ہوتا کچھ آج — مکر کا دام بچھاتا نہ اگر چرخِ کبود
سو رہا ہے ترے پہلو میں وہ میسور کا شیر — مایۂ ناز تھا ملت کے لئے جس کا وجود
قوّتِ بازوئے اسلام تھی اس کی صولت — اس کی دولت کے ہوا خواہوں میں شامل تھے ہنود
کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے — اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسود
اُس کے اُٹھتے ہی مسلمان کا گھر بیٹھ گیا — تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قعود
آخری قول یہ اُس کا نہ ہمیں بھولے گا — جس سے قائم ہوئیں آئینِ حمیّت کی حدود
شیر اچھا ہے جسے مہلتِ یک روزہ ملی — یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود
دلِ حسرت زدہ میرا ابھی گیا ساتھ جب آج — اُس کے مرقد پہ گئے یاس و تمنّا کے وفود
پھر گئی آنکھ میں فردوسِ بریں کی تصویر — ظلِ ممدود میں تھا جلوۂ سدرِ مخضود
اُس کی دہلیز سے لپٹی ہوئی تھی رحمتِ حق — چومتے تھے جسے جھک جھک کے ملائک کے جنود
آئی گنبد سے ندا اے کہ تری پیشانی — رات دن درگہِ داور پہ ہے وقفِ سجود

بہ سرِ تربتِ من چوں گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود

مَیں نے کی عرض کہ اے فطرتِ آزاد کی رُوح — توڑ دی جس نے سکھائی ہیں غلامی کی قیود

بہ زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

صلوا علیہ و آلہ

وہ شمعِ اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دُنیا کے درباروں میں
گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں
جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں
وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئے دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں
ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکر و عمر، عثمان و علی
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

شانِ اسد اللّٰہی

ہو دیکھنی جس کو اسد اللہ کی تصویر
شیرانِ مراقش کو بپھرتا ہوا دیکھے
بگڑی ہوئی تقدیر کے بننے کا تماشا
افریقہ کے صحرا سے گزرتا ہوا دیکھے
جس جذبہ سے وہ جاتی تھیں باطل کی اُمنگیں
پہلو میں پھر آج اُس کو اُبھرتا ہوا دیکھے
چڑھتی ہوئی توحید کی ندی کے مقابل
تثلیث کے دریا کو اُترتا ہوا دیکھے
جو مندمل بہ تیغ عیسیٰ نہیں ہوتا
اِس رِستے ہوئے زخم کو بھرتا ہوا دیکھے
مشاطۂ مغرب کے اُبٹنے کے اثر سے
اِسلام کی رنگت کو نکھرتا ہوا دیکھے
جاتا ہوا دیکھے چمنستاں سے خزاں کو
گلشن کو بہاراں میں سنورتا ہوا دیکھے
سرو و سمن و لالہ کے جنگل میں صبا کو
ہر شاخ پہ اٹھکھیلیاں کرتا ہوا دیکھے

طوفانِ عظیم حیدرآباد دکن ۱۹۰۸ء

او نامراد ندی! تجھ پر غضب خدا کا
الٹا ہے تو نے تختہ یارانِ آشنا کا

ہم سے تو وہ وفائیں اور تجھ سے یہ جفائیں — بدلا دیا ہے تو نے اچھا ہمیں وفا کا
اچھا کیا ادا حق ہمسائگی کا تو نے — ہم تجھ سے لو لگائیں تو نے ہمیں کو تاکا
اک کاروانِ آصف اترا ترے کنارے — او نا سپاس! تو نے ڈالا اسی پہ ڈاکا
تیری ہر ایک ٹکر راعی بنی اجل کی — تیرا ہر اک تھپیڑا قاصد بنا قضا کا
منجدھار میں ہے کشتی ٹوٹا ہوا ہے لنگر — سر پر ہے رات کالی طوفان ہے بلا کا
تقدیر ہنس رہی ہے تدبیر رو رہی ہے — مورد ہونا خدا کیوں الزام ناروا کا
شب ہے شبِ قیامت، دن ہے حساب کا دن — وقت آگیا سزا کا عہد آگیا جزا کا
خالی امید کا گھر دروازہ توبہ کا بند — آئے اثر کہاں سے موقع نہیں دعا کا

اس واقعے کا ماتم برسوں بپا رہے گا
کانٹا ہر ایک دل میں غم کا چبھا رہے گا

(۲)

امڈی ہوئی ہے ندی چھایا ہوا ہے بادل — پاٹ اس قدر بڑھا ہے سب ہو گیا ہے جل تھل
ہے سب نے دن دہاڑے اندھیر ڈال رکھا — خورشید خاوری ہے ابرِ سیہ کے اوجھل
اک بارگی گئے کھل گردوں کے سب دریچے — بادل چلا ہے بن کر طوفان کا ہراول
قدرت کی طاقتوں کو دستِ قضا ہی روکے — انساں کی کوششیں ہیں بیکار اور معطل
غصہ کا ہے یہ عالم کف در دہاں ہے ندی — وقفِ شکن ہیں ابرو، ماتھے پہ ہیں پڑے بل
جوش و خروش اس کا ہر لحظہ بڑھ رہا ہے — سہمی ہوئی ہے خلقت، ہوش و حواس ہیں شل
ساحل پہ گھر ہیں جن کے وہ دل میں کہہ رہے ہیں — مرنا ہمیں ہے آخر مرنا ہمیں ہے اول
پانی ہر اک طرف سے گھیرے ہوئے ہے گھر کو — جاں تلملا رہی ہے دل ہو رہے ہیں بیکل
گرنے لگے مکاں جب کہنے لگے مکیں سب — ہے آج کوچ اپنا ساماں چلا گیا کل
ہر ہر کھنڈر میں لاشے، صدہا پڑے ہوئے ہیں — بلدہ کا ہر محلہ، ہے کربلا کا مقتل
واں موجبِ اجل تھی پیاسوں کو تشنہ کامی — یاں باعثِ فنا ہے آبِ بقا کی چھاگل

محشر کا صور پھونکا موسیٰ نے کو بکو ہے
شورِ نشور برپا بلدہ میں سو بسو ہے

(۳)

واحسرتا وہ صد ہا گھر بار کا اُجڑنا
ہر نخلِ آرزو کا بنیاد سے اُکھڑنا

وہ نقشۂ اجل کا آنکھوں کے آگے پھرنا
کوہِ قضا کا سر پہ پل بھر میں ٹوٹ پڑنا

دیوار و بام و در کا پانی میں غرق ہونا
سنگیں عمارتوں کا پتّوں کی طرح جھڑنا

وہ جسمِ بے اماں کا موجوں کی نذر ہونا
وہ جانِ ناتواں کا کشتی قضا سے لڑنا

اُس ہاتھ کا نہیں ہے کچھ جس میں جان باقی
بہتے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں پکڑنا

ماں سے لپٹ لپٹ کر بچہ کا وہ بلکنا
اور ضد سے اُس کے سینے پہ ایڑیاں رگڑنا

بچہ کا ہاتھ آکر پھر ماں سے چھوٹ جانا
زخمِ جگر کے ٹانکوں کا یک بیک اُدھڑنا

سب دِل کے ولولوں کو پیوندِ آب کرنا
اک رات کی دُلہن کا نوشہ سے یوں بچھڑنا

وہ ڈوبتے ہوؤں کا سب کو سلام کرنا
اور اُن کی حسرتوں کا جا کر دلوں میں گڑنا

تھا فتنۂ قیامت اے سیلِ رودِ موسیٰ
من کر تِرا مچلنا، بن کر تِرا بگڑنا

شانِ جلالِ باری، قہرِ خدا کا نقشہ
ہر لہر کا بپھرنا، ہر موج کا اکڑنا

کیوں ساتھ اپنے لے کر چلا نہ ہم کو
جو قافلہ چلا ہے سرِ منزلِ عدم کو

سیماب

عاشق حسین نام اور سیماب تخلص ہے۔ جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء بروز دوشنبہ بوقت صبح اکبر آباد (آگرہ) کے محلہ خانی منڈی میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد مولانا محمد حسین مرحوم فاضل عصر اور عالم تبحر تھے۔ سیماب نے عربی ادب، اصول اور منطق کی تکمیل کی۔ اور فارسی میں بھی کافی دستگاہ بہم پہنچائی۔ پھر انگریزی پڑھنی شروع کی۔ جس وقت ایف اے کے آخری سال میں تھے۔ آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اور آپ کو سلسلۂ تعلیم بند کرنا پڑا۔ دو تین سال بعد شادی ہوگئی اور آپ کو بسلسلۂ معاش کانپور جانا پڑا۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کو شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوگیا تھا کانپور پہنچکر لکھنوی شعراء کے ساتھ مجالست کا اتفاق ہوا۔ اور یہ شوق ترقی کرتا رہا۔ ۱۸۹۸ء میں نواب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہوگئے غزلیں بغرض اصلاح حیدرآباد بھیجتے رہے۔ اور مرزا داغ مرحوم کی وفات تک یہ سلسلہ جاری رہا اُن کے انتقال کے بعد آپ نے پھر کسی کو غزل نہیں دکھائی اور بجائے خود استاد بن گئے۔ غزل کے علاوہ نظمیں بھی لکھنے لگے اور ملازمت ترک کرکے رسالے شائع کرنے شروع کئے۔ پہلے پیمانہ پھر تاج "زاں بعد شاعر" یہ چند رسالے نکالے۔ اور ہندوستان کا کوئی مشہور اور بڑا شہر ایسا نہیں ہے۔ جہاں آپ نے مشاعروں میں شرکت نہ کی ہو۔ موجودہ زمانہ کے شعراء سے کم آپ کی ملاقات اور بے تکلفی ہے۔ بقول خود آپ نے ۲۸۴ کتابیں لکھی ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے کار امروز اور کلیم عجم ہے۔ کلیم عجم غزلیات کا مجموعہ بھی ہے۔ اور خطبات شاعری کا بھی۔ البتہ کار امروز محض نظموں پر مشتمل ہے۔ جو بقول خود صرف بیس روز کا نتیجۂ فکر ہیں

کلام پر تبصرہ

مجموعۂ غزلیات میں تقریباً پونے چار ہزار اشعار ہونگے۔ آپ نے اپنی غزلیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۸ء تک سرمایۂ کہن کے نام سے دوسرا حصہ ۱۹۰۹ء

سے ۱۹۱۸ء تک بادۂ دوشیں کے نام سے اور تیسرا حصہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۵ء تک نشید نو کے نام سے شائع کیا ہے۔ اگرچہ آپ نے ترتیبِ کلام میں نشیدِ نو کو اول اور بادۂ دوشیں کو اس کے بعد اور صہبائے کہن کو سب سے آخر میں جگہ دی ہے۔

غزل میں آپ کا کوئی خاص رنگ نہیں ہے بعض اشعار ضرور اچھے ہیں۔ لیکن عام طور پر کلام میں کوئی کشش نہیں ہے۔ آورد اور تصنع زیادہ ہے۔ آمد کا نشان نہیں پایا جاتا۔ داغ کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے آپ کے کلام میں صفائی اور شستگی ہونی چاہئے تھی۔ صہبائے کہن میں یہ بات ہو تو ہو۔ نشیدِ نو میں تو ہرگز اس کا پتہ نہیں۔ تغزل میں جو جدت طرازی دورِ حاضر کا حصہ ہے۔ آپ نے بھی اسی رنگ کو نباہنے کی کوشش کی ہے مثلاً:۔

چھپے نہ دیکھ سکیں میری ظاہری آنکھیں ، وہ مجھ سے روح کی خلوت میں غائبانہ ملا

یہ اعتبار مرا یا ترا تصرف تھا جدھر گیا مجھے تیرا ہی آستانہ ملا

وفا کی سطح سے گذری ہوئی ملی دنیا غرض کے رنگ میں ڈوبا ہوا زمانہ ملا

بہرحال غزلیات ہی میں آپ کی عمر بسر ہوئی ہے۔ اور یہی آپ کا سرمایۂ حیات ہے۔ نظمیں حال ہی میں کہی ہیں۔ اور صرف بیس دن کی کمائی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پُرگو اور زود گو دونوں ہیں لیکن یہ دونوں باتیں ہمارے نزدیک کمالِ شاعر نہیں بلکہ نقصِ شاعر ہیں۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ خواہ ایک گھنٹے میں کہیں یا ایک مہینے میں۔ دس بیس شعر کہیں یا سو دو سو کہیں۔ اس سے کچھ بحث نہیں۔ غرض یہ ہے کہ کلام عمدہ ہو اور قابلِ قبول ہو۔ اگر یہ بات نہیں ہے۔ تو آپ کی پُرگوئی اور زودگوئی دونوں بیکار ہیں۔ اور ہم نے تو اکثر یہی دیکھا ہے۔ کہ پُرگوئی اور زودگوئی دونوں اپنے خراب نتائج سے خالی نہیں ہوتیں۔ آپ کے کلام میں یہ بات جگہ جگہ پائی جاتی ہے۔ کہ اس کا طرزِ ادا غیر فطری ہے۔ خواہ مضمون بالکل فطرت کے مطابق ہو مثلاً

کچھ تو اس دن کے لئے محفوظ رکھتے مستیاں یہ تجھے کیا سوجھی کہ پی لی ہے پیالی شراب

"مستیاں محفوظ رکھنا" خلافِ روزمرہ ہے اور غیر فطری طریقۂ بیان ہے۔

اے غمِ عشق ترے طرف میں کچھ آگ بھی ہے؟ آنسوؤں سے تو علاجِ تپشِ دل نہ ہوا

"ترے ظرف میں کچھ آگ بھی ہے؟" یہ اندازِ بیان بالکل غیر فطری ہے۔

شغل کیسے دکھاؤں کہ ہے زندگی اداس اے شمع کیا جلاؤں کہ دل ہے بجھا ہوا

"زندگی اداس ہے" معلوم نہیں یہ کیا طرزِ گفتگو ہے:۔ آپ اسے طرزِ بیان کی جدت

کہئے یا جو چاہے کہئے - میرے نزدیک یہ طریقہ مناسب نہیں ہے - اور مَیں اِس کو فطرت کے مطابق نہیں سمجھتا - اگر اگلے بزرگ غیر فطری مضامین باندھتے تھے - تو آپ طرزِ ادا ایسا اختیار کرتے ہیں - جو خلافِ فطرت ہے - شعر ہمیشہ وہی پسند کیا جائیگا جو لفظاً و معنیً فطرت کے عین مطابق ہو -

آپ کا ایک مقطع ہے

سیمابؔ ہم ہیں عیب و ہنر خود ہیں بے حساب ہم کیا کسی کے عیب و ہُنر پر نظر کریں

بظاہر شاعر نے خاکساری کا اِدّعا کیا ہے - لیکن آئینہ خودی کو ٹھیس نہیں لگنے دی - پہلے مصرع سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سیمابؔ میں جہاں عیب ہیں - وہاں بے حساب ہنر بھی ہیں - حالانکہ سیمابؔ کا منشاء محض اظہارِ خاکساری تھا - اور حقیقتاً پہلے مصرع میں صرف عیب ہی کا اظہار ہونا چاہیے تھا ہنر کا ٹکڑا بالکل بے جوڑ ہے - لیکن مصرعہٴ ثانی میں عیب و ہنر ٹھیک استعمال ہوئے ہیں - کیونکہ وہاں عیب و ہُنر پر نظر کرنے کے معنی نکتہ چینی ہو گئے ہیں -

بایں ہمہ آپ کی قدیم غزلیں صفائی اور روانی کے لحاظ سے اور بادہ و شین کی غزلیں جدّت طرازی کے لحاظ سے اچھی ہیں - نشیدِ نو کی غزلیں بھی بُری نہیں ہیں - لیکن طرزِ ادا غریب اور نامانوس ہونے کی وجہ سے اُن میں دلکشی نہیں ہے - خود فرماتے ہیں :-

میخانۂ سخن کا گدائے قدیم ہوں ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے

یعنی آپ کے کلام میں داغؔ کا بھی رنگ ہے - غالبؔ و مومنؔ کی بھی تقلید ہے - اور دورِ حاضر کے بھی خیالات ہیں - لیکن آپ کو کامیاب غزل گو نہیں کہا جا سکتا - البتہ بعض اشعار کاوشِ فکر کا پتہ دیتے ہیں - اور بعض اشعار مضمون آفرینی کی وجہ سے قابلِ قدر ہیں - جس کے باعث آپ کو ہم نے اپنے تذکرہ میں جگہ دی ہے -

آپ نے "کارِ امروز" کے نام سے نظموں کا مجموعہ چھاپا ہے - اِس مجموعہ کی بعض نظمیں ایسی ہیں جو کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے پر لکھی جائیں تو بہتر ہوتا - مثلاً انقلابِ روس، محمد علی (جب وہ زندہ تھے یا فوراً اُن کے انتقال کے بعد) داغؔ (جب اُن کا انتقال ہوا) میر ناصر علی خاں (فوراً انتقال کے بعد) وغیرہ وغیرہ - اب تو یہ نظمیں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے - کہ شاعر کو اپنی قادر الکلامی اور زود گوئی کا مظاہرہ کرنا منظور ہے - ورنہ اُس کے دل میں کوئی چوٹ نہیں لگی - جو اُسے اِن نظموں کے کہنے پر اُکسا رہی ہے - شاعر اِس مجموعہ سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ وہ جس مضمون پر چاہے قلم برداشتہ نظم لکھ سکتا ہے - لیکن اُس کو یہ خیال نہیں رہا - کہ ایسی

نظموں کی وقعت نہیں ہوتی۔ سطحی طور پر لوگ تعریف کر دیں۔ مگر قلب پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا جب شاعر کسی واقعہ یا حادثہ سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہے۔ تو اس کا اثر مدت تک قائم رہتا ہے بلکہ جب تک شعر زندہ رہتا ہے۔ اس کا اثر بھی نہیں مٹتا۔

جناب سیماب نے غالباً نظموں کا مقصد بھی خیال آرائی کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا۔ غزل گوئی میں سب سے بڑا عیب یہی ہے۔ کہ ہم لوگ رسماً یا تقلیداً شعر کہتے ہیں اور زیادہ تر قافیہ پیمائی کرتے ہیں کبھی کبھی لفظوں کے الٹ پھیر سے کوئی اچھا مضمون بھی نکل آتا ہے اگر نظموں کی بھی یہی صورت رہی جو غزل گوئی کی ہے۔ تو واسے بر حال ما۔

"آزادی" کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ جس کا دوسرا شعر ہے:۔

سیاہ و مست لمبے بال پیچ و خم سے بیگانہ
نشیلی انکھڑیاں لیکن مذاق رم سے بیگانہ

بال کی تعریف سیاہی اور درازی دونوں درست لیکن بالوں کا مست ہونا آج تک نہیں سنا۔ کیا بے جان اشیا بھی مست ہو سکتی ہیں؟ یا بال جاندار شے ہے؟ جب ہیں روز میں ایک پوری کتاب لکھی جائیگی۔ تو اس میں ایسی ہی باتیں نظر آئیں گی۔ انکھڑیاں دورِ سوم کے شعرا استعمال کرتے تھے دورِ پنجم اور دورِ ششم کے شعراء نے اس کو متروکات میں شمار کیا۔ لیکن دورِ ہفتم کے شعرا انکھڑیاں استعمال کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم بھی مخل نہیں ہوتے۔ اسی نظم میں ایک اور شعر ہے

زباں پہ نغمۂ ناقوس سے تنویر کی موجیں
لبِ خود رنگ پہ مچلی ہوئی تکبیر کی موجیں

یہ لبِ خود رنگ کے کیا معنی ہیں؟۔ خود رنگ خود ساختہ ترکیب ہے اور بے معنی۔

صفحہ ۲۴۴ پر ایک شعر ہے:۔

سوادِ خاطرِ مجروح میں ویرانی جھلکتی ہے
نظر کی غنچگی کو مژدۂ فصلِ بہاری دے

نظر کی غنچگی، یہ بھی خود ساختہ ترکیب ہے۔ اگر یہ ر چاچی کی تشبیہات اور خود ساختہ تراکیب بہت پسند ہیں تو آپ کو مبارک ہوں لیکن اس قسم کی صناعی قبولِ عام کی سند نہیں حاصل کر سکتی۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ یہ فارسی ترکیب ہے اور فارسی میں رائج ہے۔ اگر یہ فارسی میں رائج بھی ہے۔ تو اردو میں یہ رائج نہیں ہے۔ لہذا قابلِ تسلیم نہیں۔

ذیل میں آپ کا منتخب کلام درج کیا جاتا ہے:۔

سب اپنے دل میں اک تیرِ نظر محسوس کرتے ہیں
مگر کوئی بتا سکتا نہیں اس نے کدھر دیکھا

نظر آتا نہ تھا جو گردِ افکار و حوادث میں
وہ ساحل آنکھ نے طوفانِ غم میں ڈوب کر دیکھا

ہو کتنی ہی خوشگوار پھر بھی
ہے دل کے لئے بلا تمنا

دیتے ہو پیامِ آرزو تم
جب ترک میں کر چکا تمنا

جب تک غمِ الفت کا عنصر نہ ملا ہوگا
انسان کے پہلو میں دل بن نہ سکا ہوگا

نہ تھا وہ بھید کہ دنیا مجھے سمجھ لیتی
میں خود بھی اپنے سمجھنے میں کامیاب نہ تھا

یہ ایک راز تھا اعلانِ عفو میں اُن کے
کہے نہ کوئی کہ انساں گناہ کر نہ سکا

موت، سنتے ہیں کہ ہے دردِ محبت کا علاج
مر ہی جاتا میں اگر قابلِ درماں ہوتا

یوں تو شادگی ہے مذاقِ سرِ نیاز
سجدہ وہ تھا جو تیرے قدم پر ادا ہوا

ہستی و نیستی کی حدیں دور رہ گئیں
یہ آ گیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتا ہوا

اب میرے دلِ خوں گشتہ کی ہر موج تمنا پر دہ ہے
پابوسِ محبت کر کے مجھے پیرا یہ تمنا کر نہ دیا

رفتہ رفتہ سمجھ میں آ سکے گا
میرا نغمہ ہے دور کی آواز

کبھی پھول بن کر کبھی اشک بن کر
ہو رنگینیِ دامن و آستیں تم

اک تڑپ رکھتے ہیں دل میں بہت جمد کا شانہ ہم
کیوں کسی سے مانگنے جائیں چراغِ خانہ ہم

دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا
کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

شباب اک سانحہ تھا، ہو چکا اب حسرت کا ہنستی
مری راہیں مجھے الجھا گئیں خوابِ پریشاں میں

معمورۂ فنا کی کوتاہیاں تو دیکھو
اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

درائے صبح کی آواز ہے نہ بانگِ جرس
خیال ہے کہ میں اپنے کارواں میں نہیں

اب تک ہے نازِ حسن کو تاریخ طور پہ
اے عشق کاش تو کبھی آتا جلال میں

مراد ہے ترے جلووں کی خلوتیں سمجھا تھا
حقیقت یہ ہے خود اپنی حقیقت میں نہ سمجھا تھا

میں ہو کر خاک اے سیماب جزوِ کل ہوا آخر
مرے شیرازۂ ہستی کو راس آیا بکھر جانا

عبودیت بقدرِ ذوق، شایانِ نوازش ہے
خلوصِ دل سے اک سجدہ بہت ہے زندگی بھر میں

تعجب کیا لگی گر آگ اے سیماب سینے میں
ہزاروں دل میں انگارے بھرے تھے لگ گئی ہوگی

بیخودی میں بھی نہ بھولا میں رہِ منزلِ دوست
سرخوشی میں بھی مرے پاؤں کو لغزش نہ ہوئی

سوزشِ کدۂ محشر کہاں اور کہاں میں!
یہ دیکھنے آیا ہوں، یہاں لو تو نہیں ہے

یہ کیا جانے میں جانا ہے کہ جاتے ہو خفا ہو کر
میں جب جاؤں مرے دل سے چلے جاؤ جدا ہو کر

ہر چیز پہ بہار تھی، ہر شے پہ حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

ے ادا ہوا، کیا گیا تھا

مشرق سے مغرب کو

وطن سے جاتے ہیں چھوڑ کر تسکیں فزا عالم
نظر میں اک نیا ہنگامہ، دل میں اک نیا ماتم

بہاروں کی یہ آمد، یہ ہماری ناگہاں رخصت
شگفتِ لالہ و گل، اور اپنا سینۂ پُر غم

یہ ہر ذرے میں اک میخانہ، ہر میخانہ اک مستی
یہ جوشِ رقصِ برگ و گل یہ در افشانیِ شبنم

یہاں کی خاک سے بھی عنبر و اکسیر پیدا ہے
بیابانِ وطن فردوسِ جنت سے نہیں کچھ کم

وطن کا امن، گھر کا عیش دامن گیر سہی لیکن
مرادِ منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم

جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

اِدھر فکرِ وطن میں رات دن مغموم جان و دل
اُدھر یہ شور آوازیں "سفر کرنے سے کیا حاصل؟"

اِدھر اپنا تہیّہ "اپنی منزل لے کے دم لیں گے"
اُدھر یہ فیصلہ "تم رہنمائی کے نہیں قابل"

اِدھر دعویٰ ہمارا یہ کہ "ہم حق کے معاون ہیں"
اُدھر بے اعتمادی یہ کہ "ہے ہر ادعا باطل"

اِدھر درپیش راہِ دور اور اس میں بھی سرحد ہے
اُدھر عزمِ سفر پہ منچلے اور طعنۂ محفل

بھلا ان مشکلوں کا کون کر سکتا ہے اندازہ
شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل

کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحلہا

ہوا ہے ہم سے سرزد کونسا جرم شدید آخر؟
محبت کی وہ کیوں کرنے لگے قطع و برید آخر

کہاں استادِ مغرب اور کہاں بازی گرِ مشرق
کہیں استاد کو پہنچا ہے، شاگردِ رشید آخر

کھنچے بیٹھے جو تھے خلوت میں اپنی وضعداری کی
وہ خود کرنے کو آئے صلح کی گفت و شنید آخر

اِسی کوشش میں یا ہم بھی چلے ہیں جانبِ مغرب
کہ یہ تاریک راتیں ہوں جوابِ صبحِ عید آخر

تمنا ہے کہ لوٹیں تو نہ یہ کہنا پڑے ہم کو
ہمہ کارم ز خود کامی بہ ناکامی کشید آخر

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

امتحانِ شیخ و برہمن

گئے وہ دن کہ حامی باغباں کے تھے گل و لالہ
کہ اس میں خود نمائی ہے، تو اس میں شانِ خود رائی

خزاں اب کے چمن میں انقلابی بن کے آئی ہے
ہر اک گوشے میں ہے بیگانگی کی کار فرمائی

ترو تازہ نظر آتا ہے "تا قربان" گلشن میں
اگرچہ ننگ و غیرت ہے طراوت کی پذیرائی

حرم سے بتکدے تک ہر فضا پر یہ شکوہ ہے
نہیں اب قابلِ برداشت اغماضِ کلیسائی

سرِ افراد میں پیدا ہوئی تمکینِ خود داری
نہ اب وہ آستاں بوسی نہ اب وہ جبہ سائی

کہیں پر شور ہے ساحل کہیں ہنگامہ زا محفل
قیامت بن کے اک شورش ہے دنیا میں اتر آئی

وطن کے شیفتہ سرشار احساس وطن سے ہاں
فدا ہیں ملت مرحوم پہ ملت کے شیدائی

نہ ہے خاموش مسلم اور نہ ہندو مائل تسکیں
نہ اس میں صبر کی قوت نہ اس میں ہے شکیبائی

الا اے انقلاب ملک یہ وقت تدبر ہے
نہ ہو جائے کہیں نقص عمل سے تیری رسوائی

الا اے رہبران قوم ہنگام تفکر ہے
قدم راہ ترقی سے نہ ہو مجبور پسپائی

ضرورت ہے کہ ہو ہر کام میں اک متحد کوشش
غنیمت ہے جو ہو اس وقت احساس گوارائی

رواداری اسی منزل میں شرط کامیابی ہے
اسی منزل میں ربط باہمی ہے فرض یکجائی

سکوں کیسا اٹھو اپنے جادۂ مقصد پہ جا پہنچو
مزہ جب ہے کہ شورش ہو نہ ہو ہنگامہ آرائی

کہاں فرقہ پرستی اور کہاں سودائے آزادی
یہاں تو "وحدت قومی" ہے شرط جادہ پیمائی

وفا اک جذبۂ محمود ہے جس میں ہو جتنا ہو
وفا کا امتحاں دو ہے اگر دعوائے دانائی

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی

وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

مزدور

گرد چہرے پر، پسینے میں جبیں ڈوبی ہوئی
آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی

پیٹھ پر نا قابل برداشت اک بار گراں
ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جھریاں

ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا

پاؤں مٹی کی تہوں میں میل سے چکٹے ہوئے
ایک بدبودار میلا چیتھڑا باندھے ہوئے

جا رہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا
ہانپتا، گرتا، لرزتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا

مضمحل واماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
[illegible] کی آرزو [illegible] کا خیال

اپنے ہم جنسوں کی بے دردی سے پامال [illegible]
[illegible] قسمت و [illegible]

اپنی خلقت کو گناہوں کی سزا سمجھے ہوئے
آدمی ہونے کو لعنت اور بلا سمجھے ہوئے

زندگی کو ناگوار اک سانحہ جانے ہوئے
[illegible] فرض اپنا پہچانے ہوئے

راستے میں راہگیروں کی نظر سے بے نیاز
شورش عالم سے انسانوں کے اثرات سے بے نیاز

اس کے دل تک زندگی کی روشنی جاتی نہیں
بھول کر بھی اس کے ہونٹوں پہ ہنسی آتی نہیں

ایک لمحہ بھی نہیں فکر معیشت سے نجات
[illegible]

دیکھ اے قارون اعظم دیکھ اے سرمایہ دار
نامرادی کا مرقع ہے کسی کا [illegible]

گو ہے تیری ہی طرح انسان مگر مجبور ہے
دیکھ لے دولت کے [illegible] یہ مزدور ہے

ندرت

ش

عیب احمد نام ندرت تخلّص ہے۔ مولانا احمد حسین شوکت (مجدد السنۃ مشرقیہ) کے خلف الرشید ہیں۔ شاعری کا حصّہ پدرِ بزرگوار سے پایا ہے۔ شوکت مرحوم فارسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ شرح قصائد خاقانی و نکات بیدل وغیرہ آپ کی تصانیف سے ہیں۔ ندرت غالباً ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ اور میرٹھ ہی میں نشو و نما پائی۔ عربی، فارسی اپنے والد سے پڑھی۔ شاعری کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ غالباً اپنے والد ہی سے مشورۂ سخن کیا ہے۔ اور اس فن کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ آپ کے والد نے ۱۹۲۲ء میں وفات پائی۔ اور اس وقت سے آپ کی ذمہ داریوں میں بیحد اضافہ ہو گیا۔ پریس کا انتظام اور اخبار "آئینہ" کی اشاعت کا کام آپ ہی سر انجام دے رہے ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ آپ کے چار بیٹے اور ایک شش سالہ بچی پے بہ پے آپ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ اب صرف ایک لڑکا موجود ہے۔ خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ اولاد کے زندہ نہ رہنے کا غم سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

سوگوارِ دلِ مرحوم ہوں رنجور ہوں میں   مجھ کو جی بھر کے تڑپنے دو کہ مجبور ہوں میں

ضبط کہتا ہے کہ نکلے نہ لہو کی کوئی بوند   قلب کہتا ہے کہ رستا ہوا ناسور ہوں میں

اب نہ چھیڑیں مجھے انفاس بھی آتے جاتے   جب سے دل ٹوٹ گیا ہے ہمہ تن چور ہوں میں

گو اب اک نقشِ خیالی ہے مرا نقشِ وجود   دامِ ہستی میں مگر قید بدستور ہوں میں

مزاج بہت سادہ ہے۔ خود کہتے ہیں:۔

اللہ بخشے آدمی ندرت بھی خوب تھا   تھے اس میں لاکھ عیب مگر اک خودی نہ تھی

نکتہ سنج اور نکتہ رس واقع ہوئے ہیں۔ خدا سے بزرگ تا دیر قائم رکھے۔ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔

کلام پہ تبصرہ

کئی سال ہوئے۔ میں نے غازی آباد میں حضرتِ ندرت کا ایک مطلع سنا تھا۔ اور اس کو سنکر

یہ خیال ہوگیا تھا۔ کہ ندرت اچھے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ مطلع یہ ہے:-

بگولے اس لئے منڈلا رہے ہیں میرے مدفن پر
کہ یہ دھبہ بھی کیوں باقی رہے صحرا کے دامن پر

میرٹھ میں اگر آپ کا کلام خود آپ کی زبان سے سُنا۔ آپ کی وضع و قطع اگرچہ قدامت پرستی کا مظاہرہ ہے لیکن خیالات میں جدت اور تنوع ہے۔ جذبات و حسیاتِ انسانی کا اظہار نازک ادائی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ آپ کے کلام کی خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ غیر مانوس تراکیب اور اجنبی الفاظ کو دخل نہیں دیا جاتا۔ پختگی اور روانی و شستگی پائی جاتی ہے۔

حال ہی میں آپ کا کلام خوننابۂ دل کے نام سے شائع ہوا ہے۔ پہلے حصہ میں زیادہ تر وہی کلام ہے۔ جو پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اور اب جدید کلام کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ تاکہ ایک ہی مجموعہ رہے۔ نیا کلام دوسرے حصہ میں ہے۔ اور درحقیقت اسی میں ندرت نمایاں ہیں قدیم کلام کا طرزِ ادا بھی قدیم ہے۔ اور خیالات بھی وہی فرسودہ اور کہنہ ہیں۔ مثالاً چند اشعار لکھتا ہوں:—

آئے ہیں اس انداز سے وہ منہ کو چھپائے
پڑتی نہ ہو اُن پر تو پڑے میری نظر اور

غیر تھا ساتھ مگر پھر بھی وہ گھبرا ہی گئے
رل گیا میں تو کہا آپ کے گھر جاتے ہیں

وہ گھبرا ہی گئے آخر کو جانبازوں کی کثرت سے
کبھی چھریاں نکلتی ہیں کبھی خنجر نکلتے ہیں

دشمن سے تعلق ہے مگر چھپ رہے مجھ سے
جاتے ہیں اُدھر کو تو گزرتے ہیں اِدھر کو

وہ بگڑیں اور کوئی چھوٹی سچی پھر دی پہ ہو
وہ بولیں اور بلائے جاتے انکی ہاں میں ہاں کوئی

میرے گھر آپ اگر غیر کے گھر سے آئے
مجھ پہ احسان نہیں آہ کے ڈر سے آئے

رعایت لفظی آپ کے یہاں بہت کم ہے۔ ایک آدھ جگہ نظر آجاتی ہے مثلاً:-

انہیں ظالم کہا تھا مجھ پہ لے کر تیغ آئے
مثل یہ سچ ہے کہ سچی بات میں آدھی لڑائی ہے

تقریباً ڈھائی ہزار اشعار غزل کے ہونگے۔ چار مخمس ہیں۔ کچھ رباعیاں ہیں۔ اور آخر میں کچھ نظمیں بھی ہیں نظمیں تو معمولی ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر آپ تغزل ہی کے دلدادہ رہے ہیں۔ البتہ اب زمانے کے حالات سے متاثر ہو کر کچھ نظمیں کہنے لگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس صنعت پر آپ ابتداء سے اپنا زورِ کلام صرف کرتے رہے ہیں۔ وہی کچھ آپ کے لئے سامانِ افتخار ہو سکتی ہے۔ اس لئے آپ کی شاعری غزلوں ہی میں نظر آتی ہے۔

زبان کی سلاست اور روانی دیکھئے:—

خنجر کو رکھ کے میان میں بیٹھے ہیں مطمئن — جیسے ہمارا قتل کوئی بات ہی نہ تھی
جو مر گیا ہو اُس کی تمنا کا ذکر کیا — یہ بحث اب فضول ہے تھی تھی نہ تھی نہ تھی
اپنی بدنامی کے ساتھ ان کو بھی رسوا کرنا — اور اے حضرتِ دل آپ سے ہونا کیا ہے
دیکھا ہے ان کو، ان کی شکایت بجا تو ہے — ہم نے خطا تو کی ہے، ہماری خطا تو ہے
ترا شکوہ روزِ جزا ہم کریں گے! — ارے بدگماں ڈر خدا کے غضب سے

جدّتِ خیال کی مثالیں:-

سُننا کسی کی بات نہ کہنا کسی سے کچھ — اک قسم کا سکون تو ہے بیخودی سے کچھ
یا زندگی ہی کام کی ہم کو رہی نہ تھی — یا کام ہی لیا نہ گیا زندگی سے کچھ
یہ بھی ہے واقعہ کہ جگر ہو گیا دو نیم — یہ بھی ہے سچ کہ اُن کی نظر تھی چھری نہ تھی
ہوا پا نہیں سکے بازارِ جہاں میں لالہ و گل بھی — زمیں سے قرض لے لے کر متاعِ رنگ و بو نکلے
جب ہمیں اُن کو نہ دیکھا تو ہمیں کیا اُمید — حشر بھی جلوہ گہِ عام رہے یا نہ رہے

جذباتِ انسانی کا اظہار نزاکتِ خیال کے ساتھ:-

صورت ہی غم میں کاشفِ حالات ہو گئی — جس بات کا تھا خوف وہی بات ہو گئی
مانا کہ چھیڑ سے وہ دغا باز کہہ گئے — ندرت کے واسطے تو بڑی بات ہو گئی
پلا دیتا ہے چلّو ہی سے مجھ کو پیرِ میخانہ — لبوں تک آ کے رہ جاتا ہے شکوہ تنگدستی کا
کہتے کہتے جی بھر آیا کیا کہیں ہم رو دئیے — سُن رہا تھا کوئی غم کی داستاں اچھی طرح
ہر ذرّہ تری راہ کا ہے طالبِ تعظیم — سر سامنے کس کس کے جھکاؤں کہ ہے سر ایک

اگر پختگی، روانی اور شُستگی کی مثالیں دیکھنی ہوں تو آپ حسبِ ذیل اشعار جو انتخاب کے بعد تحریر کئے گئے ہیں۔ بغور ملاحظہ فرمائیے:-

اُٹھتا نہیں نظر سے جب تک حجابِ ہستی — کھلتا نہیں کسی پہ سربستہ راز تیرا
شکوہ فراق کا نہ سوالِ وصال تھا — وہ اِس سے پا گئے کہ میں آزردہ حال تھا
سراپا ہیں اب اک رُوداد ہوں عیشِ گذشتہ کی — زبانِ ہر بُنِ مو پر ہے افسانہ جوانی کا
ہنگامِ عرضِ حال ہے رُخ پہ عتاب سا — ہے یہ بھی کچھ کرم اُن کی طرف سے جواب سا
وہ جوشِ آرزو وہ زمانہ شباب کا — ہے اب بھی مجھ کو یاد مگر ایک خواب سا
قیامت میں لبِ شکوہ نہ ہو وا جیسے سمجھے تھے — ابھی باقی رہا ہے اور بھی اک امتحاں دل کا

انقلابات سے ملتا تو ہے درسِ عبرت
کچھ نکلتا تو ہے نیرنگیٔ ایام سے کام

نیستی مضمر مری ہستی کی بنیادوں میں تھی
یہ مری بربادیاں ہی حاصلِ تعمیر ہیں

فضا کیسی بدل دی چار تنکوں کی تباہی نے
نشیمن بھی مرا اک چیز تھا گویا گلستاں میں

نہیں کچھ زندگی کی قدر دنیائے محبت میں
فنا ہونے کے بعد انسان کے جوہر نکلتے ہیں

ہمیں آتا ہے رونا حسرتِ دیدارِ موسیٰ پر
کہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہ دیکھا دشتِ ایمن میں

جنوں انگیز ہے وسعت خیالاتِ پریشاں کی
میں اپنے خانۂ ویراں میں گویا دشت پیما ہوں

تھے خونِ دل کے قطرے دو چار بے حقیقت
آنکھوں میں میری آ کر طوفان ہو گئے ہیں

اب سنا دیگی قضا کا حکم آوازِ شکست
بادہ کش کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا پیمانہ ہوں

ہم ہیں آگاہ تری تنگدلی سے ساقی!
اس لئے اوک سے پیتے ہیں کہ اندازہ نہ ہو

تمہیں اندازہ کیا ہے تنگنائے دل کی وسعت کا
نظر آتا ہے اس میں اک جہانِ آرزو مجھ کو

کچھ اس انداز سے وہ پوچھتے ہیں حالِ دل ہم سے
نہ آتا ہو تو آ جائے محبت کا یقیں ہم کو

دیکھی تھی جس نے گرتے ہوئے برق دور سے
وہ بدنصیب جل نہ گیا آشیاں کے ساتھ

خراب آبادِ عشق اے ہمنشیں بستی نہیں کوئی
جنوں انگیز ویرانہ ہے وحشت خیز جنگل ہے

چمن میں جا کے میرا آشیاں صیاد نے پھونکا
قفس میں لا کے پھر تھوڑی سی خاکِ آشیاں رکھ دی

ہزاروں آرزوئیں دل میں بھر دیں بھرنے والے نے
مزا یہ ہے کہ پھر گنجائش وہ وہیں رکھ دی

پی کر کسی کی بزم میں بے ہوش ہو گئے
آنسو ہی ہم کو بادۂ سرجوش ہو گئے

پہلے تو میرا حال سنا اہلِ حشر نے
پھر ان کی شکل دیکھ کے خاموش ہو گئے

کوئی دیکھے تو یہ سمجھے بڑا ہمدرد ہے ظالم
ہمارا حالِ دل سن کر وہ جب خاموش ہوتا ہے

تمنا جس کی تھی دنیا میں دیکھا اس کو محشر میں
کہاں کے خواب کی جا کر کہاں تعبیر نکلی ہے

راحت کہیں نصیب مجھے جیتے جی نہ تھی
تھا زندگی کا نام مگر زندگی نہ تھی

کچھ بڑھ گئیں تھیں دل ہی کی ایذا پسندیاں
ان کی طرف سے جور و جفا میں کمی نہ تھی

پیری کا کسل جوشِ جوانی سے ہے دو چند
جتنا مجھے خمار ہے اتنی تو پی نہ تھی

ہستی کسی غریب کی اے انقلابِ دہر
اک مرکزِ حوادث و آفات ہو گئی

قفس میں میرے تڑپانے کو پھر فصلِ بہار آئی
وہی پھر بال و پر کمبخت پینے کو لہو نکلے

بیدادِ ناروا کی شکایت روا تو ہے
اے دل مگر خلافِ شعارِ وفا تو ہے

عاصی ہیں مغفرت کا مگر آسرا تو ہے
گو ہم نہیں خدا کے، ہمارا خدا تو ہے

وہ کہہ رہے ہیں رکھ کے دلِ مضطرب پہ ہاتھ
کچھ کچھ یہ بیقرار قرار آشنا تو ہے

آج ہی روشن ہوا ہے میری تربت پر چراغ
آج ہی گورِ غریباں کی ہوا بھی تیز ہے

تنکے اُڑ کر آج تو میرے قفس تک آ گئے ہیں
باغ میں لوٹا گیا ہے آشیاں اچھی طرح

تمہارا حسن ہے اک دیکھنے کی چیز دنیا میں
علاوہ اس کے جو کچھ ہے ہم اُس کو غم سمجھتے ہیں

وہ اگر ہم سے نہ پوچھیں گے ہمارا حالِ دل
ہم بھی اپنی بات کے پورے ہیں کہنے کے نہیں

یہ چارہ گر جو مرے آس پاس بیٹھے ہیں
میں اِن کو دیکھ رہا ہوں اُداس بیٹھے ہیں

ہمارا قتل اُن کے دست و بازو پر گراں کیوں ہو
ہمارے امتحاں کیسا تھا اُن کا امتحاں کیوں ہو

جہاں بجلی گری ہے کاش اک چھینٹا بھی پڑ جائے
کہ مثلِ آشیاں برباد خاکِ آشیاں کیوں ہو

مجھ سے کہتے ہیں کہ رکھنا نزع میں بھی ہم کو یاد
مدعا یہ ہے کہ مرنے میں بھی آسانی نہ ہو

زندگی دشوار، مرنا شانِ ہمت کے خلاف
عاشقی کا مسئلہ بھی کس قدر پیچیدہ ہے

خاروں کی عنایت سے تلوے ہیں یہاں چھلنی
جو آبلہ پا ہوں گے وہ آبلہ پا ہوں گے

سودا ہے اور سر ہے وحشت ہے اور دل ہے
دُنیائے عاشقی کی ہر چیز مستقل ہے

ہے دونوں ہی کے دم سے آزار کا مزا کچھ
دل ہے تو غم بھی غم ہے غم ہے تو دل بھی دل ہے

اک گرفتارِ بلا کو موسمِ گل میں نہ چھیڑ
اے صبا اب تیرے جھونکے نہیں ہیں تیر ہیں

مرنے کے بعد رُوح کو شاید اماں ملے
دنیا میں ختم سلسلۂ غم ہوا، نہ ہو

جب تک مری ہستی کی تعمیر سلامت ہے
ہر لحظہ حوادث کے سامان بپا ہوں گے

خونِ گشتۂ دل کا مجھ کو منانا ہے سوگ بھی
لینا ہے اور کام ابھی زندگی سے کچھ

وعدۂ حشر ہی سہی، کس کو مگر یقین ہو
آئیں ترے فریب میں تیرے ادا شناس کیا

تھا علاجِ زخمِ دل میرے لئے سامانِ مرگ
اک چھُری تھی چارہ گر کے ہاتھ میں نشتر نہ تھا

دستِ جنوں جو ٹکڑے نہ دامن کے کر سکا
شاید کسی کی پردہ دری کا خیال تھا

مَیں ابھی دام میں آیا تھا کہ یارانِ چمن
پہلے سے پہلے ہی کرنے لگے ماتم میرا

بار بار اُن کو جو رہ رہ کے ہنسی آتی ہے
گدگداتا ہے انہیں گریۂ پیہم میرا

مری نظروں میں اب تاریک ہوتی جاتی ہے دُنیا
قریبِ ختم ہے روغن چراغِ زندگانی کا

مرے رونے پہ دنیا ہنس رہی تھی وقتِ پیدائش
میں ماتم کر رہا تھا آپ اپنی زندگانی کا

فصلِ گل میں جانبِ زنداں لئے جاتے ہیں دوست
اب مجھے ندرتؔ اسیر ہوگا تو جنوں ہو جائیگا

دادخواہی کا بھی موقع کیسے حاصل ہوگا
عرصۂ حشر زیارت گہہِ قاتل ہوگا

وہ بے نقاب تھے مگر اس کا علاج کیا
رُخ پہ حیا نے ڈال دیا ہے نقاب سا

کہتے زباں سے کیا وہ دمِ شکوۂ ستم
کچھ دل ہی دل میں کھاتے رہے پیچ و تاب سا

کس طرح سر ہو زندگیِ عشق کی مہم
ہمت شکن ہے منزلِ شام و سحر بہت

پائیں نے آنکھ کھولی تھی یا بند ہو گئی
افسانۂ حیات رہا مختصر بہت

دام سے چھوٹے مگر زخمی تھے بازو اس قدر
رہ گئے ہم سوئے دیوارِ گلستاں دیکھ کر

ناتوانی حیلہ ہے، افتادگی اک عذر ہے
پاؤں پھیلائے ہیں ہم نے کوئے جاناں دیکھ کر

بس اب نیرنگیِ شام و سحر سے جی اُلجھتا ہے
نظر کھائے فریبِ انقلاباتِ جہاں کب تک

نصیبِ دشمناں جو گا ہے گا ہے ہوتی ہو حالت
خوشی کو بھی ہم ایسی اک طرح کا غم سمجھتے ہیں

یہ سننا اور سمجھنا ساری دنیا سے نرالا ہے
فسانہ دل کا وہ سنتے ہیں مطلب ہم سمجھتے ہیں

جنوں کا ساز و ساماں بے نیازِ جیب و داماں ہے
ہزاروں خار پیوستہ ہیں جیسے ہم عریاں ہیں

جسے دعویٔ سخن کا ہو مبارک اس کو اے ندرتؔ
مجھے تو یہ نہیں آتا میں ایسا ہوں میں ویسا ہوں

آہ سے کیا فائدہ نالے سے کیا حاصل ہمیں
اُن کے لانے کے لئے کافی ہے جذبِ دل ہمیں

دل نہ ہوگا دل کی تاثیرِ فغاں رہ جائے گی
داستاں گو چل بسے گا داستاں رہ جائیگی

بشر کو عمر لئے جاتی ہے عدم کی طرف
یہ بیٹھے بیٹھے بھی ندرتؔ اسفر میں رہتا ہے

ساحر

پنڈت امرناتھ مدن نام، ساحر تخلص ہے۔ رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ متخلص بہ ہیجان کے خلف اکبر ہیں۔ ۲۹ مارچ ۱۸۶۳ء کو بمقام بریلی پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں پنڈت پرشاد رام رازداں کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ اور ان کے فیضانِ تعلیم و تربیت سے تین چار سال ہی میں اردو فارسی میں خاصی واقفیت بہم پہنچالی بچپن میں اردو فارسی کے ہزاروں اشعار از بر تھے۔ یہی ذوقِ شعر آپ کی سخن گوئی کا محرک ہوا چنانچہ جب اکبر آباد میں بغرض تکمیل تعلیم انگریزی آپ تشریف لے گئے۔ تو وہاں مرزا مہر، آغا صوفی، ماہ، صفی وغیرہم کے مشاعروں میں شریک ہوتے۔ اور ان سے خراج تحسین وصول کیا۔ فارسی میں مولینا عبدالحلیم عاصم کاشانی سے تلمذ اختیار کیا۔ بائیس سال کی عمر میں آپ بسلسلۂ ملازمت اجمیر شریف تشریف لے گئے۔ اور بہ ترغیب اربابِ بزم رنگ زیادہ تر اپنی توجہ اردو کلام کی طرف مائل کی۔ مدت دراز تک آپ عہدۂ تحصیلداری پر ممتاز رہے۔ پنشن لینے کے بعد جب آپ کا قیام دہلی میں ہوا۔ تو آپ نے بزمِ سخن کی بنیاد ڈالی۔ اور ہر ماہ کے آخری ہفتہ کو آپ کے دولت کدہ پر ایک مشاعرہ منعقد ہوتا رہا۔ تقریباً پچیس سال سے تعطیل یومِ کلاں میں ایک عظیم الشان مشاعرہ آپ کے زیرِ اہتمام بصرفِ زرِ کثیر منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں علاوہ نامور مقامی شعراء کے بیرونجات سے اکثر اساتذہ اور پختہ کار شعراء اور دیگر اہلِ ذوق شریک ہوتے ہیں۔ علم ادب کی یہ خدمت اپنے طرز کے لحاظ سے ایک نہایت قابلِ قدر اور واجب تحسین و تشکر ہے۔ حضرت ساحر نثر نگار بھی ہیں۔ سحر ساحر، مثنوی پیران کا ترجمہ، گیتا فارسی فیضی کا ترجمہ اسرارِ حقیقت و رموزِ معرفت وغیرہ چند کتابیں آپ کی سعیِ فکر کا نتیجہ ہیں۔

آپ نہایت وسیع اخلاق اور منکسر الطبع ہیں۔ خاکسار کو شرفِ نیاز حاصل ہے۔ ملنسار، خوش مزاج اور پرانی وضع کے بزرگ ہیں۔ افسوس دوسری جنگِ عالم کے دوران میں انتقال فرما گئے۔

کلام پر تبصرہ

آپ کے کلام سے مشاقی اور پختگی ہویدا ہے۔ الفاظ کسی قدر ثقیل اور گراں ہوتے ہیں دلکشی کم ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر کلام بے نمک ہے۔ رنگ تصوف سے شعر با مزہ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں کثرت نے بے لطفی پیدا کر دی ہے۔ شاعری اشارات کا نام ہے۔ ہر چیز کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا شاعری نہیں ہے کوئی اور چیز ہے۔ محاکات اپنی جگہ پر ضرور بھلے معلوم ہوتے ہیں "ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد"

صورتِ نزولی کے تحت میں آپ فرماتے ہیں:-

ہے ذاتِ پاک، نورِ علیٰ نورِ بے نشاں   وہم خودی تعینِ علمِ خبر ہوا

دالیٰ آخرہٖ (صفحہ ۱۹)

اگر آپ صرف اشارات سے کام لیتے اور تفصیل سے شعر کو بے کیف نہ بناتے۔ تو ضرور آپ کے اشعار میں وہ دلکشی پیدا ہو جاتی جس کی کمی ہم محسوس کرتے ہیں۔ خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر ہیں۔ اگر وہ بھی اسی طرح علم تصوف کی تعلیم دیتے۔ تو اُن کے اشعار ایک چیستان بن کر رہ جاتے۔ اور سننے والوں کو شاید ناگوار خاطر ہوتے۔ آج جو لطف اُن کے اشعار پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ کبھی میسر نہ ہوتا۔ ساحر صاحب اپنے جذبات کی تصویر کشی میں ایسے فنا ہوتے۔ کہ انہیں گرد و پیش کی دنیا کا کچھ خیال ہی نہ رہا۔ انہوں نے اِس بات کی مطلق پرواہ نہیں کی۔ کہ اُن کے الفاظ اُن کے معانی کے کہاں تک حامل ہیں؟ وہ اپنے خیال میں مست کچھ کہتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ بات پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ کہ سننے والے بھی کچھ سمجھیں گے یا نہیں اور سمجھنے کے بعد کچھ لطف بھی اُٹھائیں گے یا نہیں؟

ساحر کا دیوان موسوم بہ کفرِ عشق تقریباً سُھاشُو اشعار کا حامل ہے غزلیات کے بھی عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ اور اس طرح اُن کو نظموں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آپ کے اشعار غزل ہیں نہ نظم کیونکہ ان اصنافِ سخن کے اعتبار سے یہ اشعار کامل طور پر ایک صنعت کے ماتحت نہیں آسکتے۔ طلب الکل فوت الکل علاوہ ازیں مستزاد، مثلث، مسدس، قطعات، رباعیات وغیرہ سب کچھ دیوان میں موجود ہے۔ صرف قصیدہ کا وجود عنقا ہے۔

دیوان کے شروع میں احباب ساحر نے اپنے اپنے خیال کے مطابق کلام ساحر کو سحر سامری

کہاہے - اور پچاس صفحات اِس کی تشریح اور توضیح میں صرف کئے ہیں۔ ازاں جملہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی تحریر فرماتے ہیں:-

"حضرتِ ساحر کے شعر نہیں، وارداتِ قلبی کا آئینہ ہیں۔ اُن کی آواز نہیں۔ بلکہ وہ مقدس نغمہ ہے جو تارِ نفس کے ارتعاش سے پیدا ہوا۔ آپ کا تسلسلِ صغریٰ اور کبریٰ قائم نہیں کرتا۔ بلکہ حسِ مشترک کو بیدار کرتا ہوا کان اور آنکھ کی راہ سے سیدھا دل میں اُتر جاتا ہے۔ خوب فرمایا ہے ؎

شاعری ساحرؔ ہے شغلِ اہلِ دل　　　نغمۂ توحید بن جاتی ہے چوٹ

اسی چوٹ کے زخم سے یہ بربط دل جو خاموش اور بے آس تھی گونج اُٹھی۔"

ہم ساحرؔ صاحب کے اشعار کو اُن کے وارداتِ قلبی کا آئینہ کہنے میں کچھ تامل نہ کریں گے۔ لیکن ان کے اشعار ہرگز حسِ مشترک کو بیدار نہیں کرتے۔ اور بہت کم تاثر پیدا کرتے ہیں۔ شاید کیفی صاحب اشعارِ ذیل سے متکیف ہوتے ہوں۔ ہم کو تو یہ ہرگز بامزہ نہیں معلوم ہوتے۔

اوتار یعنی ذات کا نزول صفات میں

نورِ قدم عجب تری شانِ جلال ہے	آئینہ دارِ کیف، وکمِ اہلِ حال ہے
زلفِ حدوث زینتِ روئے جلال ہے	خورشید و ماہ کسوتِ حسن و جمال ہے
کونین جلوہ گاہ تری بے مثال ہے	رنگِ شہود زیبِ جمال و کمال ہے
دورِ زمانہ صورتِ ماضی و حال ہے	وہ بُعدِ انفصال یہ قربِ وصال ہے

وغیرہ وغیرہ

خمخانۂ جاوید اور بہارِ گلشنِ کشمیر میں آپ کی شاعری کے متعلق یہ الفاظ درج ہیں: -

"بندش کی خوبی، مضامین کی خوش اسلوبی قابلِ داد ہے۔ زبان نہایت صاف ہے۔ آپ خط و خال، شاہد و ساغر کے پیرایہ میں، جو عارفانہ خیالات ادا کرتے ہیں۔ وہ صاحبانِ ذوق پہ وجد کا عالم طاری کر دیتے ہیں۔ مقامِ فنا و بقا، تجلی وغیرہ کے مضامین سے آپ اردو زبان کو پاکیزہ بنا رہے ہیں۔ بازاری جذبات اور عامیانہ مذاق سے آپ کی شاعری کو کوئی تعلق نہیں۔"

آپ کے کلام میں کہیں کہیں تسامحات بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً حسبِ ذیل شعر کے مصرعۂ آخر میں "کا" تدارد ہے۔

ہماری عمر کا پیمانہ اب لبریز ہے ساحرؔ　　　چھلکنا فرض ہو جاتا ہے پیمانہ کا بھر جانا

آخری مصرع کی نثر یہ ہونی چاہئے تھی۔ پیمانے کے بھر جانے کا فرض چھلکنا ہو جاتا ہے۔ مگر شعر

ہیں کا غائب ہے۔

یہ قوت علمی و مادی و ارادی" قیومی و معدومی و ایجاد ہے تثلیث

اس میں مادی کا تلفظ شعر کے وزن کے لحاظ سے غلط ہو جاتا ہے۔

ایک جگہ نقش کالحجر باندھ گئے ہیں۔ حالانکہ نقش کالحجر کے کوئی معنی نہیں۔ صحیح فقرہ کالنقش فی الحجر" ہے۔ فرماتے ہیں:-

تصور نقشبند حسن معنی قلب انساں پر بیقین تکمیل نقش کالحجر ہے لوح ایماں پر

ثقالت کی مثال ملاحظہ ہو۔

ہے روح قدس سے التجتی ضمیر کلام کہ بکر فکر ہے مریم صفات عصمت میں

ایک جگہ "عقل حیران ہوئی" کے بجائے "عقل حیرانی ہوئی" فرما گئے ہیں

لاتعین میں تعین عقل نے پیدا کیا کنہ بیچوں جب نپایا عقل حیرانی ہوئی

اگرچہ اس نقص کو یہ کہہ کر نباہا جا سکتا ہے۔ کہ عقل حیرانی بن گئی۔ لیکن یہ روزمرہ کی غلطی ہوگی۔ اہل زبان اس طرح نہیں بولتے۔ پیکڑی دیہاتی زبان ہے۔ دہلی والوں سے خصوصاً اُن لوگوں سے جو دلّی کے روڑے کہلاتے ہیں، ان الفاظ کے سننے والوں کی تاب نہیں ہو سکتی۔ ارشاد ہوتا ہے:-

خرد کی پیکڑی دم بھر کو پڑ جاتی بُرا کیا تھا کہ دل دیوانہ ہے اور مدعا عرض تمنا ہے

ساحر صاحب نے شاید اُن اصحاب کی تقلید کی ہے۔ جو ایک مفروضہ ہندوستانی زبان کے دلدادہ ہیں۔ اور درحقیقت دیہات کی زبان کو رواج دینا چاہتے ہیں۔ اب تک ہر ملک اور ہر قوم میں شہروں کی زبان مستند سمجھی جاتی رہی ہے۔ اور اوضاع و اطوار میں بڑے بڑے شہروں کی ہمیشہ تقلید ہوتی رہی ہے۔ لیکن اس انقلاب عظیم کو دیکھئے۔ کہ بعض اصحاب دیہاتی زبان کی تقلید میں اپنی زبان کو بگاڑنا چاہتے ہیں۔ ہم تو ان لوگوں کے حال پر مولانائے رومی کا یہ مصرع پڑھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اب بھی سمجھ سے کام لو۔ ع

دہ مرد دہ مرد را احمق کند

حسب ذیل شعر میں ردیف بے جوڑ ہو گئی ہے:-

گزر جاتا ہے پندار خودی سے جب کوئی ساحر حریم کعبہ جاں میں رسائی ہوتی جاتی ہے

پہلے مصرع میں لفظ جب آنے سے لازم ہو گیا۔ کہ دوسرے مصرع میں "رسائی ہو جاتی ہے"

یا "رسائی ہو ہی جاتی ہے" ہونا چاہئے۔
اسی طرح اس شعر میں "مجھے" ردیف ہے۔ لیکن مجھے زائد معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ مجھے ہونے سے شعر روزمرہ کے خلاف ہو جاتا ہے

جب درمیاں سے پردۂ پندار اٹھ گیا | ذرہ میں آفتاب نمایاں ہوا مجھے

ساحر صاحب کی علمیت مسلم اور ان کا فلسفۂ ویدانت میں ماہر ہونا بھی تسلیم لیکن شعر میں ان دونوں چیزوں سے مدد لی جا سکتی ہے۔ نہ یہ کہ شعر ہی ان پر ڈھالا جائے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ جہاں کہیں آپ نے سادگی اختیار کی ہے۔ اور انداز بیان میں ندرت سے کام لیا ہے۔ وہاں آپ کا شعر نہایت بلند ہو گیا ہے۔ مثلاً:۔

کوئی حرم سے، دیر سے منسوب ہے کوئی | اِک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے
تجھے اے جلوہ آرا ہم نے ہر سو جلوہ گر دیکھا | ہمیں تو ہی نظر آیا جہاں دیکھا جدھر دیکھا
فنا ہونے میں ہر دم راحتِ جاوید ملتی ہے | یہ وہ جلوہ ہے ساحر جس کو ہم نے عمر بھر دیکھا
رحمت نے دھوئے مرے سب داغِ معصیت | ہر قطرہ بحر تھا عرقِ انفعال کا
ہے امید و بیم سے فارغ نشیں ساحر کہ اب | دل جو تھا وقفِ تمنا بے تمنا ہو گیا

آپ کا ایک شعر ہے:۔

دل ہے بتخانۂ اصنامِ خیالی ساحر | تو وہ کافر ہے کہ بھولے سے مسلماں نہ ہوا

ہم کو اس موقعہ پر مرزا غالب کا شعر یاد آ گیا

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے | مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

ذیل میں آپ کے بہترین اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

نور پیکر ہے سراپا بتِ کافر اپنا | حسن ہے اپنا خدا، عشق پیمبر اپنا
پاک ہے گردِ اضافات سے منظر اپنا | حسن ہے روحِ رواں عشق ہے پیکر اپنا
نظر کب تاب لا سکتی ہے دیدارِ تجلی کی | جو بیہوشی میں دیکھا بھی تو بے ذوقِ نظر دیکھا
منفرد جب دو عالم جلوۂ حسنِ ازل سے ہیں | ہمارا فرض ہے دلدادۂ حسنِ بتاں ہونا
گو بازبانِ حال تھی، ساحر خموش تھا | یہ سعیٔ ضبط تھی، وہ تقاضائے جوش تھا
وجود اب مرا لا فنا ہو گیا | فنا ہو کے جزوِ بقا ہو گیا
نہ ہم تھے نہ ہنگامۂ کائنات | کھلی آنکھ اور خواب سا ہو گیا

حقیقت ہوا رفتہ رفتہ مجاز
رسا طالع نا رسا ہو گیا

نہ کچھ ہوش اپنا نہ ہے کچھ خبر
خدا جانے ساحر کو کیا ہو گیا

عینِ مستی میں نظر آئیگا وہ جلوۂ حسن
جو کبھی چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھا ہوگا

حاصلِ کشتِ عمل سے ہے طبیعت بیزار
شررِ عشق کا محتاج ہے خرمن میرا

جنوں کے جوش میں جس نے محبت کو سمجھا جانا
سبکدوشی سمجھتا ہے وہ اِس سودا میں سر جانا

جنونِ عشق میں کب تن بدن کا ہوش رہتا ہے
بڑھا جب جوشِ سودا، ہم نے سر کو ردِ سر جانا

طلسماتِ جہاں میں دل ہے مستِ ساز خود بینی
فنا کے زمزمے سے مست کو ہشیار کر لینا

حسنِ ازل صفات میں جب جلوہ گر ہوا
آئینۂ جمال وجودِ بشر ہوا!

ہو چکے جذباتِ فطرت جب فراہم ایک جا
نامزد اس حاصلِ کونین کو دل کر دیا

کام اس دنیا میں آ کر ہم نے کیا اچھا کیا
حسن کو بے پردہ، نامِ عشق کو رسوا کیا

نفس کی آمد و شد سے پتہ اتنا تو ملتا ہے
سفر میں ہے وطن اپنا، وطن میں ہے سفر اپنا

جو لا مذہب ہوا اُس کو ملت و مشرب سے کیا مطلب
مرا مشرب ہے رندی، رند کو مذہب سے کیا مطلب

تھا انا الحق لبِ منصور پہ کیا آپ سے آپ
تھا جو پردے میں چھپا بول اُٹھا آپ سے آپ

ہستی مری مٹی ہے کچھ ایسی کہ جیتے جی "
باقی کہیں نہ نام نہ میر انشاں ہے آج

اک عمر ہم نے جس کی توقع میں صرف کی
آخر ہوا نصیب وہ روزِ وصال آج

ہے کیسی چشمِ موحد میں سراپائے جمال
عینِ غفلت میں نظر آتی ہے ہستی ہیچ و پوچ

ہیں بادِ یار سے مرے کام و دہاں لذیذ
اور ذکرِ خیر سے ہے سراسر زبان لذیذ

ہے گلشنِ جہاں میں گلِ معرفت کی بُو
کانٹوں میں گل ہے خار سے دامن بچا کے ڈھونڈ

لباس بیخودی زیبا ہوا عریانیِ تن پر
کہ لوثِ ہوش داری ہے جنوں میں داغ دامن پہ

مسلماں دین پر اپنے نہ ہندو اپنے ایماں پہ
رہا کوئی نہ قائم عہد پر اپنے نہ پیماں پر

ثبت ہے اسمِ ازل، لوحِ طلسمِ راز پر "
نغمۂ توحید ہم آہنگ ہے ہر ساز پہ

محتسب ہے ہوشِ بزمِ بیخودی ہے میکدہ
ٹوٹتے ہیں دل شکستِ شیشہ کی آواز پہ

کسی کی یاد گھر کرتی ہے دل میں
کسی کا نام رہتا ہے زباں پر

نقشِ قدم ہیں راہ میں فرہاد و قیس کے
اے عشق کھینچ کر مجھے لایا ادھر کہاں

وہمِ نظر جہاں میں رہا جلوۂ حیات
اک بحرِ موجزن نظر آیا سراب میں

ابتدا عشق کی اک حسن کے جلوہ سے ہوئی
اس قدر ہوش ہے باقی مجھے کچھ یاد نہیں

پھر پروازِ عنقا لائیں گے گر لامکاں بھی ہو
تمہیں ہم ڈھونڈ لائیں گے کہیں بھی ہو جہاں بھی ہو

ذرہ نوازیاں ہیں یہ ساحر کہ بزم میں
احباب یاد کرتے ہیں اِس خاکسار کو

کوئی منصور کا دارِ فنا میں ہم زباں پھر ہو
کہ تازہ دہر میں دار و رسن کی داستاں پھر ہو

سیر کر عالمِ ہستی کی مگر دل نہ لگا "
یہ ہے اک دامِ اجل اس میں گرفتار نہ ہو

تصور دل میں رہتا ہے کسی کی چشمِ میگوں کا
کھنچی رہتی ہے آنکھوں میں مری تصویر میخانہ

ہماری بیخودی ہے پردہ دارِ ننگِ عریانی
جنونِ پردہ در کو فکرِ جیب و آستیں ہوتی

ازل سے تشنہ کام بادۂ ذوقِ تماشا ہوں
طبیعت سیر ساحر لطفِ ساقی سے نہیں ہوتی

وہ جو چمکی تھی کبھی برقِ تجلی طور پر "
اک شرر اس کا مری ہستی کے پیراہن میں ہے

جلوہ جو تونے دکھایا تھا سرِ طور کبھی "
ہے تمنا اُسی جلوہ کی فنا سے پہلے

نہ تھے آپے میں موسیٰ ورنہ اُن کا حوصلہ کیا تھا
جو بول اٹھے کہ آ پردہ سے باہر دیکھنا کیا ہے

پردہ پڑا ہوا تھا غفلت کا چشمِ دل پر
آنکھیں کھلیں تو دیکھا عالم میں تو ہی تو ہے

چشمِ ساقی میں وہ کیفیتِ مستی دیکھی
بے مے و جام و سبو بادہ پرستی دیکھی

روشن کئے چراغِ دلِ داغدار نے
اس گلزمیں میں آگ لگا دی بہار نے

نیاز و ناز میں زور آزمائی ہوتی جاتی ہے
عیاں بندہ سے شانِ کبریائی ہوتی جاتی ہے

کیا کہوں کام پڑا ہے مجھے نادانوں سے
چاہئے عشق کو ہیں عقل کے پیمانوں سے

جلوۂ حق نظر آتا ہے صنم میں ساحر
ہے مرے کعبہ کی تعمیر صنم خانوں سے

مدِ نظر نہ تھا کوئی تیرے سوا مجھے
عالم میں تو ہی تو نظر آتا رہا مجھے

ساقی ہے آج بزم میں کس کی نگاہِ مست
بے جام بادہ مستِ ازل کر دیا مجھے

بزمِ ادب میں جمع ہیں ساحر سخن شناس
شاید پسندِ خاص یہ طرزِ بیاں رہے

مستیاں ساحر کی ہیں جامِ مے توحید سے
ہو سکے تو ایسے کافر کو مسلماں کیجئے

بزم میں تونے جو اُٹھا رُخِ روشن سے نقاب
ایک عالم ترے جلوہ کا تماشائی تھا

پکار انار نے یہ بے اثر ہے میری آتش سے
مرادِ اُن شرابِ شوقِ عرفاں سے جو تر دیکھا

یہ خیال ہے تیرے نور کا وہ جلال ہے تری نار کا
ہے کرشمہ حسنِ صفات کا جو نظام ہے گل و خار کا

صانعِ کون و مکاں ہیں تری صنعت کے نثار
ایسی تعمیر میں اک ذرہ بھی بیکار نہ تھا

ہونے کو تو اب بھی ہے وہی حُسن وہی عشق
جو حرف غلط ہو کے مٹا نقش وفا تھا

گو سیرگاہِ عالمِ فانی ہے دل فریب
بے لوث و بے نیاز ہیں رنگِ اثر سے ہم

ہنگامۂ ہستی کا انجام ہے معدومی
اِس خوابِ پریشاں کی تعبیر سے کیا حاصل

خود رفتگی سے منزلِ حیرت میں ہے مقام
آئینہ خانہ ہے در و دیوار آج کل

معنی سے مٹا ڈالا صورت کا اثر تو نے
وحدت میں فنا کر دی کثرت کی نظر تو نے

اے صرفِ خود آرائی دِل ہے مرا آئینہ
آ تجھ کو دکھا دوں میں دیکھا نہ ہو گر تو نے

محرابِ خمِ ابرو ہے سجدہ گہہِ ساحر
اے محوِ خودی دیکھا اللہ کا گھر تو نے

حیلہ سازی کو ترا وعدۂ فردا کافی
دلنوازی کو ترا وعدۂ دیدار بہت

اے ہوش الوداع کہ ہے بزمِ بے خودی
اب میں رہا نہ ذوقِ تماشا رہا مجھے

رحمت نے ماسوا سے کیا دِل کو بے نیاز
قسمت سے مِل گیا دلِ بے مُدعا مجھے

محبّت کیا ہے مٹ جانا کسی کی یاد میں ساحر
دِل اپنا ہے تو پھر نامِ محبّت مفت رسوا ہے

میں اپنی ہستیِ موہوم کو مٹاتا ہوں
کہ دہر میں تری ہستی کا اعتبار رہے

ابھی دل ہے ابھی خوں ہے ابھی آتش ابھی ابر
ابھی قطرہ ابھی دریا ابھی طوفان ہوگا

نہ ہو فریفتۂ رنگ و بوئے گلشنِ دہر
وہ دل بہار و خزاں میں جو امتیاز کرے

ہے رنگِ بے خودی مرے حُسنِ خیال میں
رہنے دو کیف مست مجھے اپنے حال میں

برق

مہاراج بہادر نام برق تخلص تھا۔ ۱۸۸۴ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد مقام سکیٹ ضلع ایٹہ کے رہنے والے تھے۔ پھر دہلی کو اپنا وطن بنالیا۔ شاعری بزرگوں کا ایک متبرک ورثہ تھی۔ آپ کے والد منشی ہرنرائن داس حسرت تخلص کرتے تھے۔ اور آپ کے نانا رائے دولت رام عبرت تھے۔ جو ایک بلند پایہ ادیب، خوش فکر شاعر صاحبِ دیوان اور خاقانیِ ہند ذوق دہلوی کے تلامذہ میں تھے۔

برق کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ مگر جب تک آپ نے انٹرنس پاس نہ کر لیا۔ آپ کے والد بزرگوار نے آپ کو شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھنے سے باز رکھا۔ ۱۹۰۵ء میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور آپ کی تعلیم ناتمام رہ گئی۔ آپ نے ۱۹۱۸ء میں منشی فاضل کے دوسرے سال ایف اے اور ۱۹۲۰ء میں بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء میں سب اسسٹنٹ اکاؤنٹس سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ پوسٹل آڈٹ آفس دہلی میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ خودداری آپ کی طبیعت میں حد سے زیادہ تھی۔ ابتدا میں چند غزلیں آغا شاعر قزلباش دہلوی کو دکھائیں۔ بعد ازاں خود غور و فکر سے کہنے لگے۔ اور اپنے کلام کی خود اصلاح کرنے لگے۔

آپ کا ایک مجموعۂ کلام مطلع انوار کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اور بہت سا کلام ابھی شائع نہیں ہوا۔ شاید آپ کے احباب او تلامذہ جلد اُس کو بھی چھپوا دیں۔

۹ر فروری ۱۹۳۶ء کو آپ ایک شادی کے سلسلے میں بال بچوں کے ساتھ پانی پت گئے تھے ۱۲ر فروری کی شب کو بارہ بجے رات کے وقت بے چینی پیدا ہوئی۔ اور قلب کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال فرمایا۔

کلام پر تبصرہ

اگرچہ آپ غزل گوئی بھی کرتے تھے۔ لیکن آپ کا نام نظموں کی وجہ سے مشہور ہے منورؔ لکھنوی

رسالۂ زمانہ" ۱۹۳۶ء میں رقمطراز ہیں کہ برق فرمایا کرتے تھے کہ شروع شروع میں وہ منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی کے کلام سے بہت متاثر ہوئے۔ اور طرزِ جدید کی شاعری کی طرف متوجہ ہونے کا سبب بھی زیادہ تر سرور مرحوم ہی تھے۔ علاوہ ازیں مغربی شعراء مثلاً ورڈس سرور تھ، کیٹس، شیلے، اور براؤننگ کے کلام کے مطالعہ نے اُن کی شاعرانہ نگاہ کو اور بھی وسیع بنا دیا تھا"

شیو کماری دہلوی صاحبہ دختر حضرت جگر بریلوی زمانہ جون ۱۹۳۶ء میں لکھتی ہیں:۔

" آپ کا مجموعۂ کلام "مطلع انوار" اُردو ادب میں ایک نیا اور نادر اضافہ اور طرزِ جدید کی شاعری کا مخزن ہے۔ تاثیر، فصاحت، سلاست، نادر تشبیہات، روانی، زبان کی شستگی و برجستگی آپ کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے"

برق نے کچھ مذہبی نظمیں بھی لکھی ہیں جن کی وجہ سے وہ اہلِ ہنود میں عموماً اور کائستھوں میں خصوصاً ہر دلعزیز ہوگئے ہیں۔ جس چیز نے مجھے برق کے کلام کی طرف راغب کیا۔ وہ واقعی اُن کی نادر تشبیہات ہیں۔ اور جس وقت اُن کے کلام میں زور پیدا ہوتا ہے۔ اُن کی فارسی تراکیب اور عربی فارسی کے الفاظ محوِ حیرت کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک نظم "کرمکِ شب تاب" ہے۔ اس میں فرماتے ہیں۔

خندۂ جامِ بلوریں ہے ہوا میں پرّاں — گرم پرواز ہے یا پرِ تو شاخِ مرجاں
محوِ پرواز پہ لعلِ یمنی ہے شاید — اُڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید

جگنو کو ہیرے کی کنی سے تشبیہہ دینا نہایت باموقع اور مناسب تشبیہہ ہے۔ دوسری جگہ جگنو کو قطرۂ سیماب بنا دیا ہے۔ مثلاً:۔

برقِ شرارہ کا یا جلوۂ بیتاب کہوں — اس کو اُڑتا ہوا اک قطرۂ سیماب کہوں

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ایک نظم جگنو اور بچہ ہے۔ جو بچوں کی درسی کتابوں میں چھپتی رہتی ہے۔ ہم کو ایسی نظم زیادہ پسند ہے جس میں اثر اور سلاست ہو۔ برق کی نظم میں شاعری یا دوسرے لفظوں میں میناکاری بہت ہے لیکن اثر نہیں ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جگنو کے ساتھ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ اور بس۔

" جلوۂ سحر" میں طلوعِ آفتاب کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:۔

تاروں کی اب کہاں ہیں وہ جلوہ نمائیاں — گل ہیں چراغ مہرِ منور کے سامنے
چھٹتی ہیں ماہتاب کے رُخ پر ہوائیاں — کیا رنگ جم سکے شہِ خاور کے سامنے

زرنگار ہوگئی ہیں پہاڑوں کی چوٹیاں — سیماب پیرہن ہے ہر اک موج آبشار
پانی میں کوندتی ہیں شعاعوں سے بجلیاں — خیمے حباب کے ہیں لبِ آبِ زرنگار

اس نظم میں تشبیہات کے علاوہ سورج نکلنے کا سماں بھی خوب باندھا ہے:۔
ہم کو آپ کا مجموعۂ کلام دستیاب نہیں ہوا۔ صرف رسالہ زمانہ کے چند نمبروں سے یہ مضمون لکھا گیا ہے۔ جو کچھ کلام اس رسالہ میں درج ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ لکھنے والوں نے بہتر سمجھ کر پیش کیا ہے۔ اس سے شاعر کی صرف خوبیاں ظاہر ہو سکتی ہیں۔ نقائص آنکھوں کے سامنے نہیں آتے۔ لہذا ہم آپ کے نقائص سے قطع نظر کرتے ہیں۔ اور ذیل میں آپ کے کلام کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں:۔

غزلیات

دل کی بساط کیا صفِ مژگاں کے سامنے — ایک قطرۂ خوں ہے[1] جنبشِ پیکاں کے سامنے
جنت ہے ہیچ محفلِ جاناں کے سامنے — کیا قدر خارزارِ گلستاں کے سامنے
کھلتی نہیں حقیقتِ دنیائے بے ثبات — اک خواب سا ہے دیدۂ حیراں کے سامنے
پیوندِ خاک خاک کے پتلے ہیں رات دن — ہستی ہے گرد گورِ غریباں کے سامنے
کس کو ہے ہست و بود کے انجام پر نظر — کچھ سوجھتا نہیں غمِ دوراں کے سامنے
دیتا ہے آگ میرے نشیمن کو باغباں — میں ہوں اسیرِ دامِ گلستاں کے سامنے
گلزار میں ہے بلبلِ رنگیں نوا خموش — پھیکا ہے رنگ، برقِ سخنداں کے سامنے

کعبہ و بتخانہ کیوں مسجود[2] ہونا چاہیئے — لاتعین کس لئے محدود ہونا چاہیئے
عالمِ اسباب ہے یک جلوۂ حسنِ ازل — ذرہ ذرہ کعبۂ مقصود ہونا چاہیئے
رکھ اسے پہلو میں بے لوثِ غبارِ آرزو — دل کا آئینہ نہ زنگ آلود ہونا چاہیئے

ادھر ذوقِ تماشا اور ہے حد سے فزوں وہ بھی — اُدھر اک بے نیازی، دشمنِ صبر و سکوں وہ بھی
اسی کو عشق میں کیا اضطرابِ شوق کہتے ہیں — کشیدہ جتنے تم ہوتے ہو، ہوتا ہے فزوں وہ بھی
نگہ سے جان لے لینا اشارے سے جلا دینا — کرشمہ تیرا اک یہ بھی ہے، چشمِ پُرفسوں! وہ بھی

---

[1] قطرۂ خوں آنا چاہیئے تھا۔ تنہا
[2] آپ کا مطلب مسجود سے جائے سجدہ معلوم ہوتا ہے لیکن مسجود اسم مفعول ہے اسم ظرف نہیں ہے۔ تنہا

نظارہ گم ترے جلوؤں کی آب و تاب میں ہے — ترا جمال ہے بے پردہ یا حجاب میں ہے
گلوں کو نازکی بلبل کو خوشنوائی دی — کسے کلام ترے حسنِ انتخاب میں ہے
اٹھا وہ ابرِ کرم، برق میکدے پہ چلی — کہ لطفِ بادہ کشی دامنِ سحاب میں ہے
انہیں دونوں کے جلوؤں سے جہاں فردوس منزل ہے — محبت شمعِ محفل، حسنِ مطلق زنگِ محفل ہے
ہیں لبریز نوائے راز پردے سازِ ہستی کے — کہ پیدا ذرّے ذرّے سے صدائے بربطِ دل ہے
محرک کوششیں برباد ہے، سعیِ مکرّر کی — مرا ہر داغِ ناکامی چراغِ راہِ منزل ہے
دل جو صورت گرِ معنی کا صنم خانہ بنے — آنکھ جس شے پہ پڑے جلوۂ جانانہ بنے
تا درِ یار پہنچتا ہے وہ خود رفتۂ شوق — اپنی ہستی سے جو اس راہ میں بیگانہ بنے
اتنے ہی ہو گئے ہم منزلِ عرفاں کے قریب — جس قدر رسم و رہِ دہر سے بیگانہ بنے
سعیِ ناکام سے میں ہاتھ اٹھاؤں گا نہ برق — میری بگڑی ہوئی تقدیر بنے یا نہ بنے

حسنِ فطرت

اک جلوۂ حسن ہے یہ عالمِ اسباب — نظارہ بداماں ہے رخِ مہرِ جہاں تاب
ہے چادرِ مہتاب کہ اک نور کا سیلاب — ہر اخترِ تابندہ ہے رشکِ دُرِ نایاب

ہے وسعتِ دامانِ خلا حسن سے لبریز
آنکھیں ہوں تو ہیں ارض و سما حسن سے لبریز

جھرمٹ ہیں ستاروں کے ہے کیا شانِ جمالی — کس درجہ ہے دلکش شفقِ شام کی لالی
کانٹے ہوں کہ پھولوں میں ہو تُلتی ہوئی ڈالی — دنیا میں کوئی چیز نہیں حسن سے خالی

بیتابیِ امواج میں بھی حسن نہاں ہے
یہ جنبشِ پیہم کا سماں اور کہاں ہے

دل میں ہو اگر آرزوئے حسن پرستی — ہے عالمِ تصویر صنم خانۂ ہستی
ہے فرش سے تا عرش یہاں اوج کہ پستی — انوار سے معمور ہے یہ حسن کی بستی

جو ذرہ ہے وہ خاتمِ قدرت کا نگیں ہے
جو شکل ہے اس آئینہ خانہ میں حسیں ہے

شفق

دید کے قابل ہے رنگِ ارغواں زارِ شفق — دلربا ہے سرخیِ دامانِ زرِ تارِ شفق
آسماں پر موجزن جوئے شرابِ سرخ ہے — یا محیطِ چرخِ زنگاری سحابِ سرخ ہے
نقش بستہ آفتابِ شام کی تنویر ہے — جلوۂ آخر کی اک مٹتی ہوئی تصویر ہے
آئینہ ہیں چرخ کے ہے عکسِ تصویرِ بہار — تابش افزائے نظر ہے یا فروغِ شعلہ زار
رخِ زیبائے عروسِ شام کا پرتو ہے یہ — گوشۂ مغرب منور جس سے ہے وہ ضو ہے یہ
از سرِ نو پھوٹ نکلا ہے شبابِ چرخِ پیر — یا مئے احمر ہے زیبِ شیشۂ ابرِ مطیر
رنگ لایا ہے شفق بن کر شہیدوں کا لہو — لوحِ گردوں سے عیاں ہے نقشِ خونِ آرزو
جلوۂ زریں فضا میں جاذبِ نظارہ ہے — منظرِ رنگیں نگاہِ شوق کا گہوارہ ہے
قصرِ فردوسِ بریں کا دلنشیں نقشہ ہے یہ — یا بہارِ بوستانِ خلد کا خاکہ ہے یہ
سرخ جوڑا لیلیٰ شب نے کیا ہے زیبِ تن — روزِ روشن سے ہے ہم آغوش چوتھی کی دلہن
دیکھ لے چشمِ تماشا جو یہ جلوہ دیکھ لے — کلکِ صناعِ حقیقی کا کرشمہ دیکھ لے

اے شفق! اے نقشِ دلآویزیِ اورنگِ حسن — اے طلسمِ رنگ اے آئینۂ نیرنگِ حسن
پرتوِ مہرِ مبیں کا رازِ سربستہ ہے تو — یا سرِ طاقِ فلک رنگین گلدستہ ہے تو
برق کی چشمک تری رنگیں ادائی پر نثار — کہکشاں کا نور اس جلوہ نمائی پر نثار
مایۂ تسکیں ہے تو ذوقِ نظر کے واسطے — دامنِ گلچیں ہے تو ذوقِ نظر کے واسطے
چرخ کے اسٹیج پر اک پردۂ رنگیں ہے تو — زینتِ دوشِ فلک یا چادرِ زریں ہے تو
کیف آور تیرا جلوہ ہے سکوتِ شام میں — آتشِ سیال ہے لبریز تیرے جام میں
بادۂ گلرنگ کا تیرے مزا لیتا ہوں میں — تشنگیِ ذوقِ نظارہ بجھا لیتا ہوں میں
تیری رنگینی سے عقدہ کھل گیا یہ اے شفق — دفترِ ہفت آسماں کا تو سنہری ہے ورق
جو دکھاتے ہی جھلک اڑ جائے وہ سیماب ہے — بے ثباتی کا مرقع جلوۂ بیتاب ہے
محو ہو جاتے ہیں دم بھر میں ترے نقش و نگار — ہے یونہی وقفِ خزاں عمرِ دو روزہ کی بہار
جلوۂ گل تو ہے مشتاقِ تماشا کے لئے — منظرِ عبرت نما ہے چشمِ بینا کے لئے

بسنت رُت

بسنت آئی ہے پھر مشکبار کیا کہنا — بنے ہیں دشت و جبل لالہ زار[1] کیا کہنا

---

[1] لالہ زار کی بجائے کچھ اور ہونا چاہئے۔ کیونکہ بسنت کا رنگ زرد مانا گیا ہے نہ کہ سرخ۔ تنہا

برس رہا ہے سرِ لالہ زار کیا کہنا — یہ دُر فشانیٔ ابرِ بہار کیا کہنا
یہ جوشِ لالہ و سنبل یہ حسنِ غنچہ و گل — یہ فرشِ خاک پہ نقش و نگار کیا کہنا
جلا کے رختِ خزاں دم زدن میں خاک کیا — اُڑے وہ آتشِ گل سے شرار کیا کہنا
سمٹ کے غنچۂ نو بن گیا ہے جوشِ نمو — اس انتشار پہ یہ اختصار کیا کہنا
شگوفہ ریز ہے ہر جنبشِ نشاط انگیز — یہ رنگِ موجِ نسیمِ بہار کیا کہنا
نکھار پر ہے رُخِ گل زہے کرشمۂ حسن — بہار پر ہے عروسِ بہار کیا کہنا
کہیں ترانۂ قمری کہیں ہے بانگِ ہزار — بنا ہے صحنِ چمن لالہ زار کیا کہنا
شمیمِ غنچۂ وابستہ فرح بخشِ دماغ — خجل ہے نافۂ مشکِ تتار کیا کہنا
سرور اور سرورِ شرابِ خندۂ گل — خمار اور خمارِ بہار کیا کہنا
بسنت رُت میں ہیں گل پیرہن بسنتی پوش — گلے کا ہار ہیں پھولوں کے ہار کیا کہنا
نظر فروز ہے وہ رنگ روپ سرسوں کا — ہے جس سے رنگِ طلا شرمسار کیا کہنا
گلِ بنفشہ گلِ اشرفی گلِ شر شعت — نظر ہے حسن پران کے نثار کیا کہنا
گلال بن کے رخِ گل پہ آئی ہے سرخی — عبیر بن کے اڑا ہے غبار کیا کہنا
فضائے سبزہ، لبِ جوئبار، جلوۂ گل — نظر ہے حسن پران کے نثار کیا کہنا

یہ رُت بسنت کی اور برقِ مبتلائے الم
بہار اور دلِ داغدار کیا کہنا

ایک اور موقع پر بسنت رُت کے تحت میں فرماتے ہیں:-

سماں یہ سرسوں کے کھیت کا ہے کہ زعفران زار کھل رہا ہے
فضا میں کندن دمک رہا ہے سرور آنکھوں کو مل رہا ہے

یہی خیال دوسری نظم میں یوں ظاہر کیا ہے:-

سرسوں کے کھیت کیا ہیں کیسر کی کیاریاں ہیں
قدرت کی خاک پر یہ زیبا نگاریاں ہیں

نظر

نوبت رائے نام نظرؔ تخلص تھا۔ لکھنؤ میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں پرورش پائی ۱۸۸۴ء میں آغا مظہر کے شاگرد ہوئے۔ جن کا سلسلۂ تلمذ استاذ الاساتذہ مصحفی تک پہنچتا ہے۔ فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ انگریزی تعلیم بھی حاصل کی تھی ۱۸۹۷ء میں رسالہ خدنگِ نظر جاری کیا۔ جو سات سال بعد مالی مشکلات کے باعث بند ہو گیا ۱۹۰۵ء میں منشی دیا نرائن نگم نے "زمانہ" کے عملہ میں شامل کر لیا۔ اور آپ کے مضامین اور نظمیں رسالہ مذکور میں شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس الہ آباد چلے گئے۔ وہاں سے رسالہ "ادیب" نکالا۔ لیکن ایک سال بعد ہی ۱۹۱۱ء میں مستعفی ہو کر پھر رسالہ زمانہ کانپور ہی میں واپس چلے گئے۔ اِس مرتبہ ہفتہ وار اخبار "آزاد" کی نگرانی بھی اِن کے سپرد ہوئی۔ جو منشی دیا نرائن نگم صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ کچھ دنوں بعد اودھ اخبار کی اڈیٹری مل گئی۔ اِس مسلسل گردش اور جاں سوز محنت سے صحت بہت خراب ہو گئی۔ دمہ کے پرانے مریض تھے۔ چنانچہ وہاں سے بھی تعلق قطع کر لیا۔ اور کچھ دنوں اخبار خادمِ ہند سے بھی وابستہ رہے۔

آپ میانہ قد تھے، دُبلے پتلے، گندمی رنگ، لباس میں سادگی، مزاج میں نفاست نمود و نمائش میں کوسوں دُور۔ غرور و تکبّر کا پتہ بھی نہیں تھا۔ خوش نویس اور مصوّر بھی تھے شطرنج کا شوق تھا۔

نظرؔ نرینہ اولاد سے محروم تھے۔ صرف ایک لڑکی تھی۔ اور اس کا بھی صرف ایک لڑکا تھا جس سے آپ کو بیحد محبّت تھی۔ جب وہ مر گیا۔ تو اُس کے صدمے سے نیم جان ہو گئے چنانچہ ایک نوحہ میں اپنی دردناک حالت کا نقشہ اِس طرح کھینچا ہے۔

بہار پر تھا اِسی نونہال سے یہ باغ   تھمو تھمو کہ اِس اُجڑے مکاں کا تھا یہ چراغ

تمام عمر دلِ ناتواں ہے اور یہ داغ   نہ ہو گا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ

فغانِ بلبلِ جاں دل کے پار ہوتی ہے

نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

یہ امر واقعہ ہے کہ ان کے گھر سے بہار رخصت ہو گئی۔ تھوڑے سے ہی دن گذرے تھے۔ کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ یہ دوسرا داغ تھا۔ پڑوس میں ایک بچہ رہتا تھا۔ جس کو دیکھ کر انہیں اپنا نواسہ یاد آجاتا تھا۔ چنانچہ اُس کو اپنے پاس ہی سلاتے تھے۔ اور ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ بھی چھت سے گر کر مر گیا۔ اِس صدمہ کو وہ برداشت نہ کر سکے اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ؎

اے انقلابِ عالم تو بھی گواہ رہنا کاٹی ہے عمر ہم نے پہلو بدل بدل کر

نظر، شاعر، ناقد، صحافی، مصور اور نہ معلوم کیا کیا تھے۔ جن کا نہ آج کلام ملتا ہے۔ اور نہ نثر کے مضامین۔ مخزن، زمانہ اور ادیب کی چند جلدوں میں آپ کا کلام بطور یادگار رہ گیا ہے

کلام پر تبصرہ

جس زمانہ میں آپ نے شعر کہنا شروع کیا۔ اُس وقت رنگ لکھنؤ زوروں پر تھا۔ اور اپنے ماحول سے جُدا ہو کر شعر کہنا آپ ہی کا کام تھا۔ اہلِ لکھنؤ نے آپ کے کلام کی کچھ داد نہ دی۔ بلکہ نظریں پھیر لیں تاہم آپ نے مولانا حالی کی تقلید کی اور غزل کہا اور نظم کہا، دونوں میں دہلی کے رنگ کا اتباع کیا۔ خارجی مرصع سازی کو نظر انداز کر کے داخلی پہلو کو زیادہ جگہ دی۔ تاثر اور سادگی پیدا کی۔ اِس میں شک نہیں۔ کہ آپ کا رتبۂ شاعری استادوں کے لگ بھگ نہیں ہے۔ البتہ دوسرے درجہ کے شاعروں میں آپ کا شمار ہو سکتا ہے۔ اُس زمانہ کے لحاظ سے آپ کی نظمیں ضرور قابلِ تعریف ہیں۔ اور ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

"صلائے عام" کے عنوان سے ایک نظم رسالہ زمانہ بابت ماہ جنوری ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ اُس کے چند اشعار پیشکش ناظرین ہیں۔ اِن سے آپ کے کلام کی مشاقی اور پختگی کا ضرور اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ نظم کسی انگریزی نظم کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اپنے مذاق کے مطابق بنانے کے لئے حذف و اضافہ سے بھی کام لیا گیا ہے:۔

خوابِ آئندہ زمانہ کے نہ دیکھ اُٹھ اے جواں
معرکہ اک سخت سر کرنا ہے تجھ کو بے گماں

اک طلسمی قلعے پر کرنا ہے دھاوا آج ہی ایک دیو کوہ پیکر سے ہے لڑنا آج ہی

اک حماقت ہے یہ کہنا وقت ابھی آیا نہیں
وقت ہے موجود ہر دم وہ کہیں جاتا نہیں

کہہ گیا ہے ہم سے پہلے خوب اک ناکامِ عشق
آج ہی ہو جائے، ہونا ہو جو کل انجامِ عشق

اس کی ہمت دیکھ اس کی بیقراری دیکھ تو
اور پھر مطلب دلِ جاں نثاری دیکھ تو

ہیں بہت سے کام آیندہ زمانہ کے لئے
عزت و توقیر ہم چشموں میں پانے کے لئے

ہوں وہ سب پورے کہیں جلد ہی خدا وہ دن کرے
لیکن ان سے پیشتر کا کام بھی انجام پائے

پہلے یہ میدان سر کر لے کہ طاقت ہے ابھی
ورنہ لاحق ہوگی پھر جیسی ضرورت ہے ابھی

یہاں ایک غزل کے چند اشعار ادیب[1] بابت اگست ۱۹۱۰ء سے بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:-

راز جس کو فلسفی کہتے ہیں ہفت افلاک کا
ہے وہ اک جوہر مرے آئینۂ ادراک کا

ناتواں رکھتے ہیں قدرت اہلِ طاقت سے سوا
زور دیکھ لے دل بگولوں میں خس و خاشاک کا

دے نہ ہمدم مجھ کو تکلیفِ بیانِ دردِ دل
دشمنی ہے پوچھنا احوال مجھ غمناک کا

نازِ انساں کیا کرے اس ہستیِ موہوم پہ
خاک میں مل جائیگا اک دن یہ پتلا خاک کا

دید کے قابل ہے رندوں کی سیہ مستی نظر
پاؤں پھیلائے جہاں کچھ سایہ دیکھا تاک کا

ذیل میں آپ کے کلام سے جو ہمیں دستیاب ہوا بہترین اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

انتقالِ جلال

یادگارِ ناسخ و رشک و ہلال
رہ گئے تھے ایک باقی بس جلال

سرگروہِ نکتہ سنجانِ زمن
شاعرِ کامل، ادیبِ بے مثال

آج دنیا سے ہوا اُن کا بھی کوچ
جھلملا کر بجھ گئی شمعِ کمال

ہو گئی سنسان وہ بزمِ ادب
جس کا ثانی اب جہاں میں ہے محال

کم نہ تھا کچھ ماتمِ داغ و امیر
اس پہ طرّہ ہو گئی مرگِ جلال

اُٹھ گئے ایک ایک کر کے سب بزرگ
ہند پہ نازل ہے کیا قحط الرجال

کامل و مشاق و ماہر اب کہاں
اب کہاں وہ مظہرِ شیریں مقال

شاعری نے دل پہ کھائے ہیں وہ زخم
تا قیامت ہو نہ جن کا اندمال

اب کہاں وہ لطفِ اندازِ قدیم
اب کہاں اگلی سی وہ قال و مقال

---

[1] :- اُستادِ نظر

نظم میں باقی نہیں آدابِ فن
شاعری کے مٹ گئے سب خط و خال

سو برس میں جمع جو باتیں ہوئیں
دس برس میں ہو گئیں خواب و خیال

چشمِ عبرت ہو تو اے اہلِ نظر
انقلابِ دہر کی دیکھو مثال

جس طرح آب و ہوا میں ہند کی
اب نہیں باقی وہ اگلا اعتدال

بس اسی صورت وہ تہذیبِ قدیم
رفتہ رفتہ مٹ گئی بے قیل و قال

گرتے ہی مے، زمینِ خرابات پی گئی
شاید یہاں پہ دفن کوئی بادہ خوار تھا

اک لختِ دل بچا تھا مگر وہ بھی اے نظر
آخر کو نذرِ دیدۂ خونابہ بار تھا

مجسّم داغِ حسرت ہوں، سراپا نقشِ عبرت کا
مجھے دیکھو یہی انجام ہے آخر کو اُلفت کا

جہاں میں چار دن رہ کر فقط بوئے وفا دینا
گلوں سے میں سبق لیتا ہوں آئینِ محبت کا

اتنی ہی رہ گئی ہے اب کائنات دل کی
دیکھو گے جب تم آکر کچھ اضطراب ہوگا

نہ ہوئی جلوہ گہِ ناز کی وسعت معلوم
گو میں ہر ذرّہ کو اک دیدۂ حیراں سمجھا

تباہی دل کی دیکھی ہے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے
ہو اب کیسی ہی بستی ہم اُسے ویرانہ کہتے ہیں

فنا ہونے میں سوزِ شمع کی منت کشی کیسی
جلے جو آگ میں اپنی اُسے پروانہ کہتے ہیں

ابھی مرنا بہت دشوار ہے غم کی کشاکش سے
ادا ہو جائیگا یہ فرض بھی فرصت اگر ہوگی

معاف اے ہمنشیں گر آہ کوئی لب پہ آ جائے
طبیعت رفتہ رفتہ خوگرِ دردِ جگر ہوگی

سُنتا ہوں کہ خرمن سے ہے بجلی کو بہت لاگ
ہاں ایک نگاہِ غلط انداز ادھر بھی

سُن لو کہ رنگِ محفل کچھ معتبر نہیں ہے
ہے اک زبان گویا شمعِ سحر نہیں ہے

مدت سے ڈھونڈتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے
وہ اک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے

یوں تو دل کو کبھی قرار نہ تھا
اب بہت بے قرار رہتا ہے

دل کی حالت نہیں بدلنے کی
اب یہ دنیا نہیں سنبھلنے کی

بس ایک نظر اور کہ اب ختم ہے قصہ
پھر ہوگی نہ تم کو مرے مرنے کی خبر بھی

ہوئی ہے کیا جانے کیا بُرائی قفس سے پاتے نہیں رہائی
گلوں کی بو تک اُڑ کے آئی، ادھر کی شاید ہوا نہیں ہے

کوئی مجھ سا مستحقِ رحم و غمخواری نہیں
سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں

عشق کی ناکامیوں نے اس قدر کھینچا ہے طول
میرے غمخواروں کو اب یارائے غمخواری نہیں

قفس سے چھٹ کے ہوا باغ باغ دل کیسا،
بہار دے گیا اجڑا ہوا نشیمن بھی

خزاں انجام ہے سب کی بہار جسمِ رنگ زدہ کا — بہت روتا ہوں صورت دیکھ کر گلہائے خنداں کی
آتے آتے رک گیا ہے دم جو مجھ دلگیر کا — آہ بھر کر منتظر ہوں آہ کی تاثیر کا

وہ ایک تم کہ سراپا بہار و نازشِ گل — وہ ایک میں کہ نہیں صورت آشنائے بہار
زمیں پہ لالہ و گل بن گئے آشکار ہوا — چھپا نہ خاک میں جب حسنِ خود نمائے بہار
تعلقِ گل و شبنم ہے رازِ الفت بھی — انہیں ہنسائے جہاں تک ہمیں رلائے بہار

پردہ اٹھائیے اک دن تو اے حجابِ ہستی — پاتا ہوں اس کو دل میں دیکھا مگر نہیں ہے
دل تھا تو ہو رہا تھا احساسِ زندگی بھی — زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھ کو خبر نہیں ہے
مرنے پہ جسمِ خاکی کیا ساتھ روح کا دے — راہِ عدم میں غافل گردِ سفر نہیں ہے

لے ساختگی جوشِ جنوں وادیٔ طلب ہے — چل نکلے ہیں گو ہم نے بیاباں نہیں دیکھا

سوزانِ غمِ جاوید سے دل بھی ہے جگر بھی — اک آہ کا شعلہ کہ ادھر بھی ہے ادھر بھی
وہ انجمنِ ناز ہے اور رنگ تغافل — یاں مرحلۂ آہ بھی، اندوہِ اثر بھی
وہ شمع نہیں ہیں کہ ہوں اک رات کے مہماں — جلتے ہیں تو بجھتے نہیں ہم وقتِ سحر بھی
جینے کے مزے دیکھ لئے تیری بدولت — اب اے دلِ ناکام تمنا کہیں مر بھی
اپنی شبِ ہجراں میں نہیں دخلِ تغیر — باطل ہے یہاں فلسفۂ شام و سحر بھی

ہر قدم پر باغِ عالم میں بچھا ہے دامِ حسن — کون ایسا ہے جسے ذوقِ گرفتاری نہیں
میری صورت دیکھ کر کیوں تم نے ٹھنڈی سانس لی — بیکسوں پر رحم آئینِ ستمگاری نہیں
ہر طرف سے یہ صدا آتی ہے ملکِ حسن میں — یہ وہ دنیا ہے جہاں رسمِ وفاداری نہیں
بند آنکھوں سے نظر آتی ہے ہر شئے دہر کی — عالمِ رویا میں فرقِ خواب و بیداری نہیں
اس کو رحم آئے کہاں یہ ناامیدی ہی امید — دل کو خوش کرتا ہے شغلِ گریہ و زاری نہیں

سوادِ شامِ غم سے روح تھراتی ہے قالب میں — نہیں معلوم کیا ہوگا جو اس شب کی سحر ہوگی
قفس سے چھوٹ کر پہنچے نہ ہم دیوارِ گلشن تک — رسائی آشیاں تک کس طرح بے بال و پر ہوگی
خموشی کیا مری تھی، کیوں زباں تک رازِ دل آیا — یہ کیا معلوم تھا فریاد اپنی بے اثر ہوگی
فقط اک سانس باقی ہے مریضِ ہجر کے تن میں — یہ کانٹا بھی نکل جائے تو راحت سے بسر ہوگی

ہمدموں نے جان لے لی پرسشِ آزار سے — یہ محبت اک عداوت تھی ترے بیمار سے
کیا یہی ہے وحشت و دیوانگی کی ابتدا — جی بہلتا ہے فضائے وادی و کہسار سے

کچھ بُرا ایسا نہیں واعظ کے مُنہ سے ذکرِ مے ۔۔۔ زہر بن جاتا ہے لیکن تلخیِ گفتار سے
اب نہیں معلوم کیا دُنیا میں ہے رنگِ بہار ۔۔۔ اک زمانہ ہو گیا چھوٹے ہوئے گلزار سے
باغِ عالم میں رہے بے لوث ہم سب سے نظرؔ ۔۔۔ سیرِ گلشن کی مگر دامن نہ اُلجھا خار سے
لٹا یہ کون غریب الدیار راہ میں ہے ۔۔۔ کہ مدتوں سے بلند اک غبار راہ میں ہے
جنوں میں منزلِ مقصود کا ہو رہبر کون ۔۔۔ خضر کا ساتھ بھی بیگانہ وار راہ میں ہے
سفر ہے منزلِ ہستی کے خواب کی تعبیر ۔۔۔ خزاں چمن سے چلی تو بہار راہ میں ہے
نہ ہی طلب میں ہم اک جانشیں کو چھوڑ گئے ۔۔۔ کہ ہم نہیں تو ہمارا غبار راہ میں ہے
مسافرت بھی ہے لوحِ طلسمِ دہر نظرؔ ۔۔۔ کہیں پہ دشت کہیں سبزہ زار راہ میں ہے

وفاتِ مادر

درد اُٹھا تھا نہ ایسا قلبِ شیدا میں کبھی ۔۔۔ یہ ہجومِ غم ہوا ہم پر نہ دنیا میں کبھی
اشکِ خونی بار بار آنکھوں سے ٹپکے تھے مگر ۔۔۔ اس قدر سُرخی نہ تھی خونِ تمنا میں کبھی
اپنے گھر میں آج ویرانی جو آتی ہے نظرؔ ۔۔۔ ہُو کا عالم یوں نہ ہوگا دشت و صحرا میں کبھی[1]
خشک ہوتا ہے وہ دریائے محبت آہ آہ! ۔۔۔ جس کی طغیانی رُکی دم بھر نہ دنیا میں کبھی
سر سے سایہ باپ کا اُٹھے ہوئی مدت مگر ۔۔۔ تھا نہ یہ دردِ یتیمی قلبِ شیدا میں کبھی
مہرِ مادر نے لیا دل ہاتھ میں کچھ اس طرح ۔۔۔ ایک آنسو تک نہ تھا چشمِ تمنا میں کبھی
زندگی ہنستے ہی گزری خوش رہے ہر وقت ہم ۔۔۔ دل نہ تھا اندیشۂ دنیا و عقبیٰ میں کبھی
صبح ہوتی تھی کہیں اور شام ہوتی تھی کہیں ۔۔۔ بزمِ عشرت میں کبھی سیر و تماشا میں کبھی
ہو گیا آغوشِ مادر بھی جدا آج اے نظرؔ ۔۔۔ اب ملے گی ایسی راحت پھر نہ دنیا میں کبھی

قطعہ

نہیں بدلتی یہ دنیا، بدلتے رہتے ہیں ہم ۔۔۔ کہ ہم کو ہوتے ہیں محسوس راحت و آلام
جو انقلاب ہوا زندگی میں انساں کی ۔۔۔ اسی کو کہنے لگے لوگ گردشِ ایام

---

[1] ردیف "کبھی" یہاں موزوں نہیں۔ صرف "بھی" آنا چاہیئے تھا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرتِ نظرؔ سے ردیف نہیں نبھی۔ تنہاؔ

سائل

١ بوالمعظم مرزا سراج الدین احمد خاں نام اور سائل تخلص تھا۔ آپ نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا شوق اوائل عمر ہی میں ہوگیا تھا۔ عربی، فارسی اور سنسکرت کے ساتھ فن شاعری اور طب سے بھی کافی واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ فن طب حکیم اجمل خاں مرحوم کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ تعلیم کا تکملہ تمام تر دلّی میں ہوا۔ اور نواب ضیاء الدین خاں اپنے دادا کی نگرانی میں تعلیم پائی۔ بہت نفاست پسند تھے۔ ریاست لوہارو سے تعلق تھا۔ اصل میں ان کے دادا فیروز پور جھرکہ کے رئیس تھے۔ وہ خوددار تھے۔ اور انگریز پسند نہ تھے۔ اُنہوں نے کسی مخالفت کی بنا پر مسٹر فریزر کے جو ایک اعلیٰ افسر تھا۔ دربار میں گولی ماردی تھی جس کی وجہ سے اُن کو ریاست سے برطرف کردیا گیا تھا۔ ریاست لوہارو کی آمدنی سے اُن کو حصہ ملتا رہا کیونکہ ریاست لوہارو ریاست الور کا ایک پرگنہ تھی۔ اُس کا تعلق براہ راست انگریزی حکومت سے نہ تھا۔

آپ بہترین گھوڑے سوار تھے۔ عمدہ بندوق لگاتے تھے۔ بلیرڈ بہت عمدہ کھیلتے تھے پتنگ بازی کا انتہائی شوق تھا۔ یہاں تک کہ پتنگ اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ کپڑا نہایت عمدہ سیتے اور تراشتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں ستمبر کے مہینے میں حیدر آباد گئے۔ اور ۱۷ نومبر ۱۹۳۷ء کی شب کو مکان پر مطالعہ کر رہے تھے۔ کرسی پر سے تقریباً ڈیڑھ بجے شب بستر پر جانے کے لئے اُٹھے۔ لیکن تین چار گھنٹے کی مسلسل نشست کی وجہ سے پاؤں سُن ہوگئے تھے۔ سنبھل نہ سکے۔ اور کرسی کے قریب ہی گر پڑے جس کی وجہ سے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ نو ہفتہ تک عثمانیہ ہسپتال میں رہے، اس کے بعد دِلّی آگئے۔ پھر نواب صاحب پاٹودی (نواب افتخار علی خاں) جو رشتے میں نواسے بھی ہوتے ہیں۔ پاٹودی لے گئے۔ عرصہ تک وہاں قیام رہا لیکن شعر و شاعری کا مشغلہ وہاں بھی برابر جاری تھا اکثر اصحاب دلّی وغیرہ سے بغرض شرکت مشاعرہ پاٹودی جاتے رہتے تھے۔ اپنے انتقال سے

ایک روز پہلے ۱۴ ستمبر کو دلی آئے۔ اور ۱۵ ستمبر کو انتقال فرما گئے۔

تصانیف آپ نواب مرزا داغ کے داماد اور شاگرد تھے۔ مشاعرہ میں پڑھنے کا انداز نرالا اور دلکش تھا۔ ترنم سے پڑھتے تھے۔ آپ نے ایک مثنوی جہانگیر و نور جہاں کے حالات میں لکھی ہے۔ چھ دیوان مرتب کئے تھے۔ ہر دیوان میں تقریباً آٹھ نو ہزار اشعار ہیں لیکن کوئی دیوان نہیں چھپا۔

کلام پر تبصرہ

مجھے آپ کا کلام دیکھنے کے لئے دستیاب نہیں ہوا۔ صرف ۲۷ اشعار آپ کے صاحبزادہ مرزا قطب الدین احمد خاں صاحب نے عنایت فرما دیئے تھے۔ اور مندرجہ بالا حالات نوٹ کر دیئے تھے۔ اگرچہ ہم نے مرزا داغ کے شاگردوں کو اپنی کتاب میں اس وقت تک جگہ نہیں دی جب تک کہ کوئی خاص خوبی ان کی اپنی نظر نہیں آئی۔ لیکن سائل و بیخود کو صرف اس بنا پر داخلِ کتاب کیا گیا ہے کہ دلی کے رہنے والے ہیں۔ زبان کا چٹخارہ لینا ہو۔ تو ان کا کلام ضرور پڑھنا چاہیئے۔ جو اشعار ہم کو میسر آئے۔ ان کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی خوبی کے علاوہ اور کوئی خوبی ہم کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ چار و ناچار انہیں اشعار پر اکتفا کیا گیا۔ اگر آئندہ ان کا کلام چھپ گیا۔ تو شاید ہم کسی آئندہ اشاعت میں سائل مرحوم کے کلام پر مزید تبصرہ کر سکیں۔

دیکھ کر آئینہ حیراں آئینہ دہ ہو گیا
اپنے اوپر اپنی ہی آنکھوں کا جادو ہو گیا

نقرے، فریب دے کے دل مبتلا لیا
مجھ کو غریب جان کے تم نے بنا لیا

زانو پہ وہ سر لے کے مرا ناز سے بولے
خنجر کی ضرورت ہو تو خنجر نہیں ہوتا

سننے سے پہلے کہتے ہو دیوانہ ہو گیا
معلوم تم کو مطلبِ افسانہ ہو گیا

تکلیفِ انتظار عبث جام کے لئے
بوتل کو توڑ ڈالئے پیمانہ ہو گیا

دو چار مل کے بیٹھ گئے بزم عیش ہے
دو چار خم لنڈھا دئے میخانہ ہو گیا

موسیٰ کی طرح مجھ سے بھی ہو جاؤ بے حجاب
تم جانتا اک اور بھی دیوانہ ہو گیا

زباں سے ہو سکے گی شرحِ اندازِ نظر کیا کیا
بتاؤں کیا مزے لیتا ہے دل کیا کیا جگر کیا کیا

ستم ہی ان کو کرنا تھا تو وہ بیہم ستم کرتے
بلا سے میں حریصِ لذت آزار ہو جاتا

اگر زاہد نے مے پی تھی تو پینے میں کسر کیوں کی
یہی ہوتا کہ وہ کچھ دن چڑھے ہشیار ہو جاتا

رہا ہوتے جو فصلِ گل میں دونوں ہاتھ وحشی کے
تو یہ ہوتا کہ سایہ غیرتِ گلزار ہو جاتا

جز ندامت تم کو بن آئیگا آخر کیا جواب
داد خواہوں نے اگر محشر میں دعوی کر دیا

اب تو تم آکر دکھا جاؤ مسیحائی کی شان
اب تو بیمارِ الم مرنے کے قابل ہو گیا

بڑی حیرت ہوئی بزمِ سخن میں دیکھ کر اس کو
سمجھتے تھے یہ ہم سائل کو ہوگا وہ کوئی بھوکا

آپ سے جائیں نہ لے جائیں، نہ رکھیں یار کہیں
آپ کو ہم دے چکے، اب آپ کا دل ہو گیا

پھر ذوقِ دیدِ یار نے مجبور کر دیا
پھر رہگذارِ یار کا میں پاسباں ہوا

سنتے ہی اس کا نام ٹپکتی ہے منہ سے رال
انگڑائیاں سی آتی ہیں دیکھی جہاں شراب

چھلک جائیں پیتے پیتے کبھی بادہ خوار بھی
برسا دو اب کی فصل میں اللہ میاں شراب

ہمیشہ خونِ دل رویا ہوں میں لیکن سلیقے سے
نہ قطرہ آستیں پہ ہے نہ دھبہ جیب و دامن پہ

کہاں ملتے ہیں ایسے باوفا دل
نہ مل تلووں سے آنکھوں سے لگا دل

ہزاروں وعدے کر لیں توڑ ڈالیں
حسینوں کا بڑا دیدہ بڑا دل

معاذ اللہ تری محشر خرامی
کہ اک اک گام پہ پس پس گیا دل

ہوئے زمانہ میں مشہور دید میں رسوا
نگاہِ ناز سے تم، چشمِ اشکبار سے ہم

کریں وہ شوق سے گر قتل کا سامان کرتے ہیں
عزیز ان سے کہیں اہلِ مروت جان کرتے ہیں

جس قدر صدمے مرے دل پہ گزر جاتے ہیں
دشمنوں پہ یہ گزر جائیں تو مر جاتے ہیں

آہ کرتا ہوں تو آتے ہیں پسینے ان کو
نالے کرتا ہوں تو راتوں کو وہ ڈر جاتے ہیں

رو کے کٹتی ہے یہاں شام و سحر فرقت میں
اشک آنکھوں سے مری آٹھ پہر جاتے ہیں

کھل گئی شمع تری ساری کراماتِ جمال
دیکھ پروانے کدھر تول کے پر جاتے ہیں

تیغ نہ تھی ادا تو تھی نیتِ قتل کیوں پھری
میں نے یہ کب کہا کہ یوں تم نے نہیں کہا کہ یوں

سجدہ کروں تو کس طرف کہئے بتاں ہیں یا خدا
قبلہ نما کہے ادھر حرمتِ نقشِ پا کہ یوں

دلی کی طرزِ گفتگو پوچھے کوئی تو شوق سے
سائلِ بے نوا کے شعر پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

سرِ درِ بتکدہ پر جا کے جھکا لیتے ہیں
دیکھ کر قدرتِ حق نامِ خدا لیتے ہیں

اک نہ اک طرح سے کر لیتے ہیں دل کی تسکیں
اک نہ اک رمز سبق دل کو پڑھا لیتے ہیں

ابرو پہ چھڑک چھڑک کے افشاں
کہتے ہیں ہلال کر رہا ہوں

بقدرِ ظرف پلاتا ہے یا بقدرِ زر
یہ کیوں لگائے ہیں ساقی خطوط ساغر میں

کس منہ سے اُن سے کہیے کچھ عرضِ مدعا
سو بار کہہ کے دیکھ لیا مانتے نہیں

سرگزشتِ دل سنیں گے دل لگی سمجھے ہیں آپ
آپ سن سکتے ہیں مانا ہم سنا سکتے نہیں

مری چشمِ خونبار نے کی ہیں کیا
مرے جیب و دامن پہ گلکاریاں

وہ کہتے ہیں سائل سے بچتے رہو
اُسے یاد ہیں لاکھ مکاریاں

دھوم ہے آج نئی طرح کی میخانے میں
شکلِ زاہد کی نظر آتی ہے پیمانے میں

بنی کیا کیا نہ اپنے دم پہ آزارِ محبت میں
نہ آتے تم تو کیا رکھا تھا بیمارِ محبت میں

عہدِ شباب عشق نے لوٹا دھڑی دھڑی
جورِ خزاں اٹھائے ہیں فصلِ بہار میں

ہے دخترِ رز پہ زاہدِ صد سالہ کی نظر
فرق آگیا ہے نیّتِ پرہیزگار میں

کونسی وہ بات ہے پوشیدہ ہم بھی تو سنیں
کہہ دیا ہے کیا رقیبِ بدگہر نے کان میں

اس خطر سے سارے پیراہن کی کر دیں دھجیاں
اشکِ خوں دامن پہ ہے داغِ رسوائی نہ ہو

تم جدھر ہو اس طرف پھر جائیں آنکھیں وقتِ نزع
حسرتِ دیدار اتنی ہو اگر کچھ بھی نہ ہو

کہا اُن سے مداوائے مریضِ دردِ غم کیا ہے
کہا وہ کل کا مرتا آج مر جائے تو اچھا ہو

ہوا ہوں اشکِ ندامت سے پاک دامن میں
یہ پانی وہ ہے کہ داغِ گناہ دھوتا ہے

جور کرنا ہے کرو، حشر میں کیا دوگے جواب
تم کو معلوم ہے یہ بھی کہ خدا عادل ہے

چارہ گر دل کہیں دینا تو سمجھنا یہ بات
ہچکیاں ہیں کہ یہ آوازِ شکستِ دل ہے

عہد و پیماں کیجئے اب کے سمجھ کر بوجھ کر
آپ کے وعدوں کی خاطر دل سے ہم جھوٹے ہوئے

تمہارا اعتنا اچھا نہیں بے اعتنائی سے
ہمیں یہ بات ثابت ہو گئی دشمن کی آئی سے

نغمۂ بلبل عجب اک دلگداز آواز ہے
اب یہ صاحبِ دل سمجھ لیں سوز ہے یا ساز ہے

ادھر گلچیں کی نیت ہے اُدھر صیاد کی نظریں
جھکی جاتی ہے بارِ گل سے شاخِ آشیاں میری

کرتے ہیں بات تجھ سے رقیبوں پہ ڈھال کے
تیور بدل کے غصّے سے آنکھیں نکال کے

دمِ رخصت مجھے تم یہ تو بتاتے جاتے
دم رکا جاتا ہے کیوں سینے میں آتے جاتے

ترے دل میں دل ڈالنے سے رہے
وفا سے غرض ہے کیے جائیں گے

عبادت میکدے کی ہیں بھی مقبول سمجھونگا
سحابِ فضلِ باری جب سرِ تربت برسیں گے

نہیں خوفِ روزِ جزا بھی ہے کچھ
قیامت میں بدلے لئے جائیں گے

جو کہتے ہیں محبت کو بلائے ناگہانی ہے
انھوں نے زندگی میں بھاڑ جھونکا خاک چھانی ہے

مجھے اب داد ملتی ہے جفا و ظلم سہنے کی
یہ اُن کی مہربانی ہے یہ ان کی قدر دانی ہے

گلے ملنے کی جلدی میں کسے سنتے ہیں یاد ارکان
نمازِ عید میں یاروں نے اک تکبیر کم کر دی

عنایت کی نظر تو نے بتِ بے پیر کم کر دی
مرے دل پہ لگا کر تیر نوکِ تیر کم کر دی

ایک گلشن میں ہے اک خانۂ صیاد میں قید
گل و بلبل کو میسر نہیں یکجائی بھی

آپ نے دل بھی کسے اپنا دیا ہے سائل
جو ستمگر بھی ہے مکار بھی ہرجائی بھی

ہم اور ترکِ شئے لالہ فام کر لیں گے
تمہارے کہنے سے زاہد حرام کر لیں گے

خدا سے جب سرِ محشر کلام کر لیں گے
تمہیں بھی حضرتِ موسیٰ سلام کر لیں گے

اللہ کی شان مل گئی روزِ جزا نجات
توبہ وکیل بن گئی میرے گناہ کی

بگڑے ہوئے مزاج کو احباب و غمگسار
کس طرح سے بنائیں گے کیونکر بنائیں گے

دلِ ناکام کو امیدِ کرم ہے تو سہی
دیکھنے کو سوئے در آنکھوں میں دم ہے تو سہی

پروانے مٹ رہے ہیں تری شمع بزم پہ
یہ انجمن اک اور تری انجمن میں ہے

غمِ فرقت میں اب یہ دل کا عالم ہوتا جاتا ہے
غلط کرنے پہ غم کے بھی فزوں غم ہوتا جاتا ہے

بیخود

حاجی سید وحید الدین احمد نام اور بیخود تخلص ہے۔ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ پہلے نادر بعد ازاں بیخود تخلص اختیار کیا۔ ۲۰ رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ کو ریاست بھرت پور میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ جہاں آپ کے اجداد عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز رہے تھے۔ پیدائش سے دو ماہ بعد اپنے آبائی وطن دہلی لائے گئے۔ والد کا نام سید شمس الدین احمد عرف سید احمد متخلص بہ سالم تھا۔ دادا کا نام سید بدر الدین احمد سالک تھا۔ جو مرزا غالب کے شاگرد کہے جاتے ہیں۔ پردادا نواب سید احمد میر خاں الملقب بہ امتیاز الدولہ افتخار الملک بہادر منصور جنگ عالمگیر ثانی کے وزیر تھے۔ منشی محمد کرم اللہ خاں عرف ننھے خاں متخلص بہ شیدا، آپ کے ماموں تھے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ تخلص آپ کی والدہ کے پھوپا تھے۔

آپ نے قدیم رسم کے مطابق اوّل قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ پھر فارسی پڑھی۔ مولانا حالی سے مہر نیمروز اور دو اور دیگر اساتذہ سے سبقاً سبقاً پڑھے۔ مولانا ئے مرحوم ہی کے ایما سے آپ کو ۱۳۰۹ھ میں حضرت داغ کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ چھ ماہ سے زیادہ حیدر آباد میں بسلسلۂ شاگردی اپنے استاد کی خدمت میں رہے۔ بعد ازاں دہلی آ گئے۔ اور چند سال کی محنت میں استاد کا رنگ حاصل کر لیا۔ اور ارشد تلامذہ میں آپ کا شمار ہونے لگا۔

پورے بتیس ۳۲ سال تک بیخود انگریزوں کو اردو اور فارسی کی تعلیم دیتے رہے۔ اور شاعری کی منزلیں طے کرتے رہے۔ فن سپہ گری سے بھی خوب واقف ہیں۔ سیر و شکار کا بیحد شوق تھا۔ ساٹھ برس کی عمر تک بے مثل بندوق لگاتے تھے۔ کشتی بھی لڑتے تھے۔ اب شب و روز اعمال و وظائف میں مشغول رہتے ہیں۔ زبان میں اثر ہے، دل میں درد ہے۔ دوسروں کی تکلیف سے بے چین ہو جاتے ہیں۔ اٹھاسی ۸۸ سال کی عمر ہے۔ ہاتھوں میں رعشہ ہو گیا ہے۔ عرصہ سے دلی کے مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ اور اب تو نہ ہندوستان میں مشاعرے ہوتے ہیں۔ اور نہ وہ شریک ہوتے ہیں۔

کلام پر تبصرہ

آپ کی غزلیں پڑھ کر دہلی کی زبان کا لطف آجاتا ہے۔ خیالات تو بہت معمولی ہیں۔ لیکن اُن کو سلیقہ سے باندھ دیا گیا ہے۔ اپنے استاد کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ لیکن استاد جیسا رنگ حاصل کرنا مشکل تھا۔ داغ کے یہاں مضامینِ نو کی بھی افراط ہے۔ یہی نہیں کہ زبان کے چٹخارے ہیں۔ بلکہ کہیں کہیں تو جذبات کی ادائیگی اس عمدگی سے ہوئی ہے۔ کہ اُس سے بہتر ممکن نہیں ہے حضرتِ بیخود صرف زبان کے اشعار پر فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن بعض بعض جگہ آپ نے کچھ الفاظ اس طور پر استعمال کئے ہیں۔ جو ہمارے روزمرّہ کے خلاف ہیں۔ مثلاً

بہتی پھرے گی حشر میں کشتی گناہ کی ۔۔۔ دریائے مغفرت کو اگر جوش ہو گیا

ہم کو کبھی اس طرح سُننے یا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جوش آگیا بولتے ہیں۔ جوش ہو گیا نہیں بولتے۔ اساتذۂ دہلی نے جوش ہو گیا کبھی استعمال نہیں کیا۔ ہاں جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ کہہ سکتے تھے۔ اسی طرح ہوش ہو گیا بھی بجائے ہوش آگیا استعمال کیا گیا ہے

تھی بیخودیِ شوقِ شب وعدہ عشق نہ تھا ۔۔۔ کھٹکا ذرا ہوا کہ مجھے ہوش ہو گیا

بزم میں شامل جانا، بیخود صاحب ہی نے لکھا ہے۔ ہمارے کان اس سے بھی آشنا نہیں شعر

ہم جانتے ہیں یا حضرتِ دل آپ سدھاریں ۔۔۔ جائینگے اب اُس بزم میں شامل تو نہیں ہم

یہاں ساتھ جانا یا ہمراہ ہونا چاہئے تھا

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ ردیف کو نہیں نباہ سکے۔ اور روزمرّہ کے خلاف قافیہ کو نظم کر دیا

بعض اشعار میں حشو و زوائد بھی آپ کے یہاں پائے جاتے ہیں مثلاً

مٹی نہیں ہے ابھی تک بھی حسرتِ پرواز ۔۔۔ قفس کو دیکھ کے ہم بال و پر کو دیکھتے ہیں

پہلے مصرعہ میں صرف اب تک کافی تھا۔ آپ نے ابھی تک لکھا۔ اور اس پہ مستزاد یہ کہ بھی کا اور اضافہ کر دیا۔ ایک جگہ مجبور بجائے مجبوراً لکھ گئے ہیں۔

اشک کی طغیانیوں سے ہو گئی پھیکی دوات ۔۔۔ خونِ دل سے لکھنے بیٹھا ہوں تجھے مجبور خط

ایک جگہ عین کو الف باندھ گئے ہیں۔

دشمن نے پاس رہ کے بگاڑیں سب عادتیں ۔۔۔ خوب آزمالی وضع تری دیکھ لی طرح

تعجب ہے کہ بعض متروکات بھی آپ کے کلام میں پائے گئے۔

ستا لیتے نہیں جب تک ہمیں بیچین ہتےہیں   ادا کس منہ سے کیجے شکر اُن کی مہربانی کا
کیجے کی بجائے کیجئے ہونا چاہیئے

بل بے چتون تری معاذ اللہ   اُف رے ٹیڑھی نگاہ کیا کہنا

آجکل بل بے کوئی استعمال نہیں کرتا۔ صرف دورِ چہارم تک لوگ لکھ دیتے تھے۔

آپ کے ایک معتقد لالہ مرلی دھر نے مضامین سے بے پروائی اور زبان کی خوبی آپنی ایک تقریظ بعنوان میخانۂ بیخود میں یہ خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اور بیخود کے کلام کی خوبیِ زبان کو اس طرح سراہا ہے :۔

"شاعری میں سب سے زیادہ زبان کی خوبی کو پسند کیا جاتا ہے۔ مضمون تو زباں داں بھی باندھ سکتے ہیں۔ کیونکہ مضمون آفرینی علم پر موقوف ہے۔ اور علم کسی کی میراث نہیں۔ جو شخص چاہے حاصل کر سکتا ہے لیکن زبان کی خوبی اہلِ زبان کے سوا کسی سے ممکن نہیں۔ . . . پس زباں داں مضمون آفرینی کے زعم میں یا فارسی ترکیبوں کے بل بوتے پر اہلِ زبان کو خاطر میں نہیں لاتے۔ تو وہ بیچارے مجبور ہیں انگوروں کو کھٹا نہ بتائیں تو کیا کریں۔"

کیا واقعی انگور کھٹے ہوتے ہی نہیں؟ کون ایسا شخص ہے جو زبان اور مضامین دونوں کو پسند نہیں کرتا۔ کیا دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ نے صرف زبان ہی پر فخر کیا ہے۔ اور مضامین کو اپنے کلام میں جگہ نہیں دی۔ یہ مثال تو عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہوگئی۔ لالہ صاحب کو چاہیئے تھا۔ کہ بیخود صاحب کی صرف زبان کی تعریف جس قدر چاہتے کرتے۔ مگر مضمون کی بے وقعتی اور دلی اور لکھنؤ کے علاوہ دیگر اصحاب کی زباندانی پر حرف گیری نہ کرتے۔

ہمیں تو حیرت ہوتی ہے کہ بیسویں صدی میں بیخود جیسے اصحاب خالی خولی الفاظ جمع کرنے پر اپنی ہمت صرف کریں۔ اور مضامینِ نو کی تلاش سے مستغنی ہو جائیں۔

حضرت بیخود کے دیوان گفتارِ بیخود میں تقریباً سات ہزار اشعار موجود ہیں۔ اگر یہ سب کے سب صرف زبان کی خوبی ہی کے اظہار کے لئے کہے گئے ہیں۔ تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اپنا وقت عزیز اور دوسروں کے روپیہ اور وقت کو کیوں ضائع کیا گیا۔ ہماری زبان نے اب کافی ترقی کر لی ہے۔ فرہنگ بھی کافی تعداد میں لکھی جا چکی ہیں۔ علاوہ ازیں بزرگوں کا کلام اس قدر موجود ہے۔ کہ ہر لفظ کی صحت و سقم کا پتہ چل جاتا ہے۔ زبان سیکھنے کے لئے نثر کی کتابیں بہت کافی ہیں۔ اب ان باتوں کو چھوڑ کر ہم کو صرف شاعری سے بحث کرنی ہے اور یہ دیکھنا ہے۔ کہ ہم ادعائے شاعری کے

ساتھ ساتھ فی الواقع شاعر بھی ہیں یا صرف ناظم ہیں۔ وہی بار بار عشقیہ باتیں، ملاقاتیں اور گھاتیں، آخر کہاں تک؟ افسوس ہے۔ اگر انداز بیان بھی نہ بدلے۔ اور وہی خیال بار بار پیش کیا جائے۔ اِس سے صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا۔ کہ شاعر کا علم محدود ہے۔ بلکہ یہ اس امر پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ کہ شاعر کے اپنے جذبات قطعی نہیں ہیں۔ صرف روایاتی اور رسمی طور پر اُن کو ادا کیئے جاتا ہے۔ لیکن جناب بیخود خود فرماتے ہیں۔ ع:۔ "زباں اُستاد کی بیخود تو ہو مضمون مومن کا"

ہم خود حضرتِ داغ کے کلام میں یہی نقص پاتے ہیں۔ لیکن اُن کا اندازِ بیان یقیناً اچھوتا ہے۔ ایسی بے ساختگی اور روانی دوسری جگہ نہیں پائی جاتی۔ اور یہ بات اُن پر ختم ہو گئی۔ شاگردانِ داغ صرف نقل اور پیروی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ فوقیت کا قطعی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ لہذا میں ایسے احباب سے جو صرف تقلید کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ وہ کیوں شاعری کو بدنام کرتے ہیں اور اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔

بیشک زبان کی خوبیاں بیخود کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ امر قابلِ تعریف ہے کہیں کہیں تو بہت ہی خوب کہہ گئے ہیں۔ مثلاً:۔

اِس طرح سے برباد نہ کر اہلِ وفا کو ڈھونڈے سے کبھی ملتے نہیں یہ لوگ، دعا کو

اب نام بھی وفا کا نہ لوں گا تمام عمر مجھ سے خطا ہوئی مجھے بخشو کسی طرح

تم کہتے ہو دل میں نہ کوئی میرے سوا ہو کیا ٹال دوں اس کو بھی محبت اگر آئے

لیکن دوسرے شعر میں کیا عشق اِسی کا نام ہے۔ کہ محبوب کی جفا شعاری سے تنگ آ کر اپنی وفا شعاری ہی کو ترک کر بیٹھیں۔

ذیل میں آپ کے اشعارِ آبدار درج کیئے جاتے ہیں:۔

یہ دل کبھی نہ محبت میں کامیاب ہوا مجھے خراب کیا، آپ بھی خراب ہوا

رسوائے عشق ہوں، ہمیں ارمان ہی رہا بدنامیوں کی پوٹ گریبان ہی رہا

مٹا دی مٹ کے داغ آرزو نے عشق کی دولت کوئی دن اور رہ جاتا تو یہ دل کو بنا جاتا

تم نے دیکھا شمع کے دِل میں لگا دی جس نے آگ عشق کا وہ شعلہ اس کمبخت پروانے میں تھا

بیخودِ میخوار کی دیکھی کرامت تو نے شیخ صبح کو مسجد سے نکلا شب کو میخانے میں تھا

غم میں ڈوبے ہی رہے دم نہ ہمارا نکلا بحرِ ہستی کا بہت دور کنارا نکلا

آگ بھر دی ہے محبت نے مری رگ رگ میں میرا تو خون بھی دوزخ کا شرارا نکلا

نصیبِ داغِ جگر لالہ زار میں بھی تھا
فسردہ غنچۂ خاطر بہار میں بھی تھا

ہر ایک پھول میں اُس کی جھلک نظر آئی
جمالِ یار کا پرتو بہار میں بھی تھا

مدفن میں اپنی خاک سے آتی صدا ہے مجھے
مَیں نقشِ پائے یار ہوں لیکن مٹا ہُوا

کبھی خونِ جگر پایا، کبھی لختِ جگر پایا
غمِ اُلفت نے اِس گھر سے وظیفہ عمر بھر پایا

نئی یہ بات دیکھی ہم نے اُس کے رازداروں میں
جنہیں آگاہ کچھ سمجھا اُنہیں کو بے خبر پایا

نکل کر آپ پردے سے ذرا باہر تو آ جائیں
قیامت میں جو کل ہوگا وہ اب کیا ہو نہیں سکتا

تیشے سے کوئی کام نہ فرہاد سے ہوا
جو کچھ ہوا وہ عشق کی امداد سے ہوا

بندہ پرور غمِ فرقت کا اثر دیکھ لیا
داغِ دل دیکھ لیا داغِ جگر دیکھ لیا

دِل کو پہلو میں اضطراب رہا
زندگی بھر یہی عذاب رہا

ہو لئے جس کے ہو لئے بے خود
یار اپنا تو بے حساب رہا

رہا داغ اُن کا پسِ ترکِ اُلفت
نہیں کھیل دل سے بھلانا کسی کا

رہے گی دہن میں زباں اپنے جب تک
زباں پر رہے گا فسانہ کسی کا

شبِ فراق اثر کا پتا کہیں نہ ملا
فلک پہ جا کے بھی نالہ مرا پکار آیا

دِل مِلا کر وہ بے وفا نہ مِلا
دِل لگانے کا کچھ مزا نہ مِلا

درد سے آشنا نہ ہو جب تک
آدمی کام کا نہیں ہوتا

یہ جوشِ جنوں رنگ لانے لگا
گریباں تک اب ہاتھ جانے لگا

مرنا فراقِ یار میں دشوار ہو گیا
پاسِ وفا بھی جان کا آزار ہو گیا

حشر میں بھی اُنہیں نئی سوجھی
بن گئے دادخواہ کیا کہنا

کِس کا فسانہ تھا کہ چمن میں ہر ایک گل
سُننے کے واسطے ہمہ تن گوش ہو گیا

اب کے اگر رقیب سے وہ دلستاں ملا
ہم دینگے خاک میں تجھے اے آسماں مِلا

ظالم کہیں وہی تو نہ تھا بے خودِ حزیں
تیری گلی میں کل ہمیں اک نیم جاں مِلا

وفا دیکھئے رنگ لاتی ہے کیا کیا
محبت ابھی گُل کھِلاتی ہے کیا کیا

نہ دنیا کا غم تھا نہ عقبیٰ کا کھٹکا
جوانی مجھے یاد آتی ہے کیا کیا

گویا زبانِ حال سے ہے آپ کا شباب
یہ شوخیاں یہ حسن یہ نامِ خدا شباب

ہر گل کی پنکھڑی پہ یہ لکھا ہوا ملا
کیا بے ثبات عمر ہے کیا بے وفا شباب

دکھاتے سیر تجھے ہم بتوں کے کوچے کی
ترے نصیب میں زاہد مگر کہاں جنت

کر رہی ہے خواب سے بیدار غنچوں کو نسیم
منعقد ہونے کو ہے گلزار میں دربار صبح

اس کی نگاہِ ناز کبھی چوکتی نہیں
کرتی نہیں خطا یہ کبھی تیر کی طرح

بیخود فراقِ یار میں آئی نہ موت بھی
کمبخت یہ بھی ٹال گئی، دے گئی طرح

محوِ جمال ہیں کسی گل پیرہن کے گل
مشتاقِ دید ہے کسی نازک بدن کی شاخ

مل جائے وہ تو اس کی بلائیں ضرور لوں
میں ڈھونڈنے چلا ہوں دعا کو اثر کے بعد

نکلی یہ جان یا کوئی کانٹا نکل گیا
راحت ملی ہے آج مجھے عمر بھر کے بعد

پیش آئیں راہِ عشق میں وہ سخت منزلیں
رہزن کی ہے تلاش مجھے راہبر کے بعد

مٹ گیا غمِ ہستی اس پہ مبتلا ہو کر
عشق نے اثر بخشا درد کی دوا ہو کر

بگڑتا اس کا غصہ میں بھی شوخی سے نہیں خالی
مزے کی بات کہہ جاتا ہے ظالم بے مزا ہو کر

عشق کی کدورت نے صاف کر دیا دل کو
آئینہ کو چمکایا زنگ نے جلا ہو کر

خدا وقت ایسا نہ ڈالے کسی پر "
اجل بھی تو روتی مری بے کسی پر

نہیں لگتی دم بھر کی بھی دیر بیخود
برا وقت آتے ہوئے آدمی پر

زباں استاد کی بیخود تو ہو مضمون مومن کا
بیاں غالب کا ہو اشعار کی یہ شان پیدا کر

زمانہ حضرت بیخود کبھی یکساں نہیں رہتا
کہیں گزرے ہے دنیا میں کسی کی ایک حالت پر

نظر کرتا ہوں میں گزری ہوئی جب اپنی حالت پر
مرے آنسو ٹپک پڑتے ہیں دشمن کی مصیبت پر

وطن کو چھوڑ کر میری طرح کیا یہ بھی نکلی ہے
اداسی کس قدر چھائی ہوئی ہے شامِ غربت پر

عشق میں ویراں سا ویران تھا یادش بخیر
مجھ کو دل یاد آ گیا سونا بیاباں دیکھ کر

اس گلشنِ ہستی میں لگتا نہیں دل اپنا
آئے ہیں خدا جانے ہم کس سے جدا ہو کر

مدت ہوئی ہے یار کا دیکھے ہوئے جمال
لیکن گئی نہیں مری خود رفتگی ہنوز

غفلت تو دیکھئے کہ وہ دل میں چھپا رہا
ڈھونڈا فلک پہ اس کو، کیا عرش پر تلاش

بلبل کے دل پہ برق گری غنچہ کیا کھلا "
اس حادثے کی کب ہے گلِ تر کو اطلاع

کیوں خضر کے پیرو ہوں تری راہِ طلب میں
آوارہ و گم کردہ منزل تو نہیں ہم

بات رہ جائے اگر حشر میں آئے یہ ندا
پیش ہوں پہلے محبت کے گنہگار تمام

کچھ حوصلے ہی پست بہت آدمی کے ہیں
ورنہ ہر اک نگاہ میں جلوے اسی کے ہیں

گریباں ڈھونڈتے ہیں ہاتھ میرے
چمن میں پھول کھل جانے کے دن ہیں

نہ لینا نام دلّی کا ہمارے سامنے بیخود
اُسی اُجڑے ہوئے گلشن کے ہم بھی رہنے والے ہیں

پوچھئے خارِ تمنّا کی خلش کو دل سے
یہ وہ کانٹے ہیں کھٹکنے میں مزا دیتے ہیں

غمِ اُلفت سے دل لاکھوں پریشاں ہوتے جاتے ہیں
یہ گھر آباد ہو جانے سے ویراں ہوتے جاتے ہیں

نہ دیکھے ہونگے رندِ لااُبالی تم نے بیخود سے
کہ ایسے لوگ اب آنکھوں سے پنہاں ہوتے جاتے ہیں

کر دیا خاک مجھے تو نے جلا کر اے دل
جھونکدوں تجھ کو دہکتے ہوئے انگاروں میں

بجھائیں شمع کے دل کی لگی پروانے جب جانیں
یہ اپنی آگ میں جلتے ہیں تو کیا گل کترتے ہیں

زباں اُستاد کی بیخود ترے حصّے میں آئی ہے
پھر اتنا بھی نہیں کوئی خدا رکھے ترے دم کو

الٰہی گل پہ کیسا گزری چمن میں
کہ بگڑی شکل پھر اُس نے کلی کی

مایوسِ آرزو بھی ہوں، مانوسِ یاس بھی
دل میں جگہ نہیں ہے تمنّا کے واسطے

اگر تخمِ محبت باغباں گلشن میں بو دیتا
بجائے برگِ گل شعلے نکلتے شاخساروں سے

مرے افسانۂ دل سے زمانہ ہو گیا واقف
بہت اب شمع سے کھٹکا ہوا پروانہ رہتا ہے

نگاہِ شرم میں پیدا شرارت ہوتی جاتی ہے
تری اُٹھتی جوانی اب قیامت ہوتی جاتی ہے

مرقد پہ بعدِ مرگ گھٹا آ کے رو گئی
کلفت یہ بیکسی کی مرے دل سے دھو گئی

بیتاب ہوں کیا چیز جدائی ہے نظر سے
ہونے کو تو دل بھی ہے مرے پاس جگر بھی

کیفی

پنڈت برج موہن دتاتریہ نام اور کیفی تخلص ہے۔ آپ کے والد پنڈت کنہیا لال راجہ بھرپور سنگھ کے عہد میں ریاست نابھہ میں افسر پولیس تھے۔ کیفی کی ولادت ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو بمقام دہلی ہوئی۔ ابھی بہت صغر سن تھے۔ کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ بازار سیتارام میں رہتے تھے۔

شاعری کا مذاق آپ نے اپنے ایک بزرگ پنڈت نرائن داس ضمیر دہلوی سے ورثہ میں پایا۔ شاعری کی ابتداء اس زمانہ کے مذاق اور رواج کے مطابق غزل سے ہوئی۔ مگر خود آپ کے قول کے مطابق یہ رنگ پختہ نہ ہونے پایا تھا۔ کہ اسے ترک کر دیا۔

آپ ریاست کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سکرٹری کے عہدۂ جلیلہ سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک پہاڑی ریاست چنینی میں کچھ عرصہ تک مجسٹریٹ اور کلکٹر کے فرائض ادا کرتے رہے لیکن ادبی مشاغل برابر جاری رہے۔ کیفی فارسی اور انگریزی میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں ہندی میں کامل ہیں۔ عربی اور سنسکرت سے بھی واقف ہیں۔

آپ نے ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کی دعوت پر نہایت عالمانہ لکچر تاریخ اور اردو شاعری پہ انگریزی زبان میں دیئے۔

۱۹۳۰ء میں جناب کیفی اردو کے متعلق ایک کانفرنس میں حیدرآباد بلائے گئے۔ جو حضور نظام دکن کے حکم سے منعقد ہوئی تھی۔ اس موقع پر آپ نے ایک نہایت عمدہ لیکچر مبادیاتِ فصاحت کے موضوع پر عثمانیہ یونیورسٹی میں دیا۔ جو رسالہ اردو اورنگ آباد دکن میں شائع ہو چکا ہے۔ زیادہ تر آپ کا قیام پنجاب میں رہتا تھا۔ اور پنجاب و کشمیر کے خوش کلام اصحاب آپ کے مشورۂ سخن سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔

نظم میں بھارت درپن، خمخانۂ کیفی، پریم ترنگنی، شوکتِ ہند، تزکِ قیصری، اور نثر میں عورت اور اس کی تعلیم، چراغ ہدایت، پریم دیوی، مہتارانا (نیم تاریخی ناول) ڈراما، راج دلاری

اور ڈراما مراری وادا چھپ چکے ہیں، جب شہنشاہ جارج پنجم دہلی میں دربار تاجپوشی کے لئے آئے۔ تو آپ نے ایک قصیدہ تصنیف فرمایا۔ جو تمام اردو منظومات میں بہترین قرار دیا گیا اور گورنمنٹ کی طرف سے آپ کو ایک تمغہ اور سند اعزازی عطا ہوئی۔

کیفی صاحب نہایت صلح پسند اور مرنجان و مرنج بزرگ ہیں۔ خاکسار کو ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔

کلام پر تبصرہ

ہمارا خیال ہے۔ کہ کیفی صاحب نظم سے نثر بہتر لکھتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ نظم قابل اعتنا ہی نہیں۔ اگر فی الواقع نظم دلکش نہ ہوتی۔ تو آپ کا نام نامی داخل کتاب ہی نہ کیا جاتا۔ البتہ نظم سے غزل کسی قدر بہتر ہوتی ہے۔ اور آپ کی نظموں میں وہ پختگی، دلآویزی اور روانی نہیں ہوتی۔ جو غزلوں میں پائی جاتی ہے۔

ہم صرف ایک غزل سے مثالاً چند شعر لکھتے ہیں:۔

دیر و حرم میں کس لئے بھٹکا کرے کوئی — خالق کو کیوں نہ خلق میں دیکھا کرے کوئی

حسن ازل کی ہر کہیں ظاہر ہے آب و تاب — ہاں شرط ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی

قطرے میں بحر، ذرے میں خورشید دیکھ لے — یہ آنکھ، یہ نگاہ تو پیدا کرے کوئی

محدود ہے یہی کل و مستقبل تک ان کا علم — زیبا نہیں کہ نازش بیجا کرے کوئی

وہ شے ہے کون سی کہ جو میسر نہیں یہاں — کس چیز کی جہاں میں تمنا کرے کوئی

ان اشعار کے بالمقابل آپ کی نظموں کے اشعار میں اس قدر کشش نہیں پائی جاتی۔

چونکہ آپ عربی اور سنسکرت دونوں سے واقف ہیں۔ اس لئے آپ کے یہاں دونوں زبانوں کے الفاظ کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

مگر کب تک چھپا رہتا وہ نور اس خاک ظلمت میں — ظہور اس کا ہوا آگنی سے پرکرتی کی صورت میں

محیط اور حاوی کل کون تھا کون اس اپنی ضمیر تھا — اکھنڈ پانی ہی پانی تھا وہ موّاج اک سمندر تھا

بہار گلشن کشمیر میں آپ کے کلام کی نسبت یہ رائے ظاہر کی گئی ہے:۔

"نیچرل شاعری کے نمونوں میں کیفی نے خشک مضامین میں رنگین بیانی کی چاشنی آمیز کی، اور وہ ہندوستان کے ایک پختہ مغز اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔"

"صاحبِ موصوف اُس زمانہ کی یادگار ہیں، جبکہ ہندوستان اور خصوصاً دہلی کے ہندو مسلمان ماں جائے بھائیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک مذاق، ایک رنگ اور ایک زبان تھی۔"
یہی وجہ ہے کہ کیفی صاحب میں اسلامی کلچر اور قدیم مودت کے نمایاں آثار نظر آتے ہیں۔ اردوئے معلیٰ ان کی مادری زبان ہے۔

لیکن کہیں کہیں آپ کی عدمِ توجہی سے کلام میں استقام کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً:۔
"برسات کی بہاریں" کے ذیل میں آپ فرماتے ہیں:۔

برسات کی بہاریں مورں کی وہ چنگھاڑیں
وہ جاں فزا پھواریں وہ گاین آبشاریں
پُر جوش جوئباریں
دھومیں مچا رہی ہیں

چنگھاڑیں اور بہاریں ہرگز ہم قافیہ نہیں۔ لہٰذا یہ قافیہ قابلِ اعتراض ہے۔
مرثیۂ حکیم اجمل خاں مرحوم میں ایک شعر ہے:۔

قول اور فعل کا آساں نہیں یکساں ہوتا جوہر انساں کا ہے ہمدردیٔ انساں ہونا

ہمدردیٔ انساں کے بجائے ہمدردِ انسان ہونا چاہئے تھا۔ یہ روزمرہ کی غلطی ہے۔ اہلِ زبان اس طرح نہیں بولتے۔

آپ کا مطبوعہ کلام شائع ہو گیا ہے۔ اُس کو دیکھ کر ہم صرف یہ عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ کیفی صاحب آیندہ اس کی اشاعت خود کریں۔ اور خصوصاً اپنی نظموں پر نظرِ ثانی فرمائیں تاکہ اُن کے آبگینۂ نیک نامی کو ٹھیس نہ لگے۔

ذیل میں آپ کے بہترین اشعار لکھے جاتے ہیں:۔

حسن کا ہے یہ وفور اس کو نہ کہہ دل تنگی رنگ بھی سینے سے غنچے کے پرافشاں نکلا
جو برق بن کر تڑپ رہی ہے جو ابر بن بن کے رو رہا ہے وہ میری بےچین آرزو ہے یہ میرے دل کا بخار ہوگا
بتائیں کیا تجھ کو چشمِ پُرنم ہوا ہے کیا خون آرزو کا بنا گلِ داغِ یاس و حسرت جو دل میں قطرہ بچا ہوگا
دبے جو گھٹ گھٹ کے دل میں ارماں وہ برق بنکر فلک پہ تڑپے جو ولولہ جی میں رہ گیا تھا وہ بلبلہ اب ہے آبِ جو کا
کھلا لبِ گور سے یہ عقدہ کہ خواب تھی سب نمودِ ہستی وقوفِ تا عمرِ منزلِ کمال ہے میری جستجو کا
طلسمِ دیر و حرم ہے تجھ پہ ہنوز دلّی ہے دور ناداں وہاں ترا خاک دل لگے گا وہ ہے سراسر مقام ہُو کا

ہوں تصنّع سے بری، ایک ہے ظاہر باطن
دِل میں جو ہوگا وہی اپنی زباں پر ہوگا

کیا ہوا مرکزِ ہستی، اگر انساں نہ ہوا
آبرو خاک ہے قطرہ کی جو طوفاں نہ ہوا

جامہ پہنے رہا پروانوں کی جانبازی کا
شعلہ فانوس کے پردے میں بھی عُریاں نہ ہوا

غم رہا اُن کا جو دوزخ میں پڑے جلتے ہیں،
میرے خوش ہونے کا جنّت میں بھی ساماں نہ ہوا

اب تو یہ حضرتِ ساحر کو شکایت نہ رہی
کیفیِ سحر نوا آج غزل خواں نہ ہوا

بے خودی نے محوِ حیرت کر دیا
آپ میں اپنا تماشا ہو گیا

کرشمہ ریزیِ حسن سے کیوں بھٹک رہا ہے تو دنگ ہوکر
شکستہ پا ہو کے کاش گرتا اک آستانے پہ سنگ ہوکر

شکستِ رنگِ اُمید کی ہے صدا وہ ضبطِ آرزو کہ نکلی
گلوئے مینا سے ہو کے قلقل جگر سے ہم کے ترنگ ہوکر

ہے دعویِ عشقِ خام کاری یہ ظالم ایسا ہے تم قاتل
چڑھا جو سر کو بخار بن کر تو دل میں بیٹھا ہے زنگ ہوکر

یہ باغِ عالم ہے جائے عبرت دو روزہ دولت ہے حسنِ صورت
وہ پھول کانٹوں میں پل رہا ہے جو سر چڑھا شوخ و شنگ ہوکر

شباب میں بھی عجب فسوں تھا بہار یہ مستی تھی یا جنوں تھا
جو سر میں آیا سرور ہوکر تو دل پہ چھایا اُمنگ ہوکر

وہ حُسن نے پائی رم شعاری ہے جس سے چشمِ سراغ عاری
ہوا میں لو ہو کے جا سمایا کھلا رخِ گل پہ رنگ ہوکر

کرشمۂ حُسنِ جانستاں کی ستم ظریفی کا کیا بیاں ہو
کہ دل میں یہ درد بن کے بیٹھا جگر سے نکلا خدنگ ہوکر

نہ کوہ و صحرا میں نکلی حسرت کہیں بھی پائی نہ جب فراغت
یہ نقطۂ دل میں آ سمایا جہاں کی وسعت سے تنگ ہوکر

یہ مجھ کو بےبس کیا ہے کیفی مئے محبت کی بے خودی نے
کہ خواہشیں دل کی اڑ رہی ہیں گلوں کے چہرے کا رنگ ہوکر

خیالِ یار سے ہم دُور ہوں تو پھر کہاں ہم ہوں
سمایا ہے رگوں میں خون ہوکر تن میں جاں ہوکر

عہدِ وفا سے یہ نہیں اقرار ہی نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں انکار ہی نہیں

گل کیا ہے پتّے پتّے میں اک شانِ دلبری
آنکھیں تمہاری طالبِ دیدار ہی نہیں

حُسن عشق میں ہے یا عشق حُسن میں مضمر
جوہر آئینہ میں یا آئینہ ہے جوہر میں

فرطِ سوزِ اُلفت میں دیکھ کر سکونِ دل کا
بجلیاں چمکتی ہیں بادلوں کے محشر میں

ہوں وہ رند یا صوفی مست اُس کی دُھن میں ہیں
جانے کتنے میخانے بھر دئے ہیں کوزہ میں

غمِ دُنیا نہیں پھر کونسا غم ہے ہم کو
فکر و اندیشۂ عقبیٰ سے بھی رم ہے ہم کو

دہنِ غنچہ سے پیغامِ وفا سُنتے ہیں
غمازۂ عارضِ صد ہستی، عدم ہے ہم کو

داستانِ عشق تم مجھ سے سُنو
قیس و لیلیٰ کی کہانی اور ہے

آدمی بُت اور بُتِ تصویر ہو
گفتگوئے بے زبانی اور ہے

عشق نے جس دل پہ قبضہ کر لیا پھر کہاں اُس میں نشاط و غم رہے
برہم زن حجاب ہے خود رفتگیِ حسن اک شانِ بے خودی ہے زلیخا کہیں جسے
گل پہ بلبل ہے فدا، سرو پہ قمری ہے نثار گل کھلائے ہیں یہ کس کی چمن آرائی نے
کر دیا کثرتِ جلوہ نے نظر کو خیرہ دیکھتا تھا جو نہ دیکھا وہ تماشائی نے
ہو نورِ حسن جو دل میں تو ہر نفس تیرا شمیمِ باغِ جناں ہو مشامِ جاں کے لئے
سمجھ کے زیست کو دو روزہ کیوں ہوا مایوس جہاں ہے تیرے لئے اور تو جہاں کے لئے
بنی ہے تیری ہی خاطر تو ساری موجودات زمیں کا لقمہ نہ ہو جورِ آسماں کے لئے

طلوعِ سحر

تھا دُور ایک منزل، ابھی لشکرِ سحر سرہنگِ شب نے بجا کے دنیا کو دی خبر
شبنم کے قاصد آئے غباروں میں بیٹھ کر ان سے صبا نے سُن کے خبر کی یہ مشتہر

سرگوشیاں تھیں غنچوں میں ہے کس کا انتظار
جو رایتِ شفق ہوا مشرق سے آشکار

آ کر جو کی نسیم نے شوخی سے گدگدی تو ہر کلی کی آنکھ وہیں چٹ سے کھل گئی
بلبل کی جانب اُس نے اچانک نگاہ کی کچھ دیکھ کر اِدھر اُدھر اک بار ہنس پڑی

تھی تاک میں شمیم وہیں پہ لگی ہوئی
اُس کی بدولت اُس کی چمن میں ہنسی اڑی

چپکے سے کیا نسیمِ سحر نے سُنا دیا غنچوں کے دل کو فرطِ طرب سے کھلا دیا
بادِ سحر نے معجزہ اپنا دکھا دیا شبنم کے چھینٹے دے کے چمن کو جگا دیا

غنچے بھی کھل کھلا کے گلستاں میں ہنس پڑے
انگڑائی لے کے سرو و صنوبر ہوئے کھڑے

رنگِ شفق سے تھا جو افق ملکِ زرنگار یکمشت گل نے کیسر و زر کر دیا نثار
عروسِ باغ کا تھا حُسن اور نکھار صدقہ ہزار جان سے تھی عندلیبِ زار

مُنہ شاہدانِ گل کے جو شبنم نے دھوئے تھے
سنبل کے بال بال میں موتی پروئے تھے

ہوا تھا دہر میں اک نور کا سماں دھویا ہوا تھا آبِ رُخِ حور سے جہاں

انجم کا آسماں سے کھسکنا تھا کارواں — مہتاب کے بھی منہ پہ اُڑی تھیں ہوائیاں
شب زندہ دارِ چرخ کا بھی رنگ فق ہوا
غالب ہر ایک رنگ پہ رنگِ شفق ہوا

نکلا جو خیمے سے شہِ گیتی ستانِ صبح — خاطر پئے سلام ہوئے افسرانِ صبح
فوجِ شعاع لے کے بڑھا قہرمانِ صبح — لہرا رہا تھا پیلِ فلک پر نشانِ صبح
ڈنکا ہوا طیورِ چمن کی صفیر کا
اک غل تھا آمدِ شہِ گردوں سریر کا

فوجِ شعاع کی ہوئی آمد کی جب یہ دھوم — تو ہو گیا فلک سے ہوا لشکرِ نجوم
مشرق میں یوں ہوا شہِ خاور کا جب قدوم — آنکھوں پہ رکھے سب نے قدم اُس کے چوم چوم
اک دم میں شب کی تیرگی کافور ہو گئی
دُنیا چمک کے اک کرۂ نور ہو گئی

ترقیِ اُردو

نہیں احساس کیا احباب کو موجودہ حالت کا — ہے رفتارِ زمانہ میں چلن بجلی کی سرعت کا
زمانہ جدت آئیں ہے زمانہ جدت آگیں ہے — بنا ہے بانگِ بے ہنگام افسانہ قدامت کا
طبیعی زندگی جس طرح ہے تغیر کا معرض — ادب پر بھی ہے عائد حکم تغیر اور جدت کا
کبھی اُردو زباں کی آپ نے تاریخ بھی دیکھی — کہ تھا معیار کیا پہلے اور اب کیا ہے فصاحت کا
قدامت کے اگر ہو مدعی تو شوق سے بولو — جگہ کو "جاگہ" اس میں کیا ہمن کو "محل" حجت کا
وہی بولو زباں ہاں ہاں سمجھ نیچ مطلب آوے ہے" — ہمیں کیا "کار وہ لیویں نہیں سیتی" بصیرت کا
کرو باتاں سجن سیں" جس طرح اسلاف کرتے تھے — کرو انجواں" سے دریا برد سارا ملک بصارت کا
بہت اچھا ہوا جو کچھ ہوا ہے اگلے وقتوں میں — سزاوارِ اہانت ہے نہ مستوجب شکایت کا
محقق اِن دفینوں میں جواہر ڈھونڈھ سکتے ہیں — کلام اُن کا ہے اک سرچشمہ تاریخی افادت کا
وہ احساسات کے بندے تھے ہم کو کام کرنا ہے — یہی ہے امتیاز اُن کی، ہماری ذہنی حالت کا
کفن، بستر، قریم، انشا و غالب اور ناسخ نے — جو باندھا تو قدامت نے کیا صاد اُس پہ صحت کا
وہ آغازِ تغیر تھا، نہ فرمایا گیا اِس پہ — یہ استعمال ناجائز ہے، سقم اس میں غرابت کا
مزے سے ذوق "اُڑائیں فیر" اور انشا "لفن" لکھیں — ڈنر، ٹوس اور بسکٹ میں ہے اُن کو عذرِ حلت کا

رواں

چودھری جگت موہن لال رواں ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء کو منشی گنگا پرشاد کے یہاں اناؤ (مضافات لکھنؤ) میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ۴۵ سال کی عمر پائی۔ عہد طفلی ہی میں سایۂ شفقت پدری سے محروم ہو گئے تھے۔ اپنے بڑے چچا منشی کنہیالال صاحب کی بزرگانہ تربیت و تعلیم کی بدولت ۱۹۰۷ء میں انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۱۱ء میں بی اے، ۱۹۱۳ء میں ایم اے اور ۱۹۱۶ء میں ایل ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ وکالت شروع کی۔ تو بہت جلد کامیاب وکلا کی صف اوّل میں نظر آنے لگے۔

کہا جاتا ہے کہ چھ سال کی عمر میں شعر و سخن سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ اور کچھ اشعار کہنے لگے تھے۔ مجھے اس کم عمری میں شعر کہنے کا یقین نہیں اور کچھ تک بندی اگر کسی نے کر لی۔ تو وہ قابل الذکر نہیں۔ جناب عزیز لکھنوی سے شعر و سخن میں مشورہ کرتے تھے۔ اور ان سے اصلاح لیتے تھے۔ جناب عزیز مرحوم رواں کو دل کا شاعر سمجھتے تھے۔ شاید یہ بات صحیح ہو۔ رواں نظم بھی کہتے ہیں اور غزل بھی اور رباعیوں سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ افسوس ہے کہ بہت کم عمری میں انتقال فرمایا۔ ورنہ آیندہ دس سال کے اندر ان کا کلام زیادہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا۔

کلام پر تبصرہ

آپ کی نظمیں اور غزلیات پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ آپ ایک شگفتہ شاعر ہیں۔ روانی اور مضمون آفرینی دونوں موجود ہیں۔ اخلاقی درجہ کو گرنے نہیں دیتے۔ نظمیں ہر قسم کی ہیں یعنی معمولی بھی ہیں اور اچھی بھی۔ خامیاں ضرور پائی جاتی ہیں۔ لیکن کوئی شاعر ایسا نہیں ہے۔ جس کے یہاں نقائص نہ ہوں۔ سرود عشق، معمائے فطرت، تتلی، لاوارث بچہ، معجزۂ انتظار، چیر کوٹ، پیام زمنی عظمت تو یہ سب عمدہ نظمیں ہیں لیکن ساتھ ساتھ ہی ان میں لغزشیں بھی ہیں۔ ایک نظم غبارہ ہے۔ اس میں تشبیہات خوب ہیں مثلاً

زمیں سے جانب بام فلک رواں ہے تو ۔۔۔ مسافرہ بے جادہ و نشاں ہے تو

ہوا پہ اک فرسِ شعلہ جست کرکے چلا — کہ کوئی طائرِ زریں اُڑان بھر کے چلا
پڑا ہے یا کسی میکش کا صبرِ رندانہ — الٹ گیا ہے مئے آتشیں کا پیمانہ
فنا کے دوش پہ کچھ اس طرح سوار ہے تو — کہ بیکسوں کا چراغِ سر مزار ہے تو

سرودِ عشق میں آپ کا ایک مصرع ہے :۔

جب جانیں چلتی پھرتی ہیں مٹ جاتی ہے سب ویرانی

اس میں جب جانیں چلتی پھرتی ہیں، خلاف محاورہ ہے یا دوسرا مصرع ہے ۔

جب دھوپ کی کثرتِ تابش سے دنیا کی زمیں گرماتی ہے

کثرتِ تابش کی بجائے شدّتِ تابش ہونا چاہیئے ۔

ایک اور مصرع ہے :۔

جب بادِ نسیم کے جھونکوں سے گلشن میں شجر لہراتے ہیں

"شجر لہراتے ہیں" یہ کوئی محاورہ نہیں۔ شجر جھومتے ہیں کہہ سکتے تھے ۔ اسی شعر کے دوسرے مصرع میں

جب پتی پتی ہنستی ہے، جب غنچہ تان لگاتے ہیں

پتی پتی ہنسنا چہ معنی دارد ۔ پتی نہیں ہنستی ہے بلکہ پھول ہنستے ہیں ۔ غنچہ تان لگاتے ہیں ۔ یہ بھی درست نہیں ہے ۔

رواں کا ایک شعر ہے :۔

یہ سرخیاں شفق کی، یہ رنگ رنگ بادل — اودے، ہرے، کبودی، زنگاری، لال، پیلے

رنگ رنگ بادل غلط ہے ۔ رنگ رنگ کے بادل ہونا چاہیئے ۔

اسی طرح غزلوں میں ایک شعر ہے ؎

یہ حالت دیکھنے قابل ہے بیمارِ محبت کی — کہ اہلِ درد چپ ہیں چارہ گر فریاد کرتے ہیں

پہلے مصرع میں دیکھنے قابل کی بجائے دیکھنے کے قابل ہونا چاہیئے ۔ یہاں کے غائب ہے

ایسا ہی ایک اور شعر ہے ؎

دیکھنے قابل مرا حالِ دلِ شیدا نہ تھا — اور یہ جب کا ذکر ہے جب حسن بے پروا نہ تھا

یہاں بھی پہلے مصرع میں دیکھنے کے قابل ہونا چاہیئے ۔

ذیل میں آپ کے کلام سے بہتر اشعار نقل کئے جاتے ہیں :۔

پیہم دئے وہ رنج کہ انساں بنا دیا — منّت پذیر ہوں ستمِ روزگار کا

ہم اتنے فاصلے پر آ گئے ہیں عہدِ ماضی سے
خبر یہ بھی نہیں اجداد کا نام و نشاں کیا تھا

کوئی تفسیرِ بابِ زندگانی میں نہیں ممکن
حیات و موت بھی اک نام ہے تبدیلِ عنواں کا

ہمنشیں فصلِ بہاری ہیں مزاجِ دل نہ پوچھ
تو نے دیکھا ہے کبھی دریا کوئی بڑھتا ہوا

شرع میں آ کر کھلا ہے عالمِ فانی کا راز
اے مری جاتی ہوئی دنیا بڑا دھوکا ہوا

پروردۂ عصیاں ہے دنیا ہے خطا مسلک
اے کاش! اگر میں اس میں پیدا نہ ہوا ہوتا

عناصر ہنستے ہیں، دنیا کی وسعت مسکراتی ہے
کسی سے پوچھتے ہیں اہلِ بینش جب نشاں میرا

ابھی تک فصلِ گل میں اک صدائے درد آتی ہے
وہاں کی خاک سے پہلے جہاں تھا آشیاں میرا

رواں! سچ ہے محبت کا اثر ضائع نہیں ہوتا
وہ رو دیتے ہیں اب بھی ذکر آتا ہے جہاں میرا

ہنسے بھی، روئے بھی لیکن نہ سمجھے
خوشی کیا چیز ہے دنیا میں غم کیا؟

میں یکجا ہی کرتا تھا اپنے حواس
کہ اُن سے مرا سامنا ہو گیا

ہستی مجھے خود اپنی معمہ ہے اک رواں
آزاد بھی نہیں ہوں گرفتار بھی نہیں

رواں سوائے اجل اس جہانِ فانی میں
نہیں ہے اور کوئی شے یقین کے قابل

سنگِ یمینِ کعبہ خود بڑھ کے جبیں کو بوسہ دے
ایسے بھی چند سجدے ہیں ناصیۂ نیاز میں

ہم اپنی قوتوں سے کام لیں یا رائگاں کر دیں
زمیں کو خواہ دوزخ، خواہ گلزارِ جناں کر دیں

اسی کو نعمتِ حسنِ بیاں بھی کہتے ہیں
کہ چپ بھی رہتے ہیں اور داستاں بھی کہتے ہیں

کسی طرف نظرِ یاس کر کے رو دیتا
مری زباں میں اسی کو فغاں بھی کہتے ہیں

اس نشاطِ زندگی پہ ناز ہے تم کو رواں
وقفۂ تدبیرِ غلامی جس کی گھڑیاں ہو گئیں

چمن فروز، چمن سوز، لالہ زار ہوں میں
خزاں ہے جس کے تعاقب میں وہ بہار ہوں میں

جہاں میں صورتِ فوارہ زندگی ہے مری
کہ آپ اپنی بلندی پہ اشکبار ہوں میں

بساطِ دہر میں مانندِ مہرۂ شطرنج
نہ جانے کس لئے سرگرمِ کارزار ہوں میں

قفس کے ہم نواؤں میں بھی باہم پھوٹ پیدا ہے
نہ جانے کیا لکھا ہے ہم اسیروں کے مقدر میں

شعاعِ نورِ ایماں دل تک آتے دیر لگتی ہے
بڑی دشواریوں سے روشنی ہوتی ہے اس گھر میں

حسنِ مغرور میں ممکن نہیں اصلاحِ فروغ
کیا بھرے کوئی چھلکتے ہوئے پیمانے کو

ہزاروں پھول ہٹ کر اک کلی صورت دکھاتی ہے
یہی قانونِ فطرت آپ عالمگیر دیکھیں گے

کوئی آزاد ہستی بزمِ دنیا میں نہیں ملتی
جسے دیکھیں گے بس فریادیِ زنجیر دیکھیں گے

اللہ رے دلفریبی ایوانِ آرزو کی
ہر منظرِ فنا کو باقی سمجھ رہا ہوں

آتا ہوں فاصلے سے، جاتا ہے دور مجھ کو
دلچسپ تھے مناظر دم بھر ٹھہر گیا ہوں

تڑپتی پھرتی ہے اک برقِ عرفاں میکدے بھر میں
کبھی مینا میں خم سے اور کبھی مینا سے ساغر میں

جو لکھا ہے کاتبِ تقدیر نے ہوگا وہی
اپنی کوشش بھی مگر تا حدِ امکاں کیجئے

ایک ہی دریائے بے پایاں کے قطرے ہم ہیں سب
حیف ہے گر ہم میں کوئی جانب دریا نہ جائے

ازل سے ہے یہی یاسِ بہار کی شرخی
جو آفتاب کی پہلی کرن میں آتی ہے

کل ایک غنچے نے بادِ سموم سے یہ کہا
ہزار بار خزاں اس چمن میں آئی ہے

ریاضِ دہر میں مانندِ نے ہے زندگی میری
کہ جب تک سانس ہے نالوں سے فرصت ہو نہیں سکتی

یقیناً وسعتِ امکانِ انسانی یہاں تک ہے
کہ میدانِ عمل اس کا زمیں سے آسماں تک ہے

یوں تو کس کو فکر، کس کو ہوش، کس کو آرزو
موت سے ہوتا ہے کچھ کچھ امتیازِ زندگی

دیکھ کتنی بجلیاں رہتی ہیں سرگرمِ طواف
آہ اے آسودۂ ایوانِ نازِ زندگی

سدِ انوارِ حقیقت ہے مرا پردۂ زیست
توڑ دینا ہے یہ آئینۂ تصویر مجھے

نہ گل ہوئی ہے نہ شمعِ حیات گل ہوگی
ہزار بار یوں ہی انجمن میں آئی ہے

چلو وہیں دلِ پژمردہ لے چلیں اپنا
جہاں سے بادِ بہاری چمن میں آئی ہے

دلِ انساں میں جب فطرت نے رکھیں قوتیں لاکھوں
تو اک کمزور الفت بھی بہ طرزِ امتحاں رکھدی

حسن کی اطاعت بھی اصل میں عبادت ہے
میری بت پرستی میں شانِ حق پرستی ہے

اگلی صحبتیں ساری خواب کی سی باتیں ہیں
دوستوں کے ملنے کو روح اب ترستی ہے

زمیں سے آسماں تک بھر دیا ہے جوشِ آزادی
اسیروں نے تمہارے یہ کیا، آزاد کیا کرتے

جہانِ آرزو کے ذرہ ذرہ میں تزلزل تھا
رواں ہم حسرتِ تعمیرِ دنیا و کیا کرتے

عظمتِ روح کا احساس بھی باقی نہ رہا
ہم کو برباد کیا شوقِ جبیں سائی نے

ذکر ہے زنداں میں وہ گلزار پہ بجلی گری
آج میرے آشیاں میں روشنی ہو جائے گی

دشوار ہے دنیا میں انساں کا خوش رہنا
جو دل نظر آتا ہے، چھالا نظر آتا ہے

کچھ عجب روداد ہے انساں کی روداد بھی
سو اسیروں کا اسیر آزاد کا آزاد بھی

رباعیات

کیا تم سے بتائیں عمرِ فانی کیسی تھی
بچپن کیا چیز تھا، جوانی کیسی تھی

یہ گل کی مہک تھی، وہ ہوا کا جھونکا ،، اک موجِ فنا تھی، زندگانی کیا تھی

تلخ ہمیں عقل کا کئے دیتی ہے آزادیٔ دل فنا کئے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے ہم باز آئے فطرت سے ہمیں جُدا کئے دیتی ہے

یہ کیا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے پہلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے
اس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے رواں! یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے؟

ہے چشم حواس کو رہ آفت یہ ہے ہم راہروں کو رنجِ غربت یہ ہے
آتے ہیں کہاں سے اور جانا ہے کہاں؟ اس کی بھی خبر نہیں، مصیبت یہ ہے!

پابندیٔ ذوقِ اہلِ دل کیا معنی؟ دل تپیشیٔ جنسِ مضمحل کیا معنی؟
اے ناظمِ کائنات! کچھ تو بتلا آخر یہ طلسمِ آب و گل کیا معنی؟

تم تیشۂ باغباں سے کیوں مضطر ہو شاید یہ قلم ہی نخل بار آور ہو
مقراضِ اجل ہے قاطعِ شاخِ حیات ممکن ہے اسی میں رازِ جاں مضمر ہو

قدیم پجاریوں سے خطاب

برہمن! او سراپائے بتاں کے پوجنے والے! مسلماں! او خدائے دو جہاں کے پوجنے والے
خدا کے واسطے بیدار ہو! ہشیار ہو غافل! فریبِ کاوشِ سود و زیاں کے پوجنے والے
جو ممکن ہو قفس کی تیلیوں سے درسِ عبرت لے گلستاں کے فدائی، آشیاں کے پوجنے والے
یہ صحنِ باغ، یہ بادِ سموم و تند و زہر آلود! پرستارانِ گل بھی ہیں خزاں کے پوجنے والے
کہاں ہیں اپنی دنیا اپنے ہاتھوں جو بساتے ہیں؟ کہاں ہیں لذتِ دردِ نہاں کے پوجنے والے
ذرا ہشیار! اے دلدادۂ ذوقِ تنِ آسانی! شہیدِ آرزو، خوابِ گراں کے پوجنے والے
کسی دن دامنِ گلچیں کا بھی تو جائزہ لیتے بہی خواہانِ گلشن، باغباں کے پوجنے والے
چٹانیں ہیں چٹانیں، جس کو موجِ آب سمجھا ہے اے کشتی کے غافل بادباں کے پوجنے والے
فنا کے راز کے جویا! بقا کے راز سے غافل تمنائے حیاتِ جاوداں کے پوجنے والے
وطن کا ذرہ ذرہ مایۂ نورِ حقیقت ہے! مکاں پر غور کر اے لامکاں کے پوجنے والے

میں اس دن کا تمنائی ہوں جب سب کی زباں پر ہو
کہ ہم ہندی ہیں اور ہندوستاں کے پوجنے والے

تنہا

اس ہیچمداں کا نام محمد یحییٰ اور تنہا تخلص ہے۔ باپ کا نام منشی محمد حسن ہے غالباً ۱۸۹۰ء میں یہ خاکسار عالمِ وجود میں آیا۔ بچپن میں اشعار پڑھنے کا شوق تھا۔ انگریزی کی آٹھویں کلاس میں تعلیم پاتا تھا کہ مشاعروں کی شرکت نے شعر کہنے کی طرف طبیعت کو مائل کر دیا۔ ابتدا میں چند غزلیں کہیں۔ اور نویں کلاس میں مقدمہ دیوانِ حالی پڑھ کر تغزل کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔ اور انگریزی زبان کی تقلید میں نظمیں کہنے لگا۔ میں نویں یا دسویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ کہ میرا سب سے پہلا مضمون "احسان فراموشی" ۱۹۰۴ء کے عصرِ جدید میرٹھ میں چھپا جو زیرِ ادارت خواجہ غلام الثقلین مرحوم شائع ہوتا تھا۔ اس پر خواجہ صاحب مرحوم نے یہ نوٹ دیا تھا۔ کہ "یہ ایک ہونہار طالب علم کا مضمون ہے۔ جیسا کہ مبتدیوں کا قاعدہ ہے۔ عبارت میں رنگینی زیادہ ہے۔ لیکن خیالات نہایت اچھے ہیں۔" مجھ کو خواجہ صاحب مرحوم کے "ہونہار طالب علم" کے لکھنے پر بیحد مسرت ہوئی۔ اور میں نے ارادہ کر لیا۔ کہ میں مضمون نگاری کیا کرونگا۔ ادھر ۱۹۰۵ء میں مولانا حالی مرحوم میرٹھ تشریف لائے۔ اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ کچھ اپنے اشعار بھی اُن کو سنائے۔ اور اس طرح شاعری کا شوق بڑھتا ہی گیا۔ سب سے پہلے روزانہ پیسہ اخبار "لاہور میں اور پھر ۱۹۰۷ء میں رسالہ آفتاب جھالراپاٹن میں میری نظمیں چھپیں۔ اس کے بعد علی گڑھ منتھلی اور رسالہ "زمانہ" کانپور میں نظمیں شائع ہونی شروع ہو گئیں ۱۹۱۱ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ اور ۱۹۱۲ء میں سب سے پہلی کتاب "شاعرانہ خیالات" شائع کی جس کی بے انتہا تعریف مولانا شبلی، مولانا حالی اور سید وحید الدین سلیم مرحومین نے کی، بعد ازاں ایل۔ ایل۔ بی پاس کر کے وکالت شروع کر دی۔ پہلے غازی آباد منصفی میں وکالت کرتا تھا پھر ۱۹۲۴ء سے میرٹھ ججی میں وکالت کر رہا تھا۔ کہ تقسیم ہند کے بعد وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اور اب لاہور میں سکونت پذیر ہوں۔ اور پاکستان میرا وطن ہے

کلام پر تبصرہ

یہ خاکسار اپنے اشعار پر کیا تنقید کر سکتا ہے۔ کیونکہ اپنی چیز خواہ وہ کیسی ہی بُری کیوں نہ ہو۔ ہر شخص کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ تاہم میں اپنے متعلق تبصرہ تو نہیں۔ البتہ تشریح کلام سے کام لونگا۔ یہاں مولانا حالی کے ایک خط کی عبارت جو مکتوباتِ حالی کے حصہ اوّل میں صفحہ ۱۳۳ پر یہ درج ہے نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ وہ اپنے نیاز مند کو لکھتے ہیں کہ "آپ کی دونوں نظمیں تلقینِ صبر اور تضمین غزلِ حافظ دیکھ کر بہت جی خوش ہوا۔ آپ میں شاعری کی عمدہ قابلیت معلوم ہوتی ہے۔"

مجھ کو شروع ہی سے بیانیہ شاعری کا شوق رہا ہے، چنانچہ میں زیادہ تر ایسی ہی نظمیں لکھتا ہوں جن میں عنوانِ نظم کی ہو بہو تصویر کھینچ دی جائے۔ یا واقعات کو بیان کر دیا جائے۔ مولانا حالی اور حضرات صفی و جوش کے سوا ہمارے یہاں کے شعراء بیانیہ نظموں کو بھی اپنے تخیل کی پرواز سے خیالی اور فرضی بنا دیتے ہیں۔ میں اس سے پرہیز کرتا ہوں۔ اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے۔ واقعات کے بیان کرنے میں مبالغہ اور شاعرانہ رنگینیٔ خیال کو نظر انداز کر دیتا ہوں۔ البتہ رعنائی خیال کو پسند کرتا ہوں۔ اور اُسے گناہ نہیں سمجھتا۔ میرا قلم ہر قسم کی نظمیں لکھ سکتا ہے۔ اور میں بھی اپنے یہاں کے شعراء کی طرح خیالی اور فرضی نظمیں کہہ سکتا ہوں لیکن میری طبیعت اس کو گوارا نہیں کرتی۔ میں کوئی نظم اس وقت تک نہیں لکھتا جب تک کہ اُن واقعات اور حالات سے خود متاثر نہیں ہوتا۔ جن کی بنا پر وہ نظم معرضِ وجود میں آنا چاہتی ہے۔ ذیل میں تین نظمیں بطور نمونۂ کلام پیش کی جاتی ہیں، جن سے ناظرین با تمکین خود اندازہ کر سکیں گے۔ کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے۔ وہ کہاں تک صحیح ہے

آزادیٔ ہند

اے ہند گرفتارِ غم و رنج و محن وائے
اے وائے وطن وائے

خدامِ وطن کے لئے ہے دار و رسن وائے
اے وائے وطن وائے

کل تک تھے جو زیبندۂ ہر باغ و گلستاں
گل جن پہ تھے نازاں

روندے ہوئے ہیں آج وہ گلہائے چمن وائے
اے وائے وطن وائے

جس جا کہ رہا کرتا تھا اک شورِ عنادِل
خالی ہے وہ منزل

ہیں آج مگر جمع وہاں زاغ و زغن وائے
اے وائے وطن وائے

کس طرح مفادِ وطن و غیر حکومت
ہے جن میں عداوت

ہو سکتے ہیں یکجا مگر اربابِ وطن، وائے — اے وائے وطن وائے
تم ترکِ موالات کے قائل ہو نہ عامل — پھر باتوں سے حاصل
ہیں خندہ زن اب ہم پہ سب اقوامِ زمن وائے — اے وائے وطن وائے
کیا مُردہ تنِ قوم میں ہے جان بتاؤ — ہاں نبض دکھاؤ
لاریب یہ اک نعش ہے بے گور و کفن، وائے — اے وائے وطن وائے
ہندو ہو کہ مسلم نہیں دونوں میں محبت — ہے بلکہ عداوت
آزادیٔ ہند آج ہے بے مغز سخن، وائے — اے وائے وطن وائے
افسوس کہ آپس میں کیا تفرقہ پیدا — جھگڑے ہوئے برپا
ہے زور پہ اس ملک میں اک سیلِ فتن وائے — اے وائے وطن وائے
اک آگ عداوت کی ہے سینوں میں فروزاں — سب اس میں ہیں غلطاں
پنجاب ہو یو۔پی ہو کہ بنگال و دکن، وائے — اے وائے وطن وائے
کل تک تو حکومت کے مقابل تھے صف آرا — اب خود ہو دو پارا
کل اور تھا، ہے آج یہ شیوہ یہ چلن، وائے — اے وائے وطن وائے
خود مطلبی و نفس پرستی سے ہو سرشار — کیا جانو تم ایثار
پامالِ اجانب ہوئے سب سرو سمن، وائے — اے وائے وطن وائے
کیا زندہ رہیں گر لڑیں باہم دگر اعضا — ممکن نہیں ایسا
دنیا ہے سبق صلح کا ہر عضوِ بدن، وائے — اے وائے وطن وائے
اس شرط سے ہر دشتِ وطن باغِ عدن ہو — آزاد وطن ہو
ہو خاکِ وطن ہم کو بہ از مشکِ ختن، وائے — اے وائے وطن وائے
تنہا یہی رونا ہے کہ ہم تنگ نظر ہیں — بے راہ و بے ثمر ہیں
اور منزلِ آزادیٔ ملت ہے کٹھن، وائے — اے وائے وطن وائے

۱۸ ستمبر سنہ ۲۳ء

کوہ نینی تال
(سنہ ۱۹۰۶ء کا نظارہ)

کبھی کوئی نہ عمر بھر، اگر گیا پہاڑ پر — تو اُس نے اِس جہان میں، کیا ہی کیا پھر آن کر
ہوا وہاں کی سرد ہے، یہ کب غبار و گرد ہے — ہر ایک چیز فرد ہے، عجب بہار ہے اُدھر

اٹھو اٹھو کہ وقت ہے ابھی تو ریل کا بہت — چلو چلو کہ لطف ہے، ہوئے ہم آج ہم سفر
یہ سانپ کی طرح سے بل جو کھا رہی ہے ریل اب — وہ چوٹیاں پہاڑ کی، جو آ رہی ہیں اب نظر

سماں یہ دیکھ کر ہوا عجیب دل پہ کچھ اثر
کہ روح وجد میں ہے، تن بدن کی کچھ نہیں خبر

لباس سبز زیب تن، پہاڑ ہے کہ ہے چمن — جدھر اٹھائیے نظر، ادھر شجر ہے یا حجر
پہاڑ کے درخت کی تناوری و دل کشی — سہی قدان باغ بھی ہوں شرمسار دیکھ کر
گلوں کی وادیوں میں بو، مہک رہی ہے چار سو — کہ جس کو سونگھ کر عجب اٹھائے لطف ہر بشر
لڑھک رہے ہیں پے بہ پے جو ٹوٹتے سنگ راہ جو — رواں دواں ہے آب جو، اسی کا ہے یہ شور و شر
وہ ابر جو بلند تھا، زمیں سے ہے ہزار گز — لگے بلا وہ راہ میں، مگر بلا بچشم تر
کھلی جگہ میں اوس نے کیا ہو جیسے شب کو نم — پڑے جو ہم اس سے مل گئے جب تو ہم بھی تر تھے سر بسر
وہ دل فریب تال بھی نظر کے سامنے ہے اب — کہ زورقوں میں نازنیں ادھر ادھر ہیں جلوہ گر
بتان شوخ و شنگ خود چلا رہی ہیں ڈونگیاں — نزاکت بدن پہ ہیں یہ جرأتیں کہ الحذر
درخت بید جا بجا کھڑے ہیں بر کنار جو — وہ رنگ آب نیلگوں، مگر انہیں ہے کیا خطر
رواں دواں وہ زورقیں کبھی جو دور دیکھئے — نہیں بیاں میں لطف وہ جو دیکھتی ہے خود نظر
کسی سڑک پہ شام کو جو گھومنے کو جائیے — خموشی مہیب سے ڈریں گے آپ بھی، مگر
وہ نازنین پری، کتاب ہاتھ میں لئے — مطالعہ میں غرق ہے، اسے نہیں ہے کچھ خطر
اداس پہ ادب یہ ستم کہ بیٹھنے کے واسطے — نشست بھی تلاش کی تو اک بلند ڈھال پر
وہ تال کے شمال میں جگہ ہے کیا ہی دل کشا — کہ کھیلتے ہیں سب وہاں، ادھر ادھر سے آن کر
وہ رقص ہے کہ بال ہے عجیب سب کا حال ہے — ذرا ٹھٹک کے دیکھئے جو رہ گزر سے ہو گزر
سنا تھا جس کو کان سے، وہ آنکھ سے بھی دیکھئے — وہ بیخودی، وہ سرخوشی، اٹھا کے دیکھئے نظر
گماں ہے ہر چراغ پر ستارگان چرخ کا — جگہ جگہ وہ روشنی غروب آفتاب پر
جگا رہا ہے نغمۂ طیور کو، اب نہیں — صدائے ساز خوشنوا، ہوئی ہے مخبر سحر
ادا فریضۂ سحر کرو تو سیر کو چلیں — بہار صبح خوب ہے، صدائے ساز خوب تر
ہوائے سرد کی لپٹ، گلوں کی بس میں جو مہک — نشاط روح کے لئے عجیب چیز ہے، مگر
ہر ایک چیز معتدل، خوشی کا ہے سبب یہاں — وگرنہ انبساط بھی بجائے خود ہو پر خطر

یہی ہولئے سرد جب یہاں پہ برف بار ہو　　تو بادِ زمہریر کا ہر ایک شے میں ہو اثر

یہاں کی یہ بہار بھی خزاں سے جائے گی بدل

کہ برف کے سوا یہاں پڑے گا اور کیا نظر　　۱۹ جون ۱۹۲۷ء

طلوعِ صبح

شبِ تاریک کی ظلمت سے جہاں تھا معمور　　نور کا نام نہ تھا نور ہوا تھا کافور

گھپ اندھیرا تھا، سیاہی میں تھی ہر شے مستور　　کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا نظر تھی مجبور

شکر صد شکر اُفق پہ فلک آرا نکلا

رات آخر ہوئی اور صبح کا تارا نکلا

بسترِ راحت و آرام پہ سوتے تھے بشر　　کوئی آواز نکلتی نہ تھی گھر سے باہر

دشت ویرانہ تھا سنسان، خموش اور ششدر　　لبِ تصویر کی مانند جہاں تھا یکسر

ایک سناٹا تھا خاموش ہی خاموش تھے سب

نیند کے نشے سے مدہوش ہی مدہوش تھے سب

مرغ کی بانگ نے سوتوں کو جگایا آخر　　للہ الحمد مؤذن نے اٹھایا آخر

شورِ مرغانِ چمن نے بھی مچایا آخر　　حمد کا راگ پرندوں نے بھی گایا آخر

مسجدوں میں تو نمازی ہوئے مصروفِ نماز

اور بت خانوں سے ناقوس کی نکلی آواز

مردنی چھائی ہوئی تھی کہ تھے زندہ درگور　　نہ یہ رونق تھی کہیں اور نہ کہیں تھا یہ شور

سب ہی آرام سے سوتے تھے یہاں مار و مور　　وہ جگاتا نہ تو کیا چلتا کسی کا کچھ زور

وہی زندوں کو بنا دیتا ہے مردہ دم میں

وہی مردوں کو بنا دیتا ہے زندہ ہم میں

اب جدھر دیکھئے ہر چیز میں جان آئی ہے　　کیا شجر اور حجر سب میں وہ رعنائی ہے

کہ نظر دیکھ کے حیران ہے شیدائی ہے　　جلوے لاکھوں ہیں مگر ایک تماشائی ہے

طور پہ حضرت موسیٰ سے جو دیکھا نہ گیا

میں یہاں دیکھتا ہوں اور کہیں آیا نہ گیا

پتے پتے میں ہیں وہ بیل وہ بوٹے کہ نہیں　　مل سکیں گے کسی انسان کی صنعت میں کہیں

دلکشی کیسی ہے اور کیسے ہیں واللہ حسیں　　واہ کیا لعل اُگلتی ہے ہماری یہ زمیں
پھول کا ذکر ہی کیا، پھول تو پھر پھول ہی ہے
شان کانٹے کی بیاں کرنا بھی اک طول ہی ہے

کسی صحرا میں ذرا دیکھئے شبنم کی بہار　　ید قدرت نے کیا سبزہ پہ گوہر کو نثار
سبز مخمل پہ روپہلی کیئے یا نقش و نگار　　یا زمیں کو یہ ستارے دئے بیحد و شمار
جس طرف دیکھئے جنگل میں بہار آئی ہے
اور مستی کو صبا ساتھ لگا لائی ہے

آبشاروں میں وہ پانی کا ٹپکنا کیا خوب　　ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہواؤں کا لہکنا کیا خوب
باغ و گلزار میں پھولوں کا مہکنا کیا خوب　　اور میوؤں کا درختوں پہ لٹکنا کیا خوب
رقصِ طاؤس میں اک وجد کی کیفیت ہے
دلِ شوریدہ کی اس وقت عجب حالت ہے

جانور کرتے ہیں آپس میں کلیلیں تو ہرن　　چوکڑی بھرتے ہیں اور پھرتے ہیں جنگل میں مگن
یہ نہیں جانتے، کیا شے ہے غم و رنج و محن　　اِن کے نزدیک یہ جنگل بھی ہے گویا گلشن
دیکھ کر اِن کو خوشی ہوتی ہے اور دل کو بھی
بھول جاتے ہیں پریشانیاں اپنی اپنی

فرحت افزا ہے یہ دریا کا بھی کیا آبِ رواں　　کیسی اٹھکھیلیاں کرتا ہوا چلتا ہے یہاں
آرہا ہے یہ بہت دور سے جائیگا کہاں　　دیکھ کر اس کو طبیعت ہوئی اپنی شاداں
اس کی رفتار ہے مستانہ کہ معشوقانہ
ہوشیار اس کو مگر دیکھ کے ہو دیوانہ

بامداداں کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار　　خوش بود دامنِ صحرا و تماشائے بہار
صوفی! از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار　　وقت آں نیست کہ در خانہ نشینی بیکار
صبح کا وقت سُہانا ہے نشاط افزا ہے
کھل جاتی ہیں خود آنکھیں یہ تماشا کیا ہے

(مارچ سنہ ۳۲ء)

پیش گوئی

خدا کے فضل سے یہ دور ۱۹۴۰ء تک قائم رہا۔ ہم میں کے کچھ شعرا راحل ہو چکے ہیں۔ تاہم [illegible]
موجود ہیں اپنی شعر خوانی سے اہلِ بزم کو گرما رہے ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم لوگوں کے بعد کیسا
زمانہ آئے گا۔ اور اس وقت پیرزالِ شاعری کس وضع اور لباس میں جلوہ گر ہوگی۔ تا کہ اپنے غمزہ ا[ور]
نادیدہ حسنِ خداداد سے نوجوانوں کے دل لبھائے۔ نہیں معلوم آیندہ سیاست کی رفتار کیسے
گل کھلائے اور ہمارے شعرا سازِ انا الحق کی صدا لگائیں اور دار پر لٹکیں یا طوفانِ بے تمیزی میں
گھر جائیں۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ آیندہ تغزل کا تعلق ہمارے شعرا سے منقطع ہو جائے گا۔ [illegible]
یہ ہے کہ موجودہ دور کے شعرا نے تغزل کا درجہ اس قدر بلند کر دیا ہے کہ اس میں ہر کس و ناکس
نام پیدا کرنے کا موقع نہیں رہا۔ کوئی شخص ایک عمر صرف کرے تو شاید عرصہ میں کچھ کمال دکھا
سکے۔ ورنہ اس عمارت کے تمام زینے چپے چپے پڑے ہیں۔ اور اس پر چڑھنے کے لئے تل دھرنے
کی جگہ باقی نہیں۔ اب کوئی ہوائی جہاز سے عمارت [illegible] پر پہنچے تو دوسری بات ہے۔ تغزل
کے بالمقابل بہت سی عماراتِ عالیشان بن گئی ہیں۔ ان میں آسانی سے داخلہ ہو سکتا ہے۔ عجب
نہیں کہ ہمارے شعرا کی آیندہ نسل ان عمارات میں آرام سے رہ پڑے اور شرابِ تغزل
کے نشہ کی بجائے جدید شاعری کے سبزہ زاروں کی سیر سے سرشار ہونا پسند کرے۔ او[ر]
غیر مقفی النظم کو جس نے حال ہی میں سر اٹھایا ہے۔ اپنی صحبتوں میں بیٹھنے کی کبھی اجازت نہ [دے]
بقول سیماب اکبرآبادی؎

عجب کیا دور یہ سیماب اس کا خاتمہ کردے
غزل تو آخری شب کی فغاں معلوم ہوتی ہے

اشاریہ

(ا)

(ب)

(پ)

(ت)

(ٹ)

(ث)

(ج)